غلام نبی خیال

خیال قلم



غلام نبی خیالؔ

خیال قلم

(مُصوّر)

باہتمام

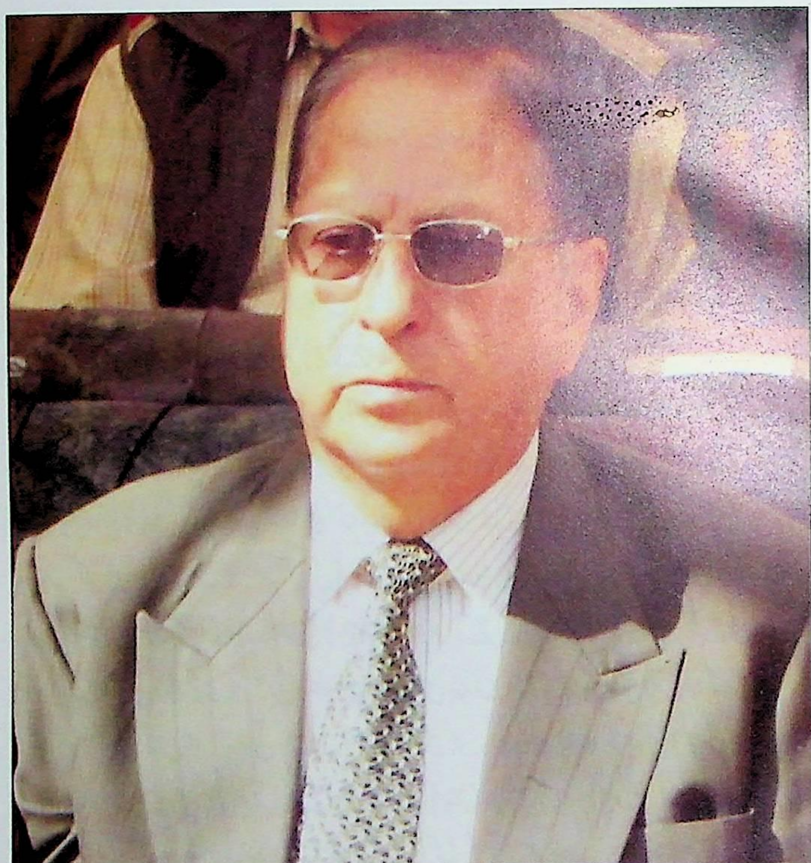
میزان پبلشرس

سرینگر۔ کشمیر

Title of the book	:	***Khayal Qalam*** (Illustrated)
Language	:	Urdu
Genre	:	Literary Research
Composing:	:	M.Naseem Ansari, Bhopal
Title Design	:	Imtiyaz Sharqi
Pagemaking	:	Bilal Bashir
Printed at	:	Rang Mahal, New Delhi
First Edition	:	2012 AD
Number of pages	:	480
Price per Copy	:	Rs.800 or US $40
Arrangement	:	Meezan Publishers Srinagar-Kashmir, India.
Email	:	gulkhayal@gmail.com
Mobile	:	0-9419005909

ISBN-978-81-923711-7-7

مُندرجات



تصویر: لبنیٰ اختر

مصنف

تصاویر

مصنف (6) چنار کا شاہی درخت جسے مبینہ طور پر ایرانِ قدیم سے کشمیر میں لایا گیا (21) علامہ اقبال (26) قدیم شہر سری نگر کا ایک تاریخی پل جو دریائے جہلم پر تعمیر کیا گیا (26) مولانا جلال الدین رومی (40) مقبرہ ملا طاہر غنی کشمیری (90) جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری (112) فیض احمد فیض کا خاکہ جسے مصوّر صادقین نے بنایا (16) تصویر فیض اُس کے دستخط کے ساتھ (174) دخترِ فیض اور غلام نبی خیال (174) شورش کشمیری (200) خوشی محمد ناظر (206) دیوانِ ناظر کا صفحۂ اول (214) خیال صاحب کے لئے مولانا مسعودی کی دستخط شدہ تصویر (232) اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے (248) اختر محی الدین اور خیال (266) خیال، راہی معصوم، اختر اور اکبر لداخی (268) طاؤس بانہالی (280) تحسین جعفری اور آزر عسکری (284) شیکسپیر اور ٹالسٹائی (302) گوئٹے (314) نسخ خط میں دیوانِ مغربی کا سرورق (316) سعادت حسن منٹو (332) جواہر لال نہرو سرینگر میں (346) فلم کشمیر کی کلی اور تہان (354) فلم جاگو ہوا سویرا (356) غلام رسول سنتوش (364) مجاز لکھنوی (372) مجاز کے لئے یادگاری ڈاک ٹکٹ (372) مقبول فدا حسین (378) حسین کا خود بنایا ہوا قلمی خاکہ (378) کشمیری لال ذاکر (386) سری نگر سنٹرل جیل کا بیرونی دروازہ (404) زنجورہ ہُند ساز کا سرورق (404) خیال صاحب ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ لیتے ہوئے (413) ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان غلام نبی خیال، کیفی اعظمی، بھیشم ساہنی (413) کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے خیال کے اعزاز میں تقریب (420) چندی گڈھ میں بابا فرید پر عالمی سمینار میں خیال صاحب (420) ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے۔آر۔قدوائی خیال کو دوردرشن کی طرف سے حسنِ کارکردگی پر اعزاز سے نواز رہے ہیں (422) ڈاکٹر فاروق عبداللہ خیال صاحب کی شال پوشی کر رہے ہیں (424) غلام نبی خیال کا عکسِ تحریر (427) غلام نبی خیال کو کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے بہترین کتاب کا سالانہ انعام وزیر ثقافت نوانگ رگزن جورا جموں میں 20 جنوری 2012ء کو دے رہے ہیں (428) پروفیسر رحمان راہی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے خیال کی شال پوشی کر رہے ہیں (428) جگر مرادآبادی (432) اور قدیم شہر مرادآباد کی ایک تصویر (442)

پیش لفظ

آج تک کل ملا کر میری چھبیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان میں سے کشمیری زبان میں سترہ، اُردو میں سات اور انگریزی میں دو تصانیف شامل ہیں۔

میں نے اگر چہ شاعری کا شغف اپنی مادری زبان کشمیری تک ہی محدود رکھا ہے لیکن اُردو کے ساتھ میری محبت اور والہانہ لگن میں میرے پچپن سالہ ادبی سفر میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری مطبوعات میں اُردو کا مقام دوسرے درجے پر آتا ہے۔

"خیال قلم" میں بھی کشمیر کی ثقافت، ادبیات اور شخصیات پر مضامین کے علاوہ میں نے چند ایسے غیر کشمیری اکابرینِ دُنیائے ادب پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ کشمیر کا تعلق رہا ہے۔

اُمید ہے کہ میری دیگر اُردو کتابوں کی طرح اس عظیم زبان کی ادبی دنیا کے اہالیان ذوق اور محبانِ اُردو اس پیش کش کی بھی پذیرائی کریں گے۔

۔ غلام نبی خیالؔ

خیال قلم

چنار کے رنگ

سرزمینِ کشمیر حُسن وعشق کی زیبائی اور رعنائی اور فطرت کی جادوگری کے عاشق سخن وروں کا ایک محبوب موضوع رہی ہے۔ اس سرزمین نے جہاں کئی فلسفہ ہائے حیات کو اپنی آغوش میں پروان چڑھا کر دنیا کو اخوت، محبت اور باہمی شفقت کا پیغام دیا وہاں دستِ قدرت نے اس کی خوبصورتی کے خدوخال کو خود سنوار کے اسے سارے جہاں میں ایک حسین ترین خطہ بنا دیا جو بعد میں شاعروں اور سیّاحوں کی زبان میں فردوس بریں، خلدِ ارضی اور جنتِ بے نظیر کہلایا۔

ملکِ کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں، رواں دواں جوئباروں اور دریاؤں، خاموش اور پُرسکون جھیلوں، لہلہاتے ہوئے کھیتوں، ثمردار باغوں اور پُر بہار دشت ودمن اور بیابانوں اور خیابانوں کی مدح سرائی کا سلسلہ دراصل اُس وقت سے شروع ہوا جب کشمیر میں بودھ مت کا دور تھا۔ سنسکرت زبان میں اس قبیل کی کئی منظومات کے حوالے دستیاب ہیں لیکن اُن میں سے کوئی فن پارہ ترجمہ کی شکل میں منتقل نہیں ہوا ہے۔

مغل بادشاہوں، پٹھان اور سکھ حکمرانوں نے سالہا سال تک مقبوضہ کشمیر کو اپنے زیرِ حکومت رکھا اور اس طویل عرصے میں یہاں مقامی زبان کشمیری کے برعکس فارسی کو حد سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس غیر ملکی زبان کو ہر مرحلے پر سرکاری سرپرستی حاصل رہی اور اسی بنا پر ملکِ کشمیر کے اُس دور کے مقامی شاعر فارسی میں ہی اپنی شعری تخلیقات قلم بند کرتے رہے۔ مولانا شیخ یعقوب

صرفیؔ، مُلا محسن فانی اور ملا طاہر غنیؔ کشمیری نے فارسی میں خوب نام کمایا اور اُن کے فن اور علم کا شہرہ ایران اور وسط ایشیا تک جا پہنچا۔ یہی وہ دن ہیں جب کشمیر کو ایرانِ صغیر کا نام دیا گیا۔

غیر ملکی حکمرانوں نے اس عرصے میں کئی ایسے فارسی شعراء کو کشمیر مدعو کیا جو ایران میں اپنے فن کا لوہا پہلے ہی منوا چکے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مقامی فارسی شاعروں کے برعکس انہی ایرانی سخن گو شعراء نے حسنِ کشمیر کی تعریف و توصیف میں بے شمار مثنویات، قصائد، نظمیں اور دیگر شعری تخلیقات تحریر کیں جو آج بھی ان کے خوبصورت کلام کے آئینے میں وادیٔ کشمیر کی بے مثال خوبصورتی اور قدرتی حسن کے رنگا رنگ جلووں کا عکسِ جمیل دکھاتی ہیں۔ یہی وہ شاعر تھے جن کے لیے کشمیر ایک گہوارہ فکر و فن اور مرکزِ تخیل و تخلیق بن گیا اور انہیں سرزمینِ کشمیر سے اس قدر والہانہ محبت ہوئی کہ ان میں سے کئی ایک اسی گل پوش ارضی خطے میں خدا کو پیارے ہو کر اس کی مٹی میں دفن ہوئے۔

مقامی اور غیر ملکی فارسی شعراء کی ایک طویل فہرست بتاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی صلاحیت کے مطابق اور عشق کشمیر کی ترنگ میں آ کر کشمیر پر کچھ نہ کچھ ضرور قلم بند کیا ہے۔

یہ مضمون اُردو زبان کی اُن شعری تخلیقات پر مبنی ہے جو درمدح کشمیر تخلیق ہوئی ہیں اور جن میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی کے شعراء کی تخلیقات بھی شامل کی گئی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا کہ فارسی زبان میں کشمیر پر موزون شدہ منظومات کی اگر مختصر سی فہرست بھی تیار کی جائے تو وہ بھی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ابیات پر مشتمل ہوگی۔

چار جلدوں پر مشتمل ''تذکرہ شعرائے کشمیر'' کے ترتیب کار سید حسام الدین راشدیؔ کہتے ہیں کہ:

''خاص کشمیر پر کہی ہوئی منظومات جو گذشتہ جلدوں میں درج کی جا چکی ہیں یا اس جلد میں جمع کی گئی ہیں اُن کے حجم کو دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ فاسی ادب میں اس خوش قسمت خطے کے متعلق جتنا کچھ کہا گیا ہے اور جتنا کچھ اس کو سراہا گیا ہے جہاں تک راقم کی معلومات ہیں کسی اور سرزمین یا ملک کے لئے نہیں کہا گیا۔ کم از کم فارسی ادب میں یہ مرتبہ اور مقام کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

مشرق کی دوسری زبانوں کے ذخیرۂ ادب میں بھی کسی ایک خطے سے متعلق اسی افراط کے ساتھ منظومات کہاں تصنیف ہوئی ہوں گی؟ کشمیر پر کہی ہوئی تمام منظوماتؔ کو اگر یکجا کیا جائے تو یہ ذخیرہ حجم کے لحاظ سے حضرت سعدیؔ کی پوری ادبی تخلیق اور اثاثے سے یقیناً دوگنا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ افتخار دوسرے کسی مقام اور منزل کو کہاں نصیب ہے''

کشمیر کی قصیدہ خوانی میں شاعر تو پیش پیش تھے ہی لیکن یہاں کا دورہ کرنے والے یا یہاں عارضی طور پر قیام پذیر ئی حکامِ کشمیر نے بھی اس سرزمین کو جنون کی حد تک اپنی محبت سے پسند کیا اور اس کی تعریف میں طبع آزمائی کرنے سے پہلے ان کا قلم خود بخود شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کے موتی بکھیرنے لگا۔

اس خوبصورت پسِ منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس سے آنکھ چُرانا ایک گناہ کے مترادف ہوگا اسی لیے ہم اس شاعری میں سے مُشتے نمونہ از خروارے کے مصداق چند مثالیں اس مقالے میں شامل کر کے اس نشہ کو دو آتشہ بناتے ہیں جس کے سُرور میں سرشار ہو کر مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر

نے بھی شاعرانہ نثر میں کشمیر کو سراہا ہے:

''باغ است ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنین حصار، پادشاہان را گلشنے است عشرت افزاو درویشان را خلوت کدۂ دل کشا۔ چمن ہائے خوش وآبشار ہائے از حساب و شمار بیرون چنداں دہ نظر کار کند سبزہ است و آبِ رواں گل سرخ و بنفشہ و نرگس خود رو صحرا صحرا انواعِ گل ہا و اقسام ریاحین، ازاں بیشتر کہ بہ شمار درنہ آید۔ در بہارر جانِ نگار، کوہ ودشت از اقسام شگوفہ مالا مال۔ درو دیوارو صحن و بام خانہا از مشعلِ لالہ بزم افروز وجلگھائے سطح وسر برگ ہائے مبروج راچہ گوید''

راشدی کا دعویٰ ہے کہ ''تذکرۂ شعرائے کشمیر'' میں انہوں نے حتی الامکان یہ سعی کی ہے کہ کشمیر سے متعلق جو بھی شعراء گذرے ہیں ان کا ذکر اُن کی کتاب میں آجائے۔

اب آپ کشمیر پر تحریر کردہ فارسی شعراء کی شعری تخلیقات میں سے محض چند مثالیں ملاحظہ کر کے یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ اگر منظوماتِ کشمیر کے حوالے سے فارسی اور اردو تخلیقات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جائے تو کیسا رہے گا۔ چونکہ یہ ہمارے موضوع کے دائرۂ فکر سے باہر ہی ہے لہذا ہم اس پر، خدانے چاہا، تو کسی اور وقت اپنے تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ کو ورطۂ تحریر ہیں لائیں گے۔

میرزا محمد طاہر آشنا:

بہار آمد دلا ساغر بکف گیر
زبان بکشا بوصف راہ کشمیر

بے تو تاریک است کشمیر اے چراغِ دیدہ ہا
ماسیہ روزیم درشب سیر بستاں مے کنم
گل اگر تا سینہ در کشمیر مے آید چہ سود؟
ما کہ گل از اشک خونیں در گریباں مے کنم

مرزا داراب جویا:

بیا ساقی کہ فصل لالہ زار است
ہوائے سیر باغ و شالمار است
تعالیٰ اللہ زہے فردوس مانند
بہر شاخش دلے چوں غنچہ در بند



بیا ساقی کہ فصلِ انبساط است
مئے عشرت بدہ باغِ نشاط است
چو ایں گلزار باغِ بادشاہی ست
نشانش لالہ داغ بادشاہی ست

ظفر خان احسن:

الٰہی تا بود کشمیر آزاد
زگلزار خراسان ما مدہ یاد
بہر کس ہر چہ خواہد بے سخن دہ
مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

پنڈت لسہ کول بہار:

آمد بہار و سبزہ ز ہر سو کشیدہ سر
از سبزہ وار داد نشاں باغ کاشمر
از نیش ہجر گل دل بلبل فگار بود
صبح بہار پنبہ نہادش بہ زخم پر

محمد اسماعیل بینش کشمیری (درتعریف کوہ ماران وتخت سلیمان)

دو کشمیری جواناں گل فروش اند
کہ از ابر بہاری شال پوش اند

پنڈت دامودرنرمل سعادت:

خوشا سال نو دخل کردہ بہ کشور
ہوائے زمستاں بروں شد زکشمر
شگوفہ ز گلشن سر آورد بیروں
بہار ایں طرف با ارم گشتہ ہم سر
بہ تالاب آب و شب ماہ تاباں
سفینہ چو مُرغاب آبش چو کوثر
ہمہ گل رخاں لالہ قند و سمن بر
ز خوشبوئے گیسو ہوا پُر ز عنبر
بقد سروِ بُستان و شہلا بہ چشماں
سر ایں ہمچو نسرین و لب ہمچو شکر
سکوں داشتی گر دریں شہر قارون
نمے کرد بد بخت اندر زمیں زر

ترانہ بہر سو و ترکانہ ہر سُو
کف و دف زناں گفتہ مردم بہ ہر در
چہ داند سعادت بہ بند از اجازت
بروں بردہ زیں زحتِ خود را بہ دانتر

خواجہ حسن شعریؔ:

بسکہ رنگیں بہارِ کشمیر است
سوزنِ لعل و خار کشمیر است
در دماغِ جہان نیم بہار
از گلِ شالمار کشمیر است
از سواد و بیاض دیدۂ حُور
رنگ لیل و نہار کشمیر است
فکر جنت بہ دل نمے گذرد
در جہاں تا دیارِ کشمیر است
وصفش ایں بسکہ میرزا شعریؔ
بلبل نوبہارِ کشمیر است

ملک الشعراء فیضیؔ نے ایک طویل قصیدہ درمدحِ کشمیر لکھا ہے جو پورے ایک سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے سے یہاں صرف چند اشعار تبرکاً پیش کیے جاتے ہیں:

ہزار قافلۂ شوق مے کند شب گیر
کہ بارِ عیش کشاید بہ عرصۂ کشمیر
ہوائے او متنوع است چو فکر نقاش
زمین او متلون چو صفحۂ تحریر

غبارِ او بتواں خواند چشم را دارد
گیاہ اور بتوان گفت روح را اکسیر
درو بجائے گیا ہ زعفراں ہمے روید
کہ آب و خاک طرب را چنیں بود تاثیر
نسیم از سر آب تیز مے گذرد
کہ بادرا نتواں داشت پائے در زنجیر
بہ جلوہ ہائے فریب آہوان مشکینش
کشیدہ ہر دلاں را بدام عشق اسیر
زمین او چو دل بے غماں طرب خیز است
سپہرکردہ مگر خاکِ او بباده خمیر

طالبؔ آملی:

فیضِ پیالہ بخشد آب و ہوائے کشمیر
از خشت خم نہادند گو یا بنائے کشمیر
چوں خاکِ عشق بازاں ہر لخط در مشالم
بوئے محبت آید از کوچہ ہائے کشمیر
کشمیر مے ستانم از حق بجائے جنت
اما نمے ستانم جنت بجائے کشمیر
ہر کسِ پئے تماشا کردندِ خوش فضائے
رضوانؔ فضائے جنت طالبؔ فضائے کشمیر

☆

ملا طغرائی مشہدی:

کشمیر بود فصلِ خزاں عالم نُور
بر طالبِ فیض دید نش ہست ضرور
گوئی کہ دریں باغ چمن ساز قضا
آوردہ نہال شملۂ از خرمنِ طور

عُرفیؔ شیرازی نے چونتیس اشعار پر مبنی کشمیر کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس کا مطلع اتنا مقبول عام ہو چکا ہے کہ جب بھی کسی محفل یا مُناظرے میں کشمیر کی تعریف مقصود ہو تو عام طور پر اسی شعر سے ابتدائے کلام کی جاتی ہے۔ اسی مشہور قصیدے سے یہ تین اشعار پیش ہیں:

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مُرغِ کباب است کہ باباِل و پر آید
فردوس بدروازۂ کشمیر رسید است
کو مدعی گر نگر ندہ است در آید
گل ہم چہ کند بادِ صبا خواست کہ عُرفیؔ
آید سوئے کشمیر و گلشن بر اثر آید



خواجہ عزیز الدین کشمیری عزیزؔ لکھنوی:

جلوہ گر در دلِ سالک بود انوارِ خدا
یا بُود عکس گل و لالہ کہ افتادہ بہ دل
سزد از نسبتش از فخر کند آبِ حیات
کا آبرو یافتہ از خاکِ در حضرت بل

عزیزؔ نے اپنے کلام کا بہت بڑا حصہ کشمیر کی نذر کیا ہے جس میں مثنوی

گلگشت کشمیر، خانقاہِ امیر کبیر قدس سرہٗ، کوہِ ماران، سری نگر دار السلطنت، حضرت بلبل شاہ، چشمہ شاہی، جھیل وُلر، باغِ نشاط، شالیمار باغ، نسیم باغ، گلمرگ، لار، مثنوی ارمغانِ لاجواب اور اسی قبیل کی کئی اور شعری تخلیقات بھی شامل ہیں۔

غنی کشمیری:

کردہ است ہوائے ہند دلگیر مرا
اے بخت رساں بباغِ کشمیر مرا
گشتم ز حرارتِ غریبی بے تاب
از صبح وطن بدہ طباشیر مرا

قُدسی مشہدی:

خوشا کشمیر و خاکِ پاکِ کشمیر
کہ سر برزد بہشت از خاکِ کشمیر
نبود اہل جناں را سیر گاہے
بہ کشمیر از جناں کردند راہے
بخوبی آں چناں کشمیر طاق است
کہ معشوقِ خراسان و عراق است
زہر سو چوں خراسان صد ندیمش
عراق از خاکسارانِ قدیمش
سزد کشمیر را در جلوۂ ناز
ہزار اللہ اکبر گو چو شیراز

کلیم نے کشمیر کے باغات، عمارات، کتب خانوں اور دیگر تاریخی مقامات پر بھی ہزاروں اشعار لکھے ہیں۔

مولانا ابوالبرکات مُنیرؔ لاہوری:

خوشا کشمیر وضعِ بے نظیرش
کہ گردیدہ ارم فرماں پذیرش
چہ کشمیر آب و رنگ روئے گلشن
نگہ را از خیالش گل بدامن
دریں گلشن نہ باشد غنچہ نومید
بہار ایں جا بود جاوید جاوید

پنڈت بیربل کاچرو:

بہر شاخِ گل شاد وخنداں نشین
گل عیش از باغِ عشرت بہ چین
کہ گل در گلستان بہ فرحِ نشاط
بہ تختِ چمن ریخت طرحِ نشاط
بہار است اے ہُد ہُد نامہ بر
دل از کف مدہ برکُشا بال و پر
بہار است اے ساقیِ بادۂ نوش
بکش پنبۂ غفلت از ہوش و گوش
بہار است اے مُطربِ خوش ادا
بزن بربط و چنگ و برکش نوا
کہ نوروز فیروز شُد جلوہ گر
جہاں خلعتِ تازہ کردہ بہ بر

حافظؔ شیرازی:

زشعر حافظؔ شیراز مے گویند و مے رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و تُرکانِ سمر قندی

سعدیؔ شیرازی:

بدیں کمال ندارند حُسن در کشمیر
چنیں بلیغ ندانند سحر در بابل
ہمشیرۂ جاودانِ بابُل
ہمسایہ لعبتانِ کشمیر

خواجوؔ کرمانی:

چہرۂ خوب تو رشکِ لعبتِ نوشاد
نرگس مست بلائے جادوئے کشمیر

مولاناؔ جامی:

یکے گفتا کہ در اقصائے کشمیر
نہ شیرینی نباشد ہیچ تقصیر
مقام خوب رویاں آں زمیں است
بخوبی رشکِ فردوس بریں است

مولانا شیخ یعقوب صرفیؔ:

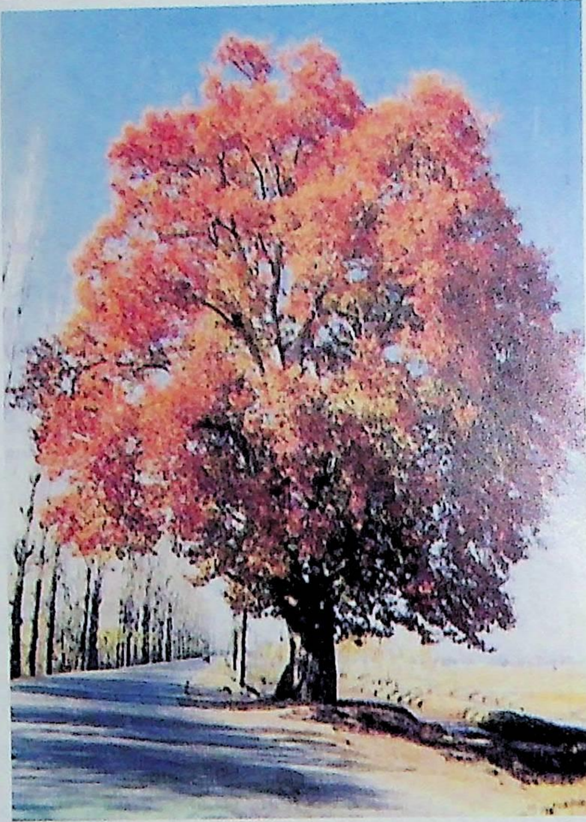
جدا ز روئے تو چوں دوزخے است صرفیؔ را
اگر چہ رشکِ بہشت است گلشن کشمیر

عبدالقادر بیدلؔ:

کشمیر کہ انتخاب باغِ دُنیا است
در ہر کفِ خاکش در جہاں نشو و نما ست

پنڈت دیارام کاچرو خوشدلؔ:

الٰہی غنچۂ امید بکشاے
بہار گلشن کشمیر بنماے



کشمیر کا فلک بوس شاہی درخت چنار جو صدیوں سے سرزمین کشمیر کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں سے سہلا رہا ہے

پنڈت راجکول دیرتی کشمیری:

جہاں شگفتہ ز رنگِ بہارِ کشمیر است
نگار خانہ چنیں لالہ زار کشمیر است
سحر بہ باغ نشاطم نسیم صبح آورد
کہ آبروئے جہاں شالہ مار کشمیر است

نامعلوم:

صبح در باغِ نشاط وشام در باغِ نسیم
شالمارو ولالہ زارو سیرِ کشمیر است و بس

ملّا محسن فانی:

ہر کہ ہست از اہل دیں گردد ز دُنیا گوشئہ
من ہم از عالم گرفتم گوشئہ کشمیر را

اردو زبان کے متقدمین سے لے کر آج تک کے ہم عمر شعراء نے بھی وقتاً فوقتاً کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے۔ رواں صدی کے اوائل میں برصغیر کے جو سخنور کشمیر کے مدح خوان بنے اُن میں علامہ اقبالؔ، فانی بدایونی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نواب جعفر علی خان اثر لکھنویؔ، چودھری خوشی محمد ناظرؔ، حفیظ جالندھری، محمد دین فوق وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں عاشقانِ کشمیر کے اس قافلے میں ساغر نظامی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شاہد عزیز روش صدیقی، شاذ تمکنت، راہی معصوم رضا، وامقؔ جونپوری اور شمیم کرہانی بھی شامل ہو گئے۔

ریاست کے ایک سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے دورِ اقتدار میں انیسویں صدیِ کے وسط میں جشن کشمیر کے انعقاد نے جہاں کئی بخشی نواز شاعروں مثلاً انورؔ صابری، فنا نظامی کانپوری، انور مرزاپوری اور حیات وارثی کو بھی کشمیر سے مُتعارف کرایا وہاں اس سالانہ جشن کی گوناگوں تقریبات کے صدقے ہندوستان کے درجنوں شاعروں نے مدحِ کشمیر میں بھی طبع آزمائی کر کے اس سرمائے میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

برِصغیر کے جن شعراء نے ایک والہانہ پن کے ساتھ کشمیر کو اپنا پسندیدہ موضوع بنا لیا اُن میں علامہ اقبالؔ سرفہرست ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر اُن کا وطن مالوف تھا اور وہ ایک عالمِ ہجر میں موتی عدن سے لعل ہوا ہے، یمن سے دور کے مصداق اس کے فطری حسن اور اس میں رہنے والے محکوم و مظلوم عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تادم مرگ برابر خامہ فرسائی کرتے رہے۔

اپنے دو مجموعوں ''پیامِ مشرق'' اور ''ارمغانِ حجاز'' میں اقبآل نے کشمیر کو بار بار اپنی نغمہ سنجی کا موضوع بنالیا ہے۔ اقبآل نے جب بھی کشمیر پر قلم اٹھایا تو خطۂ کشمیر کی فطری خوبصورتی کو سراہتے سراہتے وہ بالآخر اسی تلخ حقیقت کے ترجمان بنے جو اہل کشمیر کی غلامی کی شکل میں ان کے دل پر بار بار چرکے لگاتی رہی۔ ''ساقی نامہ'' اس جذبے کی ایک نمایاں مثال ہے جسے اقبآل نے کشمیر کے نشاط باغ میں تحریر کیا۔ اس نظم کا نصف حصہ کشمیر کی تعریف و تحسین اور آخری حصہ کشمیریوں کی نکبت وافلاس اور اُن کی جہالت کا حال نہایت دل گداز پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ البتہ اُن کی ایک انمول شعری تخلیق ''کشمیر'' غالباً اُن کی ایسی واحد نظم ہے جس میں اقبال نے خالصتاً کشمیر کے حُسن اور دختر کشمیر کی خوبصورتی کا ذکر کیا ہے۔ اقبال کے اس دل نشین فارسی شاہکار کو یہاں پر احساس وخیال کے کیف وسُرور کو دو چند کرنے کی غرض سے من وعن پیش کیا جاتا ہے:

رختِ بہ کاشمر کشا کوہ وتل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بین لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مُرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسرِ نارون نگر
تانہ فتد بہ زینتش چشم سپہر فتنہ باز
بستہ بہ چہرۂ زمین برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آبِ جو تپید
خاک شرر شرر بہ بین آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز
قافلہ بہارررا انجمن انجمن نگر

دختر کے برہمنے لالہ رُخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بہ خویشتن نگر

اس کے برعکس ایک حیران کُن بات یہ ہے کہ انیسویں صدی کے لاتعداد کشمیری شاعروں یعنی متوسطین نے اپنے اس وطن مالوف کو اپنی شاعری میں بہت حد تک نظر انداز ہی کرلیا ہے۔ محمود گامی، رسول میر، مقبول کرالہ واری، عبدالاحد ناظم، ولی اللہ متو، عزیز اللہ حقانی یا عبدالاحد نادم کے کلام میں مشکل سے کشمیر کا ایک سرسری تذکرہ نظر آتا ہے۔ البتہ اس کمی کو دور کرنے میں بعد میں غلام احمد مہجور، عبدالاحد آزاد اور فاضل کشمیری اور بہت حد تک کئی ہم عصروں نے ایک قابل قدر حصہ ادا کیا۔

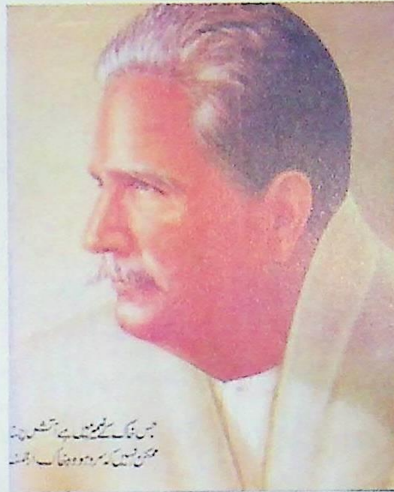


اقبالِ کشمیر

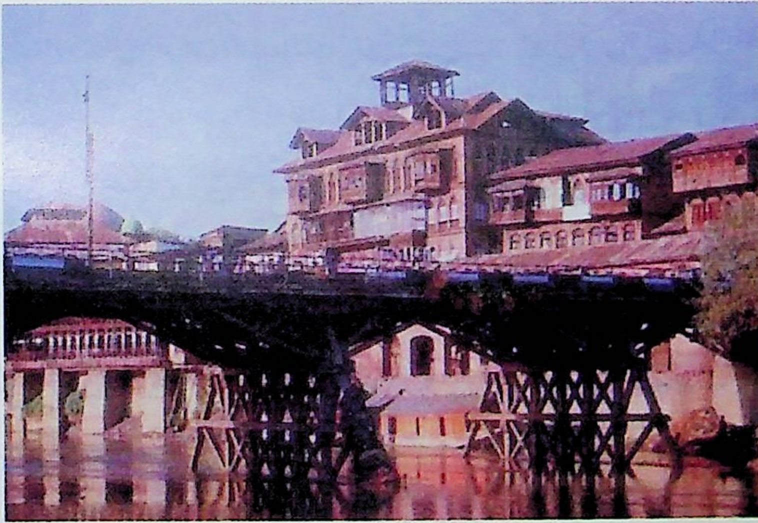
اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو کشمیر نژاد شخصیات اپنی مادرِ وطن سے دور ہندوستان کے مختلف خطوں میں زندگی کے شعبۂ ہائے عمل میں اپنے فہم و دانش اور تخلیقی صلاحیتوں کی جلوہ باریوں سے دوسروں کو متاثر کرتے رہے ان میں سے بدقسمتی سے صرف معدودے چند ایسے شاعر، ادیب اور صحافی نظروں کے سامنے ہیں جنہوں نے کشمیر کی اُس تحریک آزادی کو اپنے فن اور قلم کی حدت و حرارت سے شعلوں کی شکل عطا کی جو تحریک کشمیر میں ایک پوری صدی پر پھیلے ہوئے شخصی راج کی انسان کشی اور عوامی استحصال کے نیچے تلے بہت حد تک پسپا ہو چکی تھی۔

اِدھر 13/ جولائی 1931ء سے پہلے ہی 1924ء میں ریشم خانے کے احتجاجی اہل کاروں کو لوہے کے بھاری گولوں سے باندھ کر ایک مقامی نالے میں دریا برد کیا گیا تھا اور اُدھر اس قربانی کی چنگاری رفتہ رفتہ آتش کدۂ حریت کی شکل اختیار کر رہی تھی جو بعد میں ایک انسانی طوفان بن کر 13 جولائی کے دن کشمیر کی ساری تاریخ کو بدلنے کا موجب بن گئی۔

ان واقعات کشمیر کی عکاسی کرنے والوں میں علامہ اقبال کے سوا ہمیں شاذ ہی ایسا کوئی فرزند کشمیر نظر آتا ہے جس نے دردِ کشمیر کو محسوس کیا ہو اور اس کے نالۂ وفغاں کو اپنی صریر خامہ کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہو۔



علامہ اقبال جنہوں نے تمام اردو شاعروں میں سے
سب سے زیادہ کشمیر کی تحریک آزادی کی ترجمانی کی



اقبآل کے دور کا ایک منظر جس میں سرینگر شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریائے جہلم کے کنارے زینہ کدل پل کے پاس شہر کی ایک قدیم عمارت اور بائیں طرف سلطان زین العابدین بڈشاہ کی والدہ کے مقبرے کا گنبد ہے۔اس پل پر آج سے کئی سال قبل دکانوں کی قطار تھی جسے رفتہ رفتہ وہاں سے ہٹایا گیا اور یہ دکانیں آس پاس ایک بہت بڑے بازار میں منتقل کی گئیں جو آج تانبے کے برتن بنانے والے کاریگروں کی وجہ سے سارے شہر میں مشہور ہے۔

ان کشمیر نژاد گراں قدر ہستیوں میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، برج نراین چکبست، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، آغا حشر کشمیری، چراغ حسن حسرت، شورش کشمیری اور کئی اور اکابرین اور اصحابِ فکر وفن شامل ہیں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان سے قطع نظر جن چند غیر کشمیری ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے حریت کشمیر کی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کی حمایت میں اپنے قلم کا بے باکانہ استعمال کیا اُن میں مولانا ظفر علی خان اور حفیظ جالندھری کے اسماء سرفہرست ہیں۔ حفیظ نے 13 جولائی کے خون آشام واقعہ پر جو نظم ''خون کے چراغ'' لکھی اور اس سے قبل ''تصویر کشمیر'' کے عنوان سے ایک طویل نظم میں کشمیر کے دلآزار اور دل شکن واقعات کو جس طرح بیان کیا اس کے مدنظر یہ دونوں منظومات ابدی فن پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سارے تناظر میں علامہ اقبالؔ کی ذاتِ باصفات کشمیر کے حوالے سے مٹیالے اور دُھندلے مطلع پر ایک ماہِ تاباں کی طرح نور افشاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے کشمیر میں عوامی تحریک کو بڑھاوا دینے کی غرض سے جو بیش بہا رول ادا کیا اس کی افادیت اس حقیقت کے پیش نظر اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اقبالؔ زندگی میں صرف ایک ہی بار کشمیر آئے لیکن یہاں آکر انہوں نے جس طرح شخصی حکمرانوں کے ہاتھوں کشمیر کے محکوم و مجبور عوام کو ایک عالمِ بے بسی میں شب وروز گذارتے دیکھا اُس سے اقبالؔ کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا اور اُس نے عام کشمیری کے اس درد اور تڑپ کو بری طرح محسوس کیا۔

اپنی 61 سالہ زندگی کے دوران اقبالؔ فکری اور ذہنی طور پر کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کے ساتھ برابر وابستہ رہے اور انہوں نے ایسے کسی واقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جب انہیں اپنے جدا ہو چکے بھائیوں کے حالِ زار کے ساتھ

یک جہتی کا اظہار کرنا تھا۔

علامہ اقبال جب کشمیر تشریف لائے تو انہوں نے یہاں سرسبز اورشاداب وادیوں کو سلگتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ چناروں کی چھاؤں میں انسانی غلامی کی آگ ہر گرد و پیش کو خاکستر میں تبدیل کر رہی ہے۔ انہوں نے یہاں نشاط باغ میں ایک فارسی نظم تحریر کی۔ اس میں انہوں نے اہلِ کشمیر کی غفلت اور ان کے عالم مجبوری میں زندگی گذارنے کی طرز عمل کو ہدف تنقید بناتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بُتے می ترا شد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بُلندے
خودی ناشنا سے زخود شرمسارے
نہ دردیدۂ او فروغِ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بےقرارے

ان اشعار پر کشمیر میں اور خاص کر لاہور میں چند کشمیر نواز دانشوروں نے یہ اعتراض کیا کہ اس سے اہل کشمیر کی تضحیک ہوتی ہے لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبآل اپنی اس شاعرانہ سرزنش سے کشمیری عوام کو خواب غلامی سے بیدار کر کے حصولِ آزادی کی خاطر سر بکف ہو کر میدانِ کارزار میں اترنے کی ترغیب دے رہے تھے لہذا یہ اعتراضات محض ذاتی نکتہ چینی پر مبنی تھے جس طرح مولانا ظفر علی خان نے اُس وقت بھی اقبال پر طنز کیا تھا جب اقبال کو Knighthood یعنی سر کا خطاب دیا گیا تو مولانا نے کہا:

سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

اقبآل اگر کشمیری قوم سے مایوس ہو چکے ہوتے تو وہ ایک عالمِ بے چارگی

میں بھی جس میں کشمیریوں کے لیے محبت اور شفقت کی شدت اور حرارت شامل تھی۔اس نوع کے اشعار نہیں کہتے کہ:

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

یا وہ ایک فطری اضطراب میں کشمیریوں کے تئیں یہ صدائے حق اور دُعائے فردا بلند نہیں کرتے:

ازاں مئے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

ساقی نامہ میں ''کشیری کہ با بندگی خوگرفتہ ۔ بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے'' کی تخلیق واشاعت کے بعد مخالفت کا جو طوفان بے ہنگم کھڑا ہوا اسے دبانے کے لئے اقبالؔ نے خود 26 مئی 1923ء کو اُس وقت کے محکمہ خارجہ کے ایک افسر میر خورشید احمد کو ایک مراسلے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔

''ساقی نامہ کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔افسوس ہے کہ ہندوستان سے فارسی رخصت ہوگئی۔سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہم سفر رہ چکا ہے۔میں نے تو دُکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدر جہا بہتر ہے۔نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہے نہ کہ کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔اُن کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا واجداد اہل خطہ میں سے ہیں''

یہ تو مصلحت پسندی کی غیر ذمہ وارانہ حرکت ہی معلوم ہوتی ہے کہ کشمیر اور اہل کشمیر کے بارے میں اقبالؔ کے ہمدردانہ اور مشفقانہ حالات کو توڑ مروڑ کر

پیش کیا جائے۔ ایک طرف وہ کشمیریوں کی آزادی کے علمبردار تھے لیکن دوسری جانب کشمیریوں کی غفلت شعاری، توہم پرستی اور تقدیر نوازی کے جذبات سے ہم آہنگ نہیں تھے کیونکہ وہ عمل اور جہد مسلسل کے پیامبر تھے۔ اسی لیے محمد دین فوق کے نام 8 جون کے خط میں اہلِ کشمیر کی قبر پرستی پر ہر قلم کو حرکت دینے کی ترغیب دے رہے تھے "کشمیر اور اہلِ کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور اُن کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے" اور 19 دسمبر 1922ء کو فوق ہی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ "اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح پیدا کی جائے"

اقبالؔ اور کشمیر کے حوالے سے اب میں ایک ایسے سوال کو بارِ دگر اٹھانا چاہتا ہوں جس کی رُو سے مرحوم جگن ناتھ آزاد نے اقبال اور کشمیر نام کی اپنی تصنیف میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے جاوید نامہ میں شیخ محمد عبداللہ اور مولانا احمد اللہ ہمدانی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اس متنازعہ نکتے کی گرہ کشائی سے مراد صرف یہی ہے کہ تاریخی واقعات کو اور بالخصوص جب اُن کا تعلق شاعر مشرق کے نظریات کے ساتھ ہو، صحیح اور مستند تناظر میں پیش کر کے آزاد صاحب جیسے اقبال شناس کے مفروضے کو معتبر ثبوت کے ساتھ رد کیا جائے ورنہ اس کی بنا پر کشمیر کی اقبال نوازی سے وابستہ خاص طور پر نوجوان نسل کے گمراہ ہونے کا اندیشہ قائم رہے گا۔

اقبالؔ اور کشمیر کے موضوع پر آج تک تقریباً نصف درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں تین کتابیں جو سب سے پہلے شائع ہوئیں ایک ہی عنوان یعنی "اقبال اور کشمیر" سے بالترتیب جگن ناتھ آزاد۔ صابر آفاقی اور سلیم خان

گمی نے تصنیف کی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ تینوں تصانیف ایک ہی سال یعنی 1977ء میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ غالباً ان کتابوں کا سال اشاعت اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اقبال 1877ء میں پیدا ہوئے اور 1977ء اُن کے سویں یوم پیدائش کے طور پر منایا گیا۔ اس عظیم شاعر اور فلسفی کو خراج تحسین ادا کئے جانے کی غرض سے یہی سال ان کتب کو منظر عام پر لانے کے لئے منتخب کیا گیا۔

اس کے بعد میں نے "اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر" کے نام سے اردو میں اپنی کتاب سب سے پہلے 1997ء میں از خود شائع کی اور اس میں پہلی بار اس متنازع فیہ سوال کو وضاحت سے پیش کر کے صحیح واقعات سے قاری کو آگاہ کیا گیا۔ میری تصنیف کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکادمی لاہور پاکستان نے 1999ء میں شائع کیا جس کا پیش لفظ احمد ندیم قاسمی نے لکھا اور اب اس کا تیسرا ایڈیشن دہلی سے طبع ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر فریدہ مجید حکاک نے بھی اسی موضوع پر اپنی تصنیف شائع کی لیکن حیرت کا مقام ہے کہ اس نہایت اہم اور حل طلب سوال کو زیر بحث لانے کی میرے سوا کسی اور نے نہ تو کوشش ہی کی اور نہ ہی اُن کی کتابوں میں یہ مسئلہ توضیحی طور پر زیر بحث لایا گیا۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ اقبال شناس اور کشمیر کے محبّ الوطن اہلِ قلم اور محقق اس موضوع پر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر قلم اٹھائیں اور اس کی اصل حقیقت کو معتبر تحقیق کے بعد سامنے لائیں۔

مرحوم جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ علامہ نے جاوید نامہ میں ایک جگہ کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ اور ایک کشمیری دینی مبلّغ مولانا احمد اللہ ہمدانی کو کشمیر کے ممتاز ترین قائد قرار دے کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس مفروضہ کی اُس وقت سردار جعفری نے بھی پر زور الفاظ میں

تردید کی تھی۔ جاوید نامہ کی اشاعت فروری 1932ء میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ زیر بحث نظم اقبالؔ نے اس سے قبل ہی تخلیق کی ہوگی جس میں بقول آزاد شیخ صاحب کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے جب کہ اس وقت شیخ صاحب میدانِ سیاست میں محض ایک طفلِ مکتب تھے اور کسی بلند مرتبے پر نہیں پہنچے تھے۔

آزاد کے مفروضے کی تردید میں اقبالؔ کی نظروں میں شیخ محمد عبداللہ کے مقام کا تعین اُس خط سے بھی کیا جاسکتا ہے جو علامہ نے شیخ صاحب کو 17 اکتوبر 1933ء کو یعنی جاوید نامہ کی اشاعت کے کم از کم بیس ماہ بعد لکھا اور جس میں انہوں نے اس کشمیری سیاست دان کو مکرمی یا محترمی یا شیخ محمد عبداللہ صاحب کے الفاظ سے مخاطب ہونے کے برعکس صرف ڈیر شیخ عبداللہ صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ کیا یہ بات ایک حقیقی واقعہ کے طور پر قبول کی جاسکتی ہے کہ اس پس منظر میں علامہ شیخ صاحب کو اپنی ایک شعری تخلیق میں خراج عقیدت پیش کریں؟ 22 جنوری 1934ء کے ایک اور مراسلے میں سید نعیم الحق وکیل کے نام شیخ صاحب کا ذکر اقبال نے اس عام انداز میں کیا ہے۔ ”میں نے شیخ عبداللہ صدر کانفرنس سے بھی تذکرہ کیا ہے“

شیخ عبداللہ کی سیاسی زندگی کا آغاز 1931ء میں ہوا جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر کے آئے تھے۔ اور مہاراجہ ہری سنگھ کی سرکار میں ایک سکول میں مدرس ہوگئے تھے۔

اسی طرح میر واعظ احمد اللہ ہمدانی سے زیادہ کشمیر کی سیاسی زندگی کے قافلہ سالاروں میں میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ۔ خواجہ سعدالدین شال، غلام احمد عشائی اور غلام نبی گلگار پیش پیش تھے۔ میر واعظ ہمدانی کے بارے میں خود شیخ صاحب نے یہ واقعہ قلم بند کیا ہے کہ جب وہ کشمیر چھوڑ کر لاہور گئے تو علامہ

اقبال نے انہیں وہاں پناہ لینے پر زبردست جھاڑ پلائی اور یہاں تک کہا کہ اگر تم وہاں گولی کھا کر شہید ہو جاتے تو بہتر تھا۔ اس پر ہمدانی نے اقبالؔ کے بارے میں شیخ صاحب ہی کی موجودگی میں یہ کہا تھا کہ ''وہ چرسی قسم کا ایک آدمی ہے جو خود روزے بھی نہیں رکھتا اور ہمیں گولی کھانے کی ہدایت کرتا ہے'' کیا عقل اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے کہ اقبالؔ مولانا ہمدانی کو انہی دنوں اپنے ایک شعری فن پارے میں خراج تحسین پیش کریں؟

اسی تنازعہ میں کلیم اختر کی تصنیف ''اقبال اور مشاہیر کشمیر'' میں مذکور مولانا محمد علیم الدین سالک کے حوالے سے اس واقعہ کی روایت موجود ہے جس کے مطابق سالک کہتے ہیں کہ ''مجھے یاد ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی کے صدر تھے۔ انہیں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے خطوط موصول ہوتے۔ آپ انہیں پڑھتے اور آتش دان میں پھینک دیتے۔ ایک دفعہ شیخ صاحب تشریف لائے اور گلہ کیا کہ آپ جواب نہیں دیتے۔

علامہ فرمانے لگے۔ ''میں کشمیر کا کام کرتا ہوں اور یہ کام مجھے جان سے عزیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ لوگوں کے ذاتی مفاد کے لئے ٹکے ٹکے کے لئے لوگوں کے پاس جاؤں''

اقبالؔ کے اس بیان سے بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُن کی نظروں میں شیخ صاحب کی شبیہ کس حد تک مکدر ہو چکی تھی کہ وہ ان کے خطوط پڑھے بغیر یا پڑھنے کے بعد نذرِ آتش کر دیتے کیونکہ ان کے بقول ان مراسلوں میں صرف مالی امداد کی التجائیں کی جاتی تھیں۔

میں اس موضوع سے یہیں پر دست کش ہو کر اس نکتے کو جدید اور سائنسی بنیادوں پر تحقیق کے ذریعہ گرہ کشائی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور ایسا کرنا ہم عصر تاریخ کشمیر کے صفحات کی مسخ شدہ صورت کو اصلی زیب و زیبائش سے

آراستہ کرنا ہے۔اس سلسلے میں اقبال نوازوں، تحقیق کاروں اور اقبالیات کے طلباء پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ علامہ اقبال، شیخ محمد عبداللہ اور جگن ناتھ آزاد کی شخصیات کے محور کے اردگرد طواف کرنے والے اس بیانیہ کو طاق نسیاں سے نکال کر اور اس پر سے وقت کی گرد جھاڑ کر حقائق کو سامنے لا کر اقبال کے ساتھ بھی انصاف کریں اور ہماری مسخ شدہ تاریخ کے اس اضافی صفحہ کو بھی صداقت کی روشنائی سے ازسرِنو قلم بند کریں۔

علامہ اقبال کشمیر کے لئے ایک پرعزم سپاہی، کشمیریوں کے لیے بااعتقاد ہمدرد اور کشمیر کی آزادی کی خاطر ایک ایسے مجاہد کی صورت میں اُبھر کر برصغیر کی ادبی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں جنہوں نے کشمیر کی تہذیب و ثقافت، وراثت اور کشمیریت کے لئے اپنے قلم کو تلوار بنا کر اہلِ کشمیر کی سب سے زیادہ اور سب سے پُراثر ترجمانی کی ہے۔

میں اس مقالے کو اقبال پر لکھی گئی فیض احمد فیضؔ کی نظم کا پہلا بند درج کر کے اختتام پر لاتا ہوں:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں چلا گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ گئیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

☆☆☆

ذکرِ رومیؒ اور اُن کے ہم عصر مشاہیر

مولانا جلال الدین رومیؒ کی شاعری اور فلسفے کے تعلق سے جب بھی میں اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کا عزم کرتا ہوں تو اُن کے حوالے سے کسی بھی قسم کی خیال آرائی کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے ہی مجھ پر رقت طاری ہو جاتی ہے جس کی ظاہری وجوہات کی توضیح و تشریح میرے لئے ناممکن بن جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کئی اور اصحابِ دل اور عقید تمندانِ صدق و صداقت بھی اسی طرح اس ناقابلِ بیان حالت قلبی سے ضرور دوچار ہوتے ہوں گے۔ اس جنونی حالت کے پس پردہ دراصل حضرت مولانا کی مثنوی کارفرما ہے جس کا باذوق اور گہرا مطالعہ قاری کو الٰہیات اور تصوراتِ الٰہی کی پُراسرار دنیا میں لے جا کر اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔

مولانا رومیؒ نہ صرف سارے مشرق بلکہ دنیا بھر کے لئے ایک صاحبِ کمال شاعر تھے جن کا فلسفۂ حیات تاریخ اسلام کے منور اوراق سے مرتب اور مزین ہے اور اسی وصل الٰہی کی جستجوئے پیہم انہیں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں میں شامل کرتی ہے۔ اس پس منظر میں مثنوی کی مدح میں یہ شعر برمحل اور موزون ہے کہ:

مثنویٔ معنویٔ مولوی　　ہست قراں در زبان پہلوی

جس طرح فردوسیؔ نے شاہنامہ میں تحریر کر کے دعویٰ کیا تھا کہ:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اُسی طرح مولانا رومیؔ کے بارے میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کمالِ فن اور اظہارِ تجربہ کی سربلندی کی بدولت سارے فارس کو تصوف کا ایک ابدی تصور بخشا اور وہ خود بھی اسی روحانی کیفیت کی پرورش میں اپنی زندگی کے چھیاسٹھ سال وجد و سرور کی دنیا کو آباد کر کے خود بھی لافانی بن گئے۔

یہاں پر میں ایک جملۂ معترضہ لازماً درج کروں گا جس کی طرف غالباً توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثنوی رومیؔ میں حکایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات کے ساتھ ساتھ پند و نصائح کے جو انمول موتی لٹائے گئے ہیں وہاں حضرت رومیؔ نے اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عوام پسند بنانے کی غرض سے جگہ جگہ ایسی زبان اور اسلوب سے بھی کام لیا ہے جسے براہِ راست فحش نگاری کہا جا سکتا ہے۔ حفظِ مراتب کا تقاضا ہے کہ اُن کے اس نوع کے اشعار یہاں درج کرنے سے احتراز کیا جائے۔ لیکن اس پسِ منظر میں مثنوی کو ''ہست قراں درزبانِ پہلوی'' قرار دے کر مولانا کے تئیں نذرانۂ عقیدت بہت حد تک غیر موزوں اور مبالغہ آمیزی کا برملا اظہار دکھائی دیتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ قرآن پاک میں اس قسم کی فحش گوئی کا ایک لفظ بھی نظر نہیں آسکتا۔ اسی لئے غالباً میر عباس شبستری نے اپنی تعریف اور مولانا رومیؔ کی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے:

مثنویٔ مولویٔ روم نیست   ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست

مولانا جلال الدین رومیؔ 30 ستمبر 1207ء کو بلخ، مزار شریف (موجودہ افغانستان) میں پیدا ہوئے اور 17 دسمبر 1273ء کو ترکی کے قونیہ شہر میں واصلِ بحق ہوئے جہاں اُن کا آستانہ دنیا بھر سے عقیدت مندوں کو

متواتر طور پر دعوتِ عشقِ الٰہی دیتا ہے۔

مولانا کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول عام اُن کی مثنوی کو حاصل ہوا ہے جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل دین کی تفسیر، فلسفۂ حیات وممات، انسان کی باادب زندگی میں تصوف کا مقام اور خدا کے ساتھ قلبی قربت حاصل کر کے اُس کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرنے کے عظیم فلسفہ کا احاطہ کر لیتی ہے۔ مثنوی کو فارسی شاعری میں ایک ضخیم تخلیق کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس زمرے میں عربی الف لیلہ ولیلۃ اور فارسی میں شاہنامہ فردوسی کے علاوہ ابوبکر محمد ابن انباری (884-939) کی تصنیف غریب الحدیث کا بھی ذکر آتا ہے جو پینتالیس ہزار صفحات پر تحریر کی گئی ہے (1)

مثنوی کے علاوہ پیر رومؔی نے دیوان کبریا، دیوان شمس تبریز، مجلسِ صبا، مکتوبات، فیہہ مافیہہ وغیرہ تخلیق کی ہیں۔ اُن کی صو فیانہ منظومات کی تعداد ڈھائی ہزار بتائی جاتی ہے۔

مثنویٔ رومی کو مکمل کرنے میں مولانا کی زندگی کے پچیس سال صرف ہوئے۔ اس کے جملہ اشعار کی تعداد پچیس ہزار بتائی جاتی ہے گویا ہر سال وہ اس کے صرف ایک ہزار ابیات تخلیق کر سکے۔ اُن کی صوفیانہ منظومات کی تعداد ڈھائی ہزار ہے اور انہوں نے سولہ سو رباعیات تخلیق کی ہیں۔

مثنوی میں مولانا رومؔی کے ہند کے ساتھ تصوراتی قرابت داری اور ہند کی شاندار تاریخی روایات کا جلوہ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک کہانی کا تعلق ایک سوداگر کے ساتھ ہے جو اپنے طوطے سے ہند کے طوطوں کے لئے ایک پیغام لے جاتا ہے۔ ایک اور کردار کے بارے میں یہ کہانی درج ہے کہ جب اُس نے فرشتۂ اجل کو دیکھا تو وہ حضرت سلیمان کے پاس گیا اور اُس سے گزارش کی کہ وہ اُس کی جان بچانے کی غرض سے اُسے ہندوستان بھیج دے۔ اس کے علاوہ

مثنوی میں کئی کہانیاں اور واقعات کلیلہ و دمنہ سے لی گئی ہیں جو پنچ تنتر کا عربی اور فارسی روپ ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؔ نے دنیائے مشرق میں فکر و فن اور فلسفہ تصوف کے جو چراغ روشن کیئے اُن کے نور سے رفتہ رفتہ سارے جہان کی ثقافتی اور روحانی دنیا منور ہوتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں مولانا کو دنیا اور بالخصوص مشرق کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مولانا کی شاعری میں تخیلات کی جولانی اور تفکرات کی روانی کے ساتھ ساتھ اُن کے روحانی کمالات کا جو ایک وسیع تر کینواس میں احاطہ کیا گیا ہے اُس کی مثال مشرقی ادبیات میں ملنا محال ہے۔

مولانا چونکہ خود ایک فنا فی اللہ شخصیت کے مالک تھے اور اس عالم وارفتگی میں وہ خود بھی رقص کرتے کرتے نیم بے ہوشی کی حالت میں گر پڑتے اور دیر تک ایک ایسی دنیا میں اُن کا قیام رہتا جس کے اندرون کو واضح کرنا مشکل ہے۔ اسی عمل کے اتباع میں اُن کی وفات کے ساتھ ہی اُن کے لاتعداد مریدوں نے ایک مخصوص صوفی رقص، سماع کے نام سے متعارف کرایا جو آج بھی ترکی میں وہاں کی تہذیبی اور روحانی زندگی کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔

یہ رقصِ درویشانہ رقاص لمبے لمبے چغے اور اونچی ترکی ٹوپیاں پہن کر دائیں سے بائیں جانب لہراتے ہوئے جسم و جان کے ساتھ دیر تک کرتے ہیں اور اس طرح سے ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جس کے بارے میں امیر خسرو کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے:

نمے دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم

اس مخصوص رقص کو ساتھ منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جنہیں ناچتے

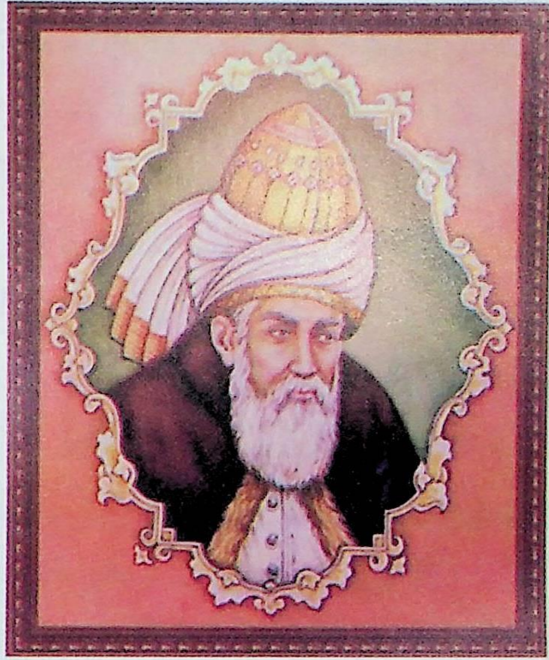
ناچتے طے کرنے کے بعد درویش فکر اور عشق کو ایک ہی لڑی میں پرو کر ایک عالم الٰہی میں وارد ہوتے ہیں۔

یہ رقص آج بھی ترکی میں خاص طور پر ہر سال مئی میں اور دسمبر کے مہینوں میں کیا جاتا ہے۔ مئی کے مہینے میں ہی مولانا نے شہر میں قدم رکھا اور 10 سے 17 دسمبر تک اس جشن رقص کو شبِ عروسی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی تاریخوں میں مولانا نے ابدی زندگی کے ساتھ اپنا لافانی رشتہ جوڑ لیا تھا۔

15 نومبر 1244ء کو درویش شمس تبریز کے ساتھ ملاقات نے مولانا رومؔی کی زندگی میں ایک انقلاب لایا۔ اس سے قبل شمس تبریز نے سارے مشرق وسطیٰ کا اس لئے سفر کیا تھا تاکہ اُس کی زندگی میں کوئی آکر اُس کا ہمراز اور ہمنوا بن جائے۔ ایک غائبانہ آواز نے ایک بار اُس سے پوچھا "اگر تمہاری یہ مراد پوری ہو جائے تو اس کے عوض تم اُس شخص کو کیا دو گے؟"۔ شمس نے فوراً جواب دیا۔ "اپنا سر"۔ یہ آواز پھر آئی۔ "تو ایسا ہے کہ جس شخص کی تمہیں تلاش ہے وہ قونیہ کا جلال الدین ہے۔"

5 دسمبر 1248ھ کی رات جب رومؔی اور شمسؔ محو گفتگو تھے شمس کے کانوں میں عقبی دروازے سے ایک آواز آئی۔ وہ اُس طرف چلا گیا اور پھر اُسے کبھی دیکھا نہیں گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد شمس تبریز کو قتل کیا گیا اور اس اقدام میں مولانا رومؔی کے فرزند علاؤالدین کا ہاتھ تھا۔ اس طرح سے شمس تبریز نے دفعتاً اس صاحبِ نظر کو پا کر اپنا سر قربان کر دیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ اصل میں شمس تبریز کے ساتھ زبردست قرابت کی وجہ سے مولانا رومؔی کے عقیدت مند اور احباب سازشی عناصر نے کئی بار شمس کو مولانا کی صحبت سے دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مولانا کے دل و دماغ میں شمس کی عظمت اور عقیدت کا جذبہ کم ہونے



کے برعکس روز بروز شدت اختیار کرتا گیا اور بالآخر اُسے وہ دن بھی دیکھنا پڑا جب اُس کے روحانی قائد کو موت کو گھاٹ اُتار دیا گیا۔

مولانا رومیؒ اور شمس تبریز کی شناسائی کے واقعات حکایاتی اور افسانوی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثنوئ روم کے مترجم مولانا سجاد حسین نے ایسے واقعات کا اس طرح سے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ''مولانا کی زندگی میں شمس تبریز کی ملاقات کا واقعہ جس قدر اہم ہے اُسی قدر یہ واقعہ معرضِ خفا میں ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا ایک روز اپنے شاگردوں کے حلقہ میں رونق افروز تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر تھے کہ اچانک شمس تبریز قلندرانہ انداز میں آپہنچے اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا یہ وہ چیز ہے جس سے تم واقف نہیں ہو۔ مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ اچانک کتابوں میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے شمس تبریز سے کہا کہ یہ کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ چیز ہے جس سے تم واقف نہیں ہو اور یہ

کہہ کر مجلس سے روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ سے مولانا کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ تمام گھر بار اور شان و شوکت کو خیر باد کہا اور صحرا نوردی شروع ہو گئی۔ ملک کے گوشوں میں شمس تبریز کو تلاش کرتے پھرے لیکن اُن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ مولانا کے مرید مولانا کی اس کیفیت سے چونکہ پریشان تھے لہٰذا مولانا کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے انہی کے کسی مرید نے شمس کو مار ڈالا۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شمس تبریز کو اُن کے پیر بابا کمال الدین جندی نے یہ کہہ کر مولانا کے پاس بھیجا تھا کہ روم جاؤ۔ وہاں ایک سوختہ جاں ہے اُس میں حرارت بھر دو۔ شمس تبریز قونیہ پہنچ گئے۔ شکر فروشوں کی سرائے میں مقیم ہوئے اور ایک روز مولانا نہایت تزک و احتشام سے راستے سے گزر رہے تھے تو شمس تبریز نے مولانا سے سرِ راہ دریافت کیا کہ مجاہدہ اور ریاضت کا کیا مقصد ہے؟ مولانا نے فرمایا اتباع شریعت۔ شمس تبریز نے کہا یہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن اصل مقصد علم اور مجاہدہ کا یہ ہے کہ وہ انسان کو منزل تک پہنچا دے اور پھر حکیم سنائیؔ کا یہ شعر پڑھا:

علم کز تو تُرا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار

ان جملوں سے مولانا اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مولانا کسی حوض کے کنارے کتب بینی میں مصروف تھے وہاں شمس تبریز آ گئے اور مولانا سے دریافت کیا کہ یہ کیا کتابیں ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہیں ان کتابوں سے کیا غرض۔ اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ میاں درویش تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جن میں نادر نکتے تھے اور اب ان کا ملنا محال ہے۔ اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں خشک حالت میں حوض سے نکال کر مولانا

کے سامنے رکھ دیں۔ مولانا حیران ہوئے تو شمس تبریز نے کہا یہ حال کی باتیں ہیں تم صاحبِ قال ان کو کیا جانو۔ اس کے بعد مولانا، شمس تبریز کے ارادت مندوں میں داخل ہو گئے۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک حلوہ فروش مولانا کی درس گاہ میں آیا۔ مولانا نے بھی اُس کے حلوہ کی ایک قاش خرید کر کھائی جس سے مولانا کے احوال یکسر بدل گئے۔ بے اختیار اُٹھے اور گھر بار چھوڑ کر نکل گئے۔ ایک عرصہ تک گم رہے۔ واپس آئے بالکل خاموش تھے۔ جذبہ میں کسی وقت بولتے تو زبان پر اشعار جاری ہوتے۔ یہی وہ اشعار ہیں جو بصورتِ مثنوی آج ہمارے سامنے موجود ہیں (2)۔

شمس تبریز سے ملاقات کے بعد دس سال تک مولانا نے فارسی میں جو غزلیات تخلیق کیں اُنہیں بعد میں دیوان کبریا یا دیوانِ شمس تبریز کے نام سے منظرِ عام پر لایا گیا۔

ایوانِ کبریا چالیس ہزار ابیات پر مشتمل ہے اور اسے تصوف الٰہی کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

شمس تبریز کے ساتھ مولانا رومؒ کے روحانی اور فکری رشتے نے اُن کے تصورات کی قندیلیں روشن کیں اور اس صحبت کی بدولت وہ ''پیر رومؒ'' اور ''حضرت مولانا'' کہلائے۔ اس بارے میں مولانا اور درویشِ تبریزی کی قرابت داری کے بارے میں شمس تبریز کو اس شعر میں تحسین و توصیف کا خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نشد

مولانا پر شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے قبل ظاہری علوم کا رنگ

غالب تھا اور وہ اپنا اکثر وقت درس و تدریس، وعظ خوانی اور پند و فتویٰ جاری کرنے میں ہی گزارتے تھے۔ اس کے بعد جب شمس تبریز سے اُن کا روحانی رشتہ مضبوط ہوا تو انہوں نے دنیاوی مشاغل کو خیر باد کہا اور وہ ہر معنی میں ایک لا اُبال اور خود فراموش صوفی کی زندگی گزارنے کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے محویت اور استغراق کے عالم میں اپنی ضروریاتِ زندگی کو بھی بہت حد تک خیر باد کہا۔ وہ کبھی کبھی غذا کھاتے تھے اور بسا اوقات منہ میں ایک سیاہ ہلیلہ رکھ کر جگر اور معدہ کو ٹھنڈا رکھتے تھے۔ انہوں نے تن کے کپڑے بھی ضرورت مندوں کو دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح سے اُن کا ذریعۂ معاش صرف وہ پندرہ دینار رہ گئے جو انہیں اوقاف کی طرف سے ہر ماہ فتویٰ نویسی کے عوض دئے جاتے تھے۔

شمس تبریز محمد بن علی بن ملک داؤد تبریز میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ شیخ ابوبکر زنبیل باف اور شیخ زین الدین سنجاسی سے اور بابا کمال الدین جنیدی سے علوم باطن سیکھے۔ پھر سیر و سیاحت کرتے ہوئے قونیہ پہنچ گئے۔

شمس تبریز 1246ھ میں قتل ہوئے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا رومؔی نے سلسلۂ مولویہ قائم کیا جس کے پیروکار آج بھی ترکی میں موجود ہیں۔

شمس تبریز کو اپنا مخدوم و مرشد بنانے کے بعد مولانا رومؔی نے اسرارِ حق کی گرہیں کھول دیں اُن کا بیان اس شعر میں بھی واضح ہے:

بے دولت مخدومی شمس الحق تبریز
نے ماہ تواں دیدن و نے بحر تواں شد

مولانا رومؔی کا عالمِ تصوف ایک ایسا عالمِ اسرار ہے جس میں دین، خدا پرستی، خدافہمی اور خداشناسی، پاکیزگیٔ نفس، دنیاوی خواہشات سے دست کش

ہونا اور اپنے سے کم تر ذی روح کی بھرپور ہمت افزائی اور دستگیری بنیادی فلسفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال چونکہ مولانا رومی کو پیر رومی تسلیم کر کے اُن کی محفل میں اپنے آپ کو مرید ہندی کہتے تھے لہٰذا اس تناظر میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے جس بہتر پیرائے میں تصوف کی نزاکتوں اور لطافتوں کی تشریح کی ہے یہاں پر اُسے دوہرانا اس موضوع کے ساتھ عینِ مطابقت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اس کا آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا کہ صوفی لفظ کہاں سے آیا۔ کسی نے اس کو صفا سے مشتق سمجھا اور کسی نے اصحابِ صفہ سے اس کا جوڑ ملایا۔ کسی نے کہا یہ یونانی لفظ صوفی سے ماخوذ ہے جس کے معنی عرفان کے ہیں۔ لیکن اب مسلم اور غیر مسلم محققین زیادہ تر اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے۔ درویش، خدا سے لو لگانے والا اور تنعم دنیوی سے گریز کرنے والا زاہد، رسول کریمؐ کی طرح کملی والا ہوتا تھا۔ یہ کملی عام طور پر صوف ہی کی ہوتی تھی جو ایک کھردری قسم کی اون کی بافت تھی۔ مسلمانوں میں صوفیہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں کہ وہ طرزِ فکر و تاثر اور طرزِ زندگی جسے تصوف کہتے ہیں اسلام میں کہیں خارج سے داخل ہوئی۔ بعض صوفیوں نے اپنے سلسلے کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملایا ہے اور بعض نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ چیز رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کا عکس اور اخلاقِ نبوی کو قلب میں سمونے کا نام ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ رسول کریمؐ کی غارِ حرا کی خلوت، تصوف یا ولایت ہی کا دور تھا جو نبوت کا پیش خیمہ بن گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو تصوف یا انگریزی زبان میں Mysticism کہتے ہیں وہ دین کے ارتقاء اور اس کی گہرائی میں ہر جگہ پیدا ہوئی ہے۔ ایک خاص انداز کے تصوف میں ہندو قوم سے زیادہ کسی نے غوطہ زنی نہیں کی اور ہندو دھرم ویدانت اور بدھ مت پر پہنچ کر اور ویدوں سے

اوپنیشدوں کی طرف عروج کر کے فکر و عمل میں تصف ہی تصوف بن گیا۔ عملی زندگی اور خیر و شر کی پیکار کو باطل ہونے سے بچانے کے لئے بعض اہم کوششیں ہوئیں جن میں کرشن مہاراج کی طرف منسوب بھگوت گیتا تصوف کے حقائق کو عمل سے ہم آغوش کرنے کی ایک لاجواب کوشش ہے۔ اس کتاب میں وحدتِ وجود اور توحید کو جہادِ عملی اور جہادِ نفسی کے ساتھ اس طرح مربوط کیا گیا ہے کہ حیات گریز تصوف کی بہت سی خامیاں اس میں رفع ہوگئی ہیں۔ اس بنا پر علامہ اقبال اس کتاب کے بے حد مداح تھے اور فرماتے تھے کہ ہندو قوم اس کتاب کی وجہ سے قابلِ مبارک ہے (3)

مولانا رومی کا ذکرِ خیر کرتے وقت یہ حیران کن حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اُن کے عہد میں اُن کے ہم عصروں میں بھی ایسی ایسی تاریخ ساز شخصیات شامل تھیں جنھوں نے عرب و عجم کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیا کے تقریباً ہر ملک میں دینِ الٰہی کے زرّیں باب تحریر کئے ہیں۔ کیا یہ مولانا رومی کو فیضانِ الٰہی حاصل تھا کہ جب اُن کے دور کے ساتھ ساتھ ایک سو سال پیچھے یا آگے کی طرف نظریں اُٹھتی ہیں تو اولیائے کرام اور اللہ کے نیک تر بندوں کی ایک لمبی فہرست اذہان میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس طرح بارہویں، تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کو دنیائے مشرق میں تصوف کی اعلیٰ ترین قدروں کی تبلیغ و تلقین اور اُن کی آبیاری کا عہدِ زرّین کہا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک خوش آیند حقیقت ہے کہ انھی ایام میں سرزمینِ کشمیر میں بھی کشمیری زبان میں تصوف کے دو علمبرداروں لل عارفہ اور شیخ نورالدین نورانی نے مقامی زبان میں ادبیات کا آغاز کر کے مادرِ وطن کو اپنے زندہ و جاوید فلسفے کی دولت سے اپنی شاعری کا بیش بہا تحفہ عطا کیا۔

مولانا رومی کے ہم عصروں کے اسمائے گرامی کی فہرست اگرچہ طویل بھی

ہوسکتی ہے لیکن ان میں سے جو روحانیت اور کمالِ الٰہیت کی معراج سے بہرہ ور ہوئے اُن میں خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز (1230-1141)۔ شیخ فریدالدین عطار (1220-1119) ابن عربی (1245-1165) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (1237-1173) بابا فرید الدین گنج شکر (1265-1179)۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء(1325-1238) امیر خسرو دہلوی (1325-1235) بہاء الدین ذکریا (1267-1170) اور لال شہباز قلندر سیہوانی (1274-1177) وغیرہ شامل ہیں۔

برصغیر ہند میں علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری اور فلسفہ پر سب سے زیادہ مولانا رومیؔ کا اثر قبول کیا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے فارسی اور اردو کلام میں تکرار کے ساتھ کیا ہے۔

فی الحقیقت رومیؔ اقبالؔ کے لئے اُسی مرتبہ کا مالک تھا جو ورجلؔ ڈانٹےؔ کی ادبی دنیا میں حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اقبالؔ نے ایک بار رومیؔ کو خواب میں دیکھا اور حضرت مولانا نے اُن سے کہا ''گاؤ!'' عبدالواحد کے الفاظ میں ''اقبال غالباً وہ پہلا عظیم شاعر ہے جنہوں نے رومیؔ کا ایک صحیح انداز میں مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔''

جاوید نامہ میں اقبالؔ رومیؔ ہی کی ہمراہی اور رہبری میں مختلف سیاروں کی سیر کرتے ہیں جہاں وہ دنیا کی سربرآوردہ ہستیوں کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں جن میں منصور الحلاجؔ، ناصر خسرو، طاہرہ سید، میر سید علی ہمدانی، غنی کشمیری، بھرتری ہری، مرزا غالب، جلال الدین افغان اور سعد حلیم پاشا شامل ہیں۔ اقبالؔ ان سبھی سے حق وصداقت کا درس بھی لیتے ہیں۔ اس سفر کے دوران اقبالؔ حضرت محمدؐ، حضرت عیسیٰؑ، گوتم بدھ اور زرتشت کے فرمودات کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔

جاوید نامہ کے اسی تخیلاتی سفر کے دوران فلکِ زحل میں امیر کبیر میر سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری کی زیارت کے ذیلی عنوان میں رومیؔ، شاہِ ہمدان اور غنی کا اس حب اور عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

مجھ سے رومیؔ نے کہا بھولو اُسے جو کچھ ہوا

سامنے جو ہے اُسے دیکھو ذرا

دیکھ یہ رنگیں نوا شاعر غنی

جس کا ہے باطن غنی ظاہر غنی

نغمہ خواں ہے پیشِ سالارِ عجم

سید السادات وہ معمار تقدیرِ امم

جس کے کنبے ہی کے ذکر و فکر سے

درسِ اللہ ہو غزالیؔ نے لیا

ایک درویش اور سلاطین کا مشیر

مرشد اہلِ کشیر

خطۂ کشمیر کو تازہ ہنر، تہذیب و صنعت

اور علم اُس نے دیا

بن گیا کشمیر ایرانِ صغیر

جانتے ہو تم کہ اُس کی اک نگہ

کھولتی ہے سو گرہ

اُٹھو اُس کے تیر کو دو دل میں رہ (4)

مرید ہندی علامہ اقبالؔ نے اپنے پیر رومیؔ مولانا کی معتقدی میں بے شمار منظومات اس شیخِ عجم کو نذر کی ہیں جن میں چند ایک یہاں پر اسی مناسبت سے پیش کی جاتی ہیں:

نہ اُٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران وہ تبریز ہے ساقی



یا مردِ قلندر کے انداز ملوکانہ
یا حیرت فارابیؔ یا تاب و تبِ رومیؔ



ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُرآشوب و پُراسرار ہیں رومیؔ
تو بھی ہے اُسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی



مرشد غزلے بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے



بیا کہ من زخم پیر روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

عہدِ رومیؔ سے قبل یا اُس کے بعد جن بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی موجودگی کا ذکر ہوا ہے اُن کے سوانح یا اُن کے روحانی اور فنی کارنامے دوہرانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ بقامت بہتر اور بقیمت بہترین شخصیات ہیں جن سے کوئی بندۂ خدا غیر واقف نہیں ہوسکتا۔ اِن اولیائے کرام کی عقیدتمندی کا یہ عالم ہے کہ حضرت غوث الاعظم شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ اپنی

زندگی میں کبھی کشمیر تشریف نہیں لائے اور اُن کی آخری اور ابدی آرام گاہ بھی بغداد ہی میں ہے لیکن وادیٔ کشمیر میں سلسلہ قادریہ سے منسلک اُن کے پیروکاروں نے اُنہیں اپنے دلوں میں بار بار یاد کرنے کی نیک مساعی کے نتیجے میں جگہ جگہ اُن کے نام نامی سے مقدس درگاہیں اور آستانے منسوب کئے ہیں جن میں سے سری نگر شہر کے وسطی علاقہ خانیار میں حضرت کی شاندار زیارت گاہ مرجعِ خاص و عام ہے جہاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی تعظیماً تھوڑی دیر قیام کر کے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تاریخی درگاہ سارے کشمیر میں زیارت دستگیر صاحب کے نام سے مشہور و مقبول ہے۔

مولانا رومی اور اُن کے ہم عصروں کے مابین براہِ راست مناظرہ یا بالمشافہ تعلق تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہوسکا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے پاس جس واقعے کا تقریباً ہر تذکرہ میں ذکر موجود ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار کے کلام سے رومی کے علاوہ سلطنتِ فارس کے کئی اور شعراء بھی متاثر ہوئے ہیں۔ مولانا رومی عطار کو روح اور حکیم سنائی کو آنکھوں کی بینائی مانتے تھے۔ عطار کی ملاقات جب رومی سے ہوئی تو انہوں نے رومی کو گلے سے لگایا اور دعائیں دیں (5)۔ یہ ملاقات عطار کی زندگی کے آخری دنوں میں ہوئی جب مولانا نوجوان تھے۔ بزرگ عطار نے اس موقعہ پر نوجوان رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ تحفے میں عطا کی۔

اس کے علاوہ حضرت رومی اور مندرجہ صدر اکابرین دہر کے مابین براہِ راست کسی تعلق کا حوالہ موجود نہیں البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ اِنہوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہو۔ اسی اثر پذیری کے نتیجے میں مشرقی دنیا علم و فضل، فلسفہ و تصوف، ادب و تحقیق اور دینیات کی ایک عظیم وراثت سے مالا مال ہوئی ہے اور یہ دولت آج بھی مشرقی عوام کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

تاہم اس مقالے کے موضوع کی مناسبت سے اس میں کوئی ہرج نہیں کہ حضرت رومی کے چیدہ چیدہ ہم عصر اکابرین کے حالات مختصر طور پر زمرۂ تحریر میں لائے جائیں تاکہ اُن کے فدائی اور عالمِ اسلام کے اِن روشنی کے میناروں کے متلاشی پھر ایک بار اِن پاک اور مقدس سوانح پر ایک نظر ڈال کر تازہ سرور قلبی اور فکری تشفی کی نعمت سے سرشار ہوں۔

یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ ان محبانِ الٰہی کے بارے میں صرف چند ایسے واقعات و کوائف بیان کئے جائیں گے جو سبق آموز، دلچسپ اور بصیرت افروز ہوں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ: ''جب سر پر آفتاب ضوفشاں ہو تو روشنی کی تلاش کیوں کریں؟''۔ یہ قول زریں اُس محبوب خدا کا ہے جسے حضرت معین الدین چشتی سنجری، غریب نواز اور خواجہ اجمیری کہتے ہیں اور جو کائنات کے چاروں طرف اپنی عنایت اور کرم فرمائی کا سورج ہماری رہنمائی کے لئے بنا ہے اور ساری دنیا اس کے ابدی نور میں نہا گئی ہے۔

حضرت صوفیاء کے سلسلہ چشتی کے بانی تھے وہ اگرچہ سیستان (مشرقی فارس) میں 1141ء میں پیدا ہوئے لیکن کئی مقامات یعنی بخارا، سمرقند، بغداد، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے اور اپنے سے بلند و بالا مرتبہ والے اولیاء اللہ سے استفادہ کرنے کے بعد 1190ء میں ہند میں اجمیر پہنچے۔ اُس وقت اجمیر کا حکمران مشہور راجپوت بادشاہ پرتھوی راج چوہان تھا۔ اُس کے دربار میں کئی جادوگر تھے جن کا سرغنہ اجے پال تھا۔ خواجہ نے اسی شہر میں اناساگر جھیل کے پاس ڈیرا ڈال دیا۔ دریں اثناء جب اُن کے بارے میں یہ چرچا ہوا کہ ایک پاکباز درویش وارد شہر ہوا ہے تو لوگ جوق در جوق اُن کی صحبت میں آئے اور اسلام قبول کرتے گئے۔ ان معتقدین میں اجے پال بھی شامل تھا۔

حضرت خواجہ نے اس کے بعد راہِ صدق وصفا پر اپنا سفر جاری رکھا اور اپنے کئی مریدوں اور عقیدت مندوں کو ملک کے مختلف شہروں میں بھیجا تا کہ وہ دینِ اسلام کی تبلیغ وتشہیر کریں ان میں خواجہ قطب الدین بختیار کا کی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ کے انتقال کے بارے میں روایت ہے کہ جب اُن کا آخری وقت آ گیا تو وہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے حجرے میں گھس گئے اور مصاحبوں سے کہا کہ مجھے ساری رات تخلیہ چاہیئے۔ تاہم علی الصباح جب نمازِ فجر کے وقت احباب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو حجرے کا دروازہ اندر سے بند پایا جو ہزار کوشش کے باوجود کھل نہیں سکا۔ پھر اسے بمشکل توڑ کر اندر دیکھا کہ حضرت خواجہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور یہ جملہ ان کی پیشانی پر نور کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا: ھٰذا حبیب اللہ ومات فی حب اللہ۔ یہ مارچ 1230ء کی صبح تھی۔

حضرت کا آستانہ اجمیر میں واقع ہے جہاں یہ زیارت گاہ ہندو پاک کے علاوہ دنیا بھر سے زائرین اور محبان خواجہ کو کھینچ لاتی ہے۔ جن میں ہر مذہب اور اعتقاد کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ فریدالدین عطار: ان حضرت کے بارے میں بیان ہے کہ اُن کے کلام نے مولانا رومی کے علاوہ سلطنت فارس کے کئی شعرأ کو بھی متاثر کیا۔ مولانا رومی عطار کو روح اور حکیم سنائی کو آنکھوں کا نور کہتے تھے۔ عطار کی ملاقات رومی سے اُس وقت ہوئی جب وہ عمر کی آخری دہلیز پر تھے اور رومی ایک نوجوان لڑکا تھا۔ انہوں نے نوجوان رومی کو اپنی کتاب اسرار نامہ تحفے کے طور پر بخش دیں۔

حضرت عطار 1230ء تک بقیدِ حیات رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں

ایک منگول جنگجو نے قتل کیا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس کو منگول نے پکڑ لیا اور اُسے قتل کرنے کی ٹھان لی تو ایک شخص سامنے آیا اور اُس نے منگول سے کہا کہ میں تمہیں چاندی کے ایک ہزار سکے دوں گا تم اس کے عوض یہ قیدی مجھے دے دو۔ عطار نے اس شخص کی بات کاٹتے ہوئے منگول سے کہا کہ مجھے ان سکوں کے عوض بیچ نہ ڈالو کیونکہ یہ صحیح قیمت نہیں ہے۔ منگول نے عطار کی بات مان لی۔ اس کے بعد ایک اور شخص عطار کو خریدنے آیا اور اُس نے بدلے میں گھاس پھوس کی ایک بوری پیش کش کی۔ عطار نے فوراً منگول کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ پیش کش قبول کرے کیونکہ اُس کی اعلیٰ قیمت واقعی گھاس پھوس سے زیادہ نہیں ہے۔ منگول اس پیچیدہ گفتگو سے پریشان ہوا، اسے غصہ آ گیا اور اُس نے عطار کا سر قلم کر ڈالا۔

فریدالدین عطار نے اپنا تخلص اپنے ہی پیشے سے اخذ کر لیا ہے۔ وہ دوا ساز اور عطر فروش تھے۔ لہٰذا اسی مناسبت سے عطار کہلائے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر روز پانچ سو مریضوں کا علاج اپنی ہی بنائی ہوئی یونانی ادویہ سے کرتے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کا شغل بھی جاری تھا۔

خواجہ عطار کی تصانیف منطق الطیر، اسرار نامہ اور الٰہی نامہ رُشد وہدایت کی اعلیٰ تعلیمات اور فلسفے کا ایک خزانہ ہیں جن میں خاص طور پر انسان کے روحانی مرتبہ کو بلند کرنے کی ہدایات نمایاں ہیں۔

محمد علی ابنِ عربی: ابنِ عربی سپین (ہسپانیہ) میں 1165ء میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں یہ ملک ایک متموّل اور خوش حال علاقہ تھا جہاں یونانی ادب کے عظیم کلاسیک خاص طور پر افلاطون اور ارسطو کی تخلیقات کا پہلے عربی اور پھر لاطینی میں ترجمہ ہوا اور ابنِ عربی کے لئے ان کا مطالعہ بھی تین ابراہیمی مذاہب یعنی صیہونیت، عیسائیت اور اسلام کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔

ابن عربی نے جوانی ہی میں اپنے روزمرہ کو اس طرح بانٹ رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں نصف وقت وہ قرآنِ پاک کی تلاوت میں گزارتے اور شریعت اسلامی کا مطالعہ بھی کرتے اور باقی نصف وہ احباب کی محفلوں میں صرف کرتے۔ اسی دوران ایک رات کو انہوں نے یہ آواز سنی ''اے محمد! ہم نے تمہیں اسی لئے پیدا نہیں کیا''۔ تذکروں میں درج ہے کہ اس کے بعد وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک قبرستان میں پناہ لی۔ اسی چلہ کشی کے دوران اُنہیں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ سے ہدایت و بشارت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ابن عربی کو اس قسم کی بشارت وقتاً فوقتاً ملتی رہی۔

ابن عربی نے 35 سال کی عمر میں 1200ء میں اسپین سے کوچ کیا اور پھر کبھی اپنے وطن مالوف واپس نہیں آئے۔ اس دوران مختلف ممالک میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی منظومات تخلیق کیں جن کا موضوع تصوف کی راہ پر گامزن ہونے کے بعد وحدہٗ لاشریک کی متعین کردہ منزل کو پانے سے براہِ راست متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان منظومات میں کئی ایسی تخلیقات بھی موجود تھیں جن کے بارے میں نقادوں اور نکتہ چینوں نے ان پر فحش گوئی اور جذبات خیز منظر کشی کے الزامات عائد کئے۔ اس دباؤ کے تحت انہوں نے اپنے دفاع میں اپنی تخلیقات پر ایک تجزیہ بھی قلمبند کیا۔ ایک مثال یوں ہے:

جب میرا محبوب ظاہر ہو جاتا ہے
میں کس آنکھ سے اُسے دیکھوں؟
اُس کی اپنی آنکھ سے
میری آنکھ سے نہیں
کیونکہ اُسے کوئی اُس کی آنکھ کے سوا دیکھ نہیں سکتا

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی: اِن کا اصلی نام بختیار تھا اور قطب الدین

اُن کے لئے خطاب قرار پایا۔ حضرت بختیار کاکی کا سالِ ولادت 1173ء ہے۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی وفات سے چندروز قبل اصفہان چلے گئے جہاں انہوں نے حضرت چشتی کے ہاتھ پر بیعت کرلی اوراس طرح سے خواجہ اجمیر کے پہلے جانشین ہوئے۔اس کے بعد رشدِ روحانی نے قطب الدین کو خلافت اور خرقہ عطا کر کے انہیں ہدایت دی کہ وہ ہندوستان جا کر وہیں قیام کریں۔ خواجہ قطب الدین کی روانگی سے قبل خواجہ اجمیر نے اُن سے کہا۔

"تصوف کی نیک راہ کو کبھی نہیں چھوڑنا اوراپنے آپ کواس مقدس کام کے لئے ایک بہادر ثابت کرنا۔" خواجہ قطب الدین جب دہلی پہنچے تو سلطنت دہلی پر سلطان شمس الدین التمش کی حکمرانی تھی۔

حضرت بختیار کاکی کے بارے میں روایت ہے وہ ہر روز پچانوے رکعت نماز ادا کرتے اور تین ہزار درود شریف پڑھنا اُن کا روز کا معمول بن چکا تھا۔

اُن کے معمول میں یہ بھی شامل تھا کہ جوکوئی چیز اُن کی خانقاہ میں آجاتی اُسے وہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کرواتے۔ اگر کوئی چیز موجود نہیں ہوتی تو وہ اپنے طلباء اور مریدوں سے کہتے کہ یہاں آنے والوں کو پانی پلانا تاکہ ہماری مہمان نوازی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔

خواجہ بختیار کاکی کا انتقال بھی ایک غیر معمولی طریقے پر ہوا۔ ایک بار وہ ایک محفلِ سماع میں تھے کہ انہوں نے حضرت جامؒی کا ایک شعر سنا جس کے معنی یوں ہیں: جولوگ تسلیم ورضا اور خود سپردگی کی شادمانی کی تلوار سے قتل ہوجاتے ہیں انہیں نادیدہ قوت کی طرف سے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ یہ شعر سنتے ہی انہوں نے اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کردی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مزار دہلی میں قطب مینار کے پاس

واقع ہے۔ اُنہیں اپنے وقت میں ہی قطب الاقطاب، ملک المشائخ، رئیس السالکین اور سراج الاولیاء جیسے خطابات دیئے گئے۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر: حضرت گنج شکر کھوٹوال کے ایک دیہات میں 1179ء کو پیدا ہوئے جو پاکستان میں لاہور شہر کے متصل واقع ہے۔ ایک واقعہ کی رو سے اُن کی پیدائش سے پہلے ہی اُن کے ولی ہونے کی شہادت ملی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ رحم مادر میں تھے تو ایک روز اُن کی والدہ نے ایک پڑوسی کی اجازت کے بغیر اُس کے باغ سے آلو بخارا توڑ کر کھانے کی کوشش کی۔ یہ حرکت انجام دیئے جانے سے پہلے ہی اُس کے پیٹ میں زبردست درد ہوا جس کی وجہ سے اُس نے یہ میوہ کھانے کا خیال ترک کیا۔ حضرت گنج شکر سے محوِ کلام ہوتے ہوئے ایک روز اُن کی والدہ نے اُن سے کہا۔ ''جب تم پیدا ہونے والے تھے تو اُس دوران میں نے کوئی ممنوعہ چیز نہیں کھائی''۔ حضرت مسکرائے اور کہا کہ جب آپ نے پڑوسی کے باغ سے بغیر اُس کی اجازت کے آلو بخارا کھانے کی کوشش کی تو میں نے ہی آپ کے پیٹ میں درد کی لہریں دوڑا دیں تا کہ آپ یہ غلط حرکت نہ کریں۔

حضرت بابا فریدالدین نے ملتان میں مولانا منہاج الدین کی شاگردی میں حدیث، فقہ، فلسفہ اور منطق کے علوم میں مہارت حاصل کر لی۔

حضرت بابا فریدالدین اُن معدودے چند صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے چلۂ معکوس کے مشکل ترین کام کا انجام دیا۔ یہ چلہ اس طرح سے کھینچا جاتا ہے کہ صوفی یا ولی کو اُلٹا لٹکا کر ایک کنویں کے اندر ڈال دیا جاتا ہے اور ایک رسی سے اُس کی ٹانگیں باندھ کر اس رسی کو کنویں کے اوپر ایک درخت کے سب سے اونچی شاخ کے ساتھ برابر چالیس دن تک لٹکایا جاتا ہے۔

حضرت سے یہ واقعہ بھی منسوب ہے کہ ایک بار انہوں نے ایک تاجر کو

اونٹوں کے کاروان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے دیکھا جن پر بوریوں پر کچھ لدا ہوا تھا۔ دراصل ان بوریوں میں کھانڈ بھرا ہوا تھا۔ حضرت نے جب اس تاجر سے اس سامان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا کہ ان بوریوں میں نمک بھرا ہوا ہے۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہاں یہ واقعی نمک ہے۔ تاجر جب اپنی منزل کو پہنچا تو اُس نے بوریاں کھول کر حیرت سے دیکھا کہ ان میں نمک بھرا ہوا ہے۔ وہ شرمسار ہو کر حضرت کے پاس گیا اور اُن سے معافی مانگ لی۔ نمک پھر چینی میں تبدیل ہوا۔ اسی مناسبت سے حضرت کو گنج شکر کہتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاء: آپ 1238ء میں بدایوں، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں جہاں آپ کا روضہ پاک واقع ہے، حضرت کو سب سے زیادہ واجب الاحترام و باعزت ولی اور صوفی قرار دیا جاتا ہے۔

وہ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد دہلی چلے گئے۔ اُن کے سوانح ابوالفضل ابن مبارک کی مشہور تصنیف آئینِ اکبری میں بھی درج ہیں۔

وہ حضرت فریدالدین گنج شکر کے مریدوں میں سے تھے جنہیں عام طور پر بابا فرید کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُن کے مریدوں کی تعداد چھ سو بتائی جاتی ہے جن میں نصیرالدین چراغ دہلوی، امیر خسرو، برہان الدین غریب وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت نظام الدین چشتی نظامی سلسلۂ صوفیاء کے بانی تھے۔ انہیں جو خطابات وقتاً فوقتاً دیئے گئے اُن میں محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، دستگیرِ دو جہاں اور قطبِ دہلی شامل ہیں۔

دہلی میں آپ کی درگاہ پر حاضری دینے والوں میں لاکھوں عقیدت مند شامل ہیں جو ہر سال اس روضۂ مقدس پر آتے ہیں اور جن کا تعلق تمام مذاہب کے ساتھ ہے۔

حضرت امیر خسرؔو دہلوی: ابوالحسن یمین الدین خسرو، برصغیر ہندوپاک کی ثقافتی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے روحانی مرید تھے اور اُن کا قرب اُن کے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ عمل تھا۔ ایک برگزیدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر موسیقار بھی تھے۔ اُن کا اکثر کلام اگرچہ فارسی میں ہے لیکن انہوں نے ہندوی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ اُنہیں طوطیٔ ہند کے علاوہ بابائے قوالی بھی کہا جاتا ہے۔ قوالی کو ہندوستان میں عقیدتی موسیقی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ وہ خیال اور ترانہ طرز کی موسیقی کے موجد تھے۔ انہوں نے غزل، مثنوی، قطعات، رباعی، دوبیتی اور ترکیب بند جیسی اصنافِ سخن میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔

امیر خسرؔو شمالی ہندوستان میں پٹیالہ، اُترپردیش میں پیدا ہوئے۔ خسرؔو نے اپنی زندگی میں دہلی سلطنت کے سات حکومتوں کے ادوار دیکھے۔ یہاں پر اُن کی ایک مشہور فارسی غزل کو اس لئے نقل کیا جاتا ہے کہ اس کے مطلع کو کشمیری کے مشہور شاعر پیر عزیز اللہ حقانی نے اپنی مشہورترین نعتیہ غزل کے مطلع میں ہو بہو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔

امیر خسرؔو کی غزل کے چند اشعار یوں ہیں:

گفتم کہ روشن از کمر گفتا کہ رخسارِ من است
گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتارِ من است

گفتم طریقِ عاشقان گفتا وفاداری بود
گفتم مکن جور و جفا گفتا کہ ایں کارِ من است

گفتم کہ مرگ عاشقاں گفتا کہ دردِ ہجرِ من
گفتم علاجِ زندگی گفتا کہ دیدارِ من است

گفتم کہ حوری یا پری گفتا کہ من شاہِ جہاں
گفتم کہ خسرو ناتواں گفتا پرستارِ من است

اوراب اس غزل کے مطلع کے ساتھ حقانی کی نعت کے اس شعر کا تقابلی مطالعہ کریں:

گو وجہان تازہ بہ رخسارِ رسول عربی
روٹ گلو مشک ز گفتارِ رسولِ عربی

حضرت ذکریا 1170ء میں اسی شہر میں عالمِ ہست و بود میں آئے۔ اسی شہر میں اُن کا روضۂ شریف بھی ہے۔ حضرت ذکریا سلسلۂ سہروردیہ کے علمبردار تھے اور ان کے عقیدت مندوں اور پیروکاروں میں کئی امراء شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ملتان میں ان کی خانقاہ کی زیارت چند منتخب لوگ ہی کر سکتے تھے۔ ان کے ساتھ یہ بات بھی منسوب ہے کہ وہ عام لوگوں سے سروکار رکھنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

1848ء میں جب انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو یہ خانقاہ بہت حد تک برباد کی گئی لیکن بعد میں مخدوم شاہ محمود نے اسے اپنی حالت میں لانے کی غرض سے اس کی ازسرِ نو تعمیر کر لی۔

حضرت کا پورا نام شیخ الکبیر شیخ العالم بہاء الدین ابو محمد ذکریا القریشی الاسدی الہاشمی تھا۔ حضرت ذکریا کی حیات طیبہ کے بارے میں بہت کم معلومات تذکروں میں درج کی گئی ہیں۔

حضرت لال شہباز قلندر: آپ سیہوان شریف سندھ میں پیدا ہوئے۔ انہیں ہندوپاک میں ایک عظیم صوفی کامل، فلسفہ دان، شاعر اور قلندر کی حیثیت میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

آپ کا تعلق سہروردیہ سلسلۂ صوفیا کے ساتھ تھا اور وہ مولانا رومی کے

علاوہ بہاء الدین ذکریا، فرید الدین گنج شکر، شمس تبریزی اور سید جلال الدین بخاری سرخ پوش کے ہم عصر تھے۔

آپ نے سارے عالمِ اسلام کا دورہ کیا اور بعد میں ہندوستان آ کر یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مذہبی قوتِ برداشت اور ہر معاملے میں صبر و تحمل کا درس دیتے رہے۔

شیخ عثمان مارنڈوی شہباز قلندر کے آباء عراق سے ہجرت کر کے مشہد ایران میں قیام پذیر ہوئے تھے جو اُن دنوں تہذیب و تدریس کا ایک اہم مرکز تھا۔ حضرت قلندر نے کئی زبانوں میں مہارت تامہ حاصل کر لی جن میں فارسی، ترکی، عربی، سندھی اور سنسکرت بھی شامل ہے۔

وہ اکثر و بیشتر سرخ لباس زیب تن کیا کرتے تھے جس کہ وجہ سے وہ لال کہلائے۔ وہ ساری عمر کنوارے ہی رہے۔

لال شہباز قلندر بار بار مولانا رومیؒ کی تصانیف پڑھ کر اُن کا حوالہ دیتے تھے۔ اُن کے یہ دو شعر مشہور ہیں:

حیدر یم قلندرم مستم　　بندۂ مرتضےٰ علی ہستم
پیشوائے تمام رندانم　　کہ سگِ کوئے شیرِ یزدانم

حضرت قلندر کے پیروکاروں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم بلاول، سچل سرمست اور قادر بخش بیدل مشہور شخصیتیں ہیں۔

اُن کے ساتھ کئی کرامات وابستہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ جس پہاڑی پر وہ برسہا برس تک کراچی میں عبادتِ الٰہی میں محو رہے اُس جگہ بعد میں گرم پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا جس سے کئی انسانی بیماریاں آج بھی زائل ہو جاتی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے ہم عصر مشاہیر میں اور بھی کئی تاریخ ساز

ہستیاں شامل ہوں گی لیکن اس مقالے میں ہم نے صرف چند منتخب صوفیاء اور اولیاء ہی کو زیرِ تذکرہ لایا ہے اور خاص طور پر اُن کے سوانح کے بجائے اُن کے روحانی کمالات اور معجزات ہی کو نمایاں طور پر قلمبند کیا ہے۔



حوالہ جات:

(1) قاموس المشاہیر۔ مرتبہ نظامی بدایونی۔ جلد اوّل ، خدا بخش اورینٹل لائبریری۔ پٹنہ 2004ء ص23

(2) مثنوی مولانائے روم۔ دفتر اوّل ۔ ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین۔ سب رنگ کتاب گھر دہلی۔ 1976ء ص3 تا 5

(3) فکرِ اقبال۔ بزمِ اقبال لاہور۔ 1992ء ص309-308

(4) جاوید نامہ۔ منظوم اردو ترجمہ۔ پروفیسر سید معراج الدین اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر۔ 2007ء ص 218-219

نابغۂ عہد

حضرت شیخ صرفی کشمیری

حضرت شیخ یعقوب گنائی صرفی کی پیدائش کے وقت سرزمین کشمیر میں شاہ میری خاندان کے بارھویں بادشاہ محمد شاہ کی حکومت تھی جو 1517ھ میں چوتھی بار تخت نشین ہوا تھا۔ محمد خان پہلی مرتبہ 1484ء میں محمد شاہ کے لقب سے کشمیر کا حاکم بنا تھا۔ صرفی کا زمانہ وہ زمانہ تھا کہ انہوں نے اپنی عمر کے چھیاسٹھویں سال یعنی 994ھ تک شاہ میریوں کے چھ حکمرانوں محمد شاہ، ابراہیم شاہ، نازک شاہ، شمس الدین دوم، اسماعیل شاہ اور حبیب شاہ اور چک خاندان کے دور حکومت کے سبھی بادشاہوں غازی شاہ۔ حسین شاہ۔ علی شاہ۔ یوسف شاہ۔ لوہر شاہ اور یعقوب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ 994ھ میں مغلیہ حکام نے کشمیر کو اپنی سلطنت کے ساتھ ملا دیا اور ریاست میں مکمل طور پر مغل حکومت قائم ہوگئی۔

اس بیش از نصف صدی کے عرصے میں کشمیر کے نظام میں اتنی کمزوریاں اور اس نوع کی خامیاں پیدا ہو چکی تھیں کہ کوئی بھی فرمان روا مشکل سے چند سال تک تخت پر قائم رہ سکتا۔ کئی بادشاہ اپنی بادشاہی کو صرف چند مہینوں تک سنبھال سکے اور چکوں کے ایک حاکم حسین شاہ کو تو محض چار دن حکومت کرنا نصیب ہوئی۔ اس افراتفری کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ ملک حکام کے ہاتھوں

میں باہمی رسہ کشی کا میدان بنا ہوا تھا اور وہ ہر لحظہ ایک دوسرے کو مار گرانے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اسی خانہ جنگی کے نتیجہ کے طور پر ملک کی اقتصادیات۔ معاشیات اور اس کے تحفظ اور عوامی خوشحالی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوتی تھی جس کی وجہ سے لوگ بھی اپنے حاکموں سے بدظن ہوتے گئے۔ عوام کی رگ رگ میں ایک ایسی غیر یقینیت اور نفرت کے جراثیم سرایت کرتے گئے کہ انہوں نے ہر ایک صاحب اقتدار کو شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ ان دنوں بالخصوص شاہ میری خاندان کے محمد شاہ اور فتح شاہ تخت کی خاطر آپس میں دست و گریبان رہتے۔ کبھی ایک غالب آجاتا اور کبھی دوسرا۔ اسی باہمی کشمکش میں محمد شاہ پانچ بار اور فتح شاہ تین مرتبہ بادشاہ بنا۔

حضرت شیخ محمد یعقوب گنائی المتخلص بہ صرفیؔ 928ھ 1521ء سری نگر کے ایک آسودہ حال اور باوقار گھرانے میں پیدا ہوئے ''شیخ حی'' سے بھی ان کی ولادت کا سال نکلتا ہے اور:

سنہ نہ صدو بیست و ہشت بود

کہ ایں شیخ دیں آمدہ در وجود (1)

صرفی کے اسلاف اعیان کشمیر میں سے تھے۔ ان کے جد امجد سلطان زین العابدین کے دربار میں ایک عزت دار عہدے پر فائز تھے۔ صرفی کے والد کا نام شیخ میر حسن اور گنائی لقب تھا۔ وہ بھی شاہ میری دور میں درباری اور رئیس تھے۔ صرفی قبیلہ عاصمی سے تھے اور لقب کے لحاظ سے آپ گنائی کہلاتے تھے۔ عاصمی قبیلہ اور صرفی کے عاصمی ہونے کے بارے میں ''فتوحاتِ قادریہ'' کے مصنف نے حضرت شیخ محمد اکبر تارہ بلیؒ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ''نسبِ مبارک ایشاں بہ حضرت میر محمد برادرِ شیخ یعقوب صرفی مے رسد و نسب نامۂ شیخ یعقوب

صرفی با حضرت فاروق اعظم عمر ابن الخطابؓ اتصال مے پذیرد'' اس طرح سے حضرت صرفی کا شجرۂ نسب حضرت عاصم ابن حضرت فاروقؓ سے جاملتا ہے۔

لفظ ''گنائی'' کی یہ تشریح کی گئی ہے کہ یہ سنسکرت کے دو الفاظ ''گن'' اور ''آئے'' سے مرکب ہے جن کے معنی ہیں ہنر والا یا منشی۔ یعنی یہ لفظ عام طور پر سکتر اور محرر کا مطلب ادا کرتا ہے۔ ''تاریخ کشمیر اعظمی'' میں درج ہے کہ ''گنائی در عرفِ آں وقتے نویسندہ را مے گفتند۔ از مفتی تا پٹواری ہمیں لقب گرفتہ بودند'' اور حاجی محی الدین مسکین نے بھی تقریباً یہی عبارت نقل کی ہے ''گنائی در عرف ایں دیار نویسندہ را مے گفتند و از منشی تا پٹواری ہمہ ہا بایں لقب مشہور بودند''۔ (2)

صرفی کے قبلہ گاہ میر حسن کے سات فرزند میر کمال، میر یعقوب، میر احمد شریف، میر نوروز، میر محمد، میر ابراہیم اور میر حیدر تھے۔ ان میں سے پانچ صرفی سے عمر میں چھوٹے تھے اور اول الذکر کی عمر اُن سے زیادہ تھی۔

صرفی نے گھر میں چھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ مولوی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے کہ ''در عمر دہ سالگی حفظ قران نمود'' (3) جب انہوں نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تو فارسی زبان میں شاعری شروع کی اور پہلے پہل والد ہی سے اشعار پر اصلاح لیتے رہے:

چو در سالِ ہشتم نہادم قدم
زطبع رواں گشت شعر عجم
پدر کردے اصلاحِ اشعار من
باصلاح بودے مدد گارِ من

''شہنامہ کشمیر'' کے مصنف عبدالوہاب شایق کا کہنا ہے کہ صرفی نے اول اول قصائد اور نعتیں لکھیں:

چوشد ہشت سالہ قصائد بگفت
بہ نعت پیمبرؐ گہرہا بسفت

خواجہ حبیب اللہ نوشہری نے ''مقاماتِ حضرتِ ایشاں'' میں بیان کیا ہے کہ صرفی نے انہی دنوں یہ غزل لکھی جوان کی سب سے پہلی غزل مانی جاتی ہے:

اے رُخِ مہ طلعتان آئینۂ روئے تو ام
میل خوباں در ہوائے روئے نیکوئے تو ام
گر ببویم عنبر سارا وگر مشکِ ختن
در دماغ جان مے آید مگر بوئے توام

آرزوئے تست درجاں و تمنایت بدل
اے کہ از ہر سو است روئے جاں ودل سوئے توام
از کشاکش ہائے حج و عمرہ فارغ گشتہ ام

من کہ در حرم طوافِ کعبۂ کوئے توام
گرچہ مے سازد پری دیوانہ مردم راولے
گویدت دیوانۂ زنجیر گیسوئے توام
من کہ جز محراب نبود سجدہ گاہِ دیگرم
نیست متصودے ازاں جز طاق ابروئے توام

ان دنوں مولانا جامی کے شاگرد ملا محمد آنی کشمیر میں سرکاری مدرستہ العلوم کے سربراہ تھے۔ مولانا آنی نے امیر حسین نیشاپوری سے علم معما میں بھی کمال حاصل کیا تھا اور جامی سے انہوں نے ابتدائے جوانی ہی میں افغانستان میں ہرات کی جگہ تعلیم حاصل کی تھی۔ صرفی کو والد نے ان کے سپرد کر دیا اور انہوں نے ملا آنی کے سامنے زنوائے تلمذ تہہ کیا۔

شیخ صرفی نے علم صرف ونحو میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی مناسبت سے حضرت آنی نے انہیں صرفی تخلص کرنے کی ہدایت کی (4) جب تحصیل علوم میں صرفی نے مولانا آنی کے سامنے اپنے جوہر کمال اور قابلِ داد صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تو آنی نے ان کو ''جامئی ثانی'' کا لقب عطا کیا۔ حضرت آنی نے کشمیر ہی میں وفات پائی اور مزارِ حضرت بہاوالدین گنج بخشؒ میں مدفون ہوئے (5)

اس کے بعد صرفی نے مولانا میر رضی الدین سے صرف ونحو میں مہارتِ تامہ حاصل کی اور درس فقہ میں بھی ان سے استفادہ کیا۔ پھر ملّا حافظ بصیر خندہ بھونی کے شاگرد ہوئے۔ صرفی نے اس عالم سے علم صوفیہ، منطق، بیان، معانی وغیرہ سیکھے۔ ملا بصیر ان دنوں سری نگر میں نواکدل کے نزدیک محلّہ خندہ بھون کی مسجد میں ایک درسگاہ چلاتے تھے۔ ظاہری طور پر اگرچہ وہ بینائی سے محروم تھے لیکن ان کی نگاہ باطنی علم وفضل کی باریکیوں میں اتری ہوئی تھی اور ان کا شمار زمانے کے علماوعرفا میں ہوتا تھا۔

ملا بصیر نے جب 946ھ یعنی 1539ء میں وفات پائی (6) تو شاگرد رشید نے ایک پُر اثر مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر یوں ہے:

آں حافظِ علم و ادب بودہ بصیر از فضل رب
تاریخ فوتش زاں سبب شد ''عالم تفسیر دان''

انیس سال کی عمر تک ان تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد صرفی زیادہ تر مطالعہ ہی میں مشغول ہوگئے۔ لیکن اسی زمانے میں بدقسمتی سے ان کا اٹھنا بیٹھنا چند اوباش قسم کے نوجوانوں سے ہوا جن کی صحبت میں صرفی سے کوئی غیر مشروع فعل سرزد ہوا (7) اس واقعہ کی تفصیل اکثر تذکروں میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایک روز صرفی والدین کی اجازت کے بغیر ان دوستوں کے

ساتھ کسی دیہات کی سیر کو گئے جہاں وہ اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے۔ شام کو جب گھر آئے تو نادم ہو کر توبہ کرلی۔ قبلہ گاہ نے جب یہ سنا تو انہوں نے ایسے افعال سے باز رکھنے کے لئے صرفیؔ کو دور ایک جگہ اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے بھیجا۔ ان کے اس قماش کے دوستوں کو جب معلوم ہوا تو وہ بھی اسی جگہ جا پہنچے جہاں صرفی کا قیام تھا اور وہاں یہ کہہ کر ان کو پھر سے غلط راہ پر ڈال دیا کہ:

گر شکستہ شدہ است یک توبہ
صد تواں کردنش ازاں روبہ
درشود شیشہ شکستہ چو دل
ہست پیوند آں بسے مشکل

والد نے اب کی بار صرفیؔ کو واپس بلوا کے اس لئے بھی ان کی مذمت کی کہ توبہ توڑتے وقت انہیں خوف خدا کا کچھ خیال نہ رہا۔

دوسرے دن جب صرفیؔ صبح کے وقت خانقاہ میں نماز فجر پڑھنے گئے تو سنت ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کو اٹھے ہی تھے کہ یک بیک زور سے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ والد یہ ماجرا دیکھ کر پریشان اور اہل جماعت حیران ہوئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ان کے پاؤں زخمی ہوئے ہیں اور جامہ خون آلود ہو رہا ہے۔ غرض عصر تک اسی حالتِ بے ہوشی میں رہے جب ہوش آیا تو خلوت چاہی اور حجرہ میں دم بخود بیٹھے رہے۔ مصاحبوں نے زخمی ہونے کا سبب پوچھا تو فرمایا "میں نے قطب ربانی حضرت سید میر علی ہمدانیؒ کو سید خلیل اللہ محتسبؒ کے ساتھ اپنے سامنے جلوہ گر ہوتے دیکھا۔ حضرت نے محتسب کو حکم دیا کہ اس گریز پا کے پاؤں کاٹ دے تا کہ یہ راہِ معبود سے بھٹکنے نہ پائے۔ سید خلیل نے میرے پاؤں پر شمشیر سے ضرب

لگا کر حضرت سے گذارش کی کہ حسب الحکم میں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے ہیں اب یہ دوسری بار فرار نہ ہو سکے گا"۔

ان دنوں مغل بادشاہ بابر کا خالہ زاد بھائی میرزا حیدر حاکمِ کشمیر تھا جو صاحب سیف ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ قلم بھی تھا۔ اس نے "تاریخ رشیدی" جیسی مشہور تواریخ کشمیر لکھی ہے۔ میرزا حیدر نے گیارہ سال حکومت کی۔ اس کے زمانے میں کشمیر خوشحالی اور فارغ البالی کا مرکز تھا۔ اس نے جب صرفیؔ کے اس واقعہ کے بارے میں سنا تو دل و جان سے اس کا معتقد ہوا اور خوش ہو کر یہ پیشین گوئی کی کہ آگے چل کر یہ شخص بہت بڑا درویش ہوگا (8)

کچھ عرصہ بعد جب صرفیؔ والدین اور بھائیوں کے ساتھ گھر پر بیٹھے تھے تو ان کی حالت پھر غیر ہونے لگی اور وہ حواس کھو کر زمین پر گر پڑے۔ افاقت کے بعد انہوں نے گھر والوں سے بیان کیا کہ "میں نے ایک سرخ رو۔ بلند قامت اور ریش دراز پیر مرد کو دیکھا جس کی ہیبت ظاہری سے میں فرش پر گر گیا۔ اس بزرگ نے مجھ سے کہا کہ میں شیخ حسین خوارزمی ہوں اور حضرت امیر کبیرؒ نے مجھے تمہاری تربیت کا ارشاد فرمایا ہے۔ تو خود کو فوراً میرے پاس پہنچا دے تاکہ میں فیض کے دروازے تجھ پر کھول دوں"

ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے صرفی کی زندگی میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی کہ وہ دن رات عباداتِ الٰہی میں مصروف و مشغول رہنے لگے اور خلوت نشینی کے لیے انہوں نے خانقاہ امیرؒ ہی کا ایک حجرہ منتخب کر لیا۔ اس عزلت نشینی میں ایک بار پھر حضرت علی ثانی اور حضرت حسینؒ خوارزمی کی مقدس ارواح خواب میں ان پر جلوہ گر ہوئیں اور حضرت امیر کبیرؒ نے ان سے فرمایا کہ "میں نے تمہیں اس بزرگ کے سپرد کیا ہے تاکہ تمھاری رہنمائی کرے۔ پس تم اس مخدوم اعلم (9) کے پاس فوراً پہنچ جاؤ (10) حضرت صرفی نے اس حکم

کی تعمیل میں خوارزم کے سفر کا عزم کیا جہاں حضرت شیخ حسین کا قیام تھا۔ والدین اور رفیقوں نے اس کٹھن سفر کی صعوبتوں اور دشوار گزار راستے کے خوف وخطر سے خبر دار کیا لیکن جب صرفیؔ اپنے ارادے پر بدستور قائم رہے تو ماں باپ نے ان کو جانے سے باز رکھنے کی غرض سے یہ ترکیب نکالی کہ میر حسن نے اپنے ایک ساتھی خواجہ داؤد کو حافظ بصیر کے پاس جانے اور ان کو بلا لانے کے لیے کہا تاکہ استاد کے منع کرنے سے شاید شاگرد مان جائے۔

خواجہ داؤد نے اسی رات خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو یہ درخواست لے کر ملا بصیر کے پاس جانے سے روکتا ہے (11) خواجہ داؤد نے جب صبح یہ خواب میر حسن سے بیان کیا تو وہ بھی بادلِ ناخواستہ صرفی کو اجازت دینے پر آمادہ ہو گئے۔

صرفی اس طرح ایک طویل سفر پر سرما کے دنوں میں روانہ ہوئے۔ وہ اپنے حقیقی برادر میر نوروز، یوسف کوکہ اور دو خدمتگاروں یعنی بوٹہ صرفی اور اور شیخ بہرام کو ہمراہ لے گئے۔ وہ بانہال کے راستے اس سفر پر پیدل چل نکلے اور جموں اور سیالکوٹ سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ لاہور میں آپ کی ملاقات قاضی صدر الدین جالندھری سے ہوئی جو اس حد تک ان کے دوست اور رفیق بنے کہ اپنی دختر کو ان کے عقد میں دینا چاہا لیکن صرفی چونکہ علوم تحصیل اور مدارجِ روحانی کی تکمیل کے لیے ایک دور دراز سفر پر نکلے تھے لہٰذا انہوں نے معذرت ظاہر کی۔ کچھ وقت لاہور میں گذارنے کے بعد پانچ افراد پر مشتمل یہ چھوٹا سا قافلہ کابُل پہنچا جہاں صرفی نے سات ماہ تک قیام کیا۔ یہاں سے وہ بدخشان۔ بلخ اور غوری پہنچے۔ پھر کوہ و دریا اور پر خطر وادیوں کو طے کرتے ہوئے سمرقند پہنچے جہاں حضرت خوارزمی کا مسکن تھا۔ حضرت کی درگاہ تک پہنچنے کے لیے سات دروازوں سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا جن میں سے ہر دروازے پر ایک

ایک خلیفہ متعین تھا۔ حضرت صرفی نے فصیل کے باہر ہی قیام کیا اور اپنے مرشد کے دیدار کا انتظار کرتے رہے۔ خواجہ حبیب سے انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ ''میں اس خانقاہ سے سے دور ہی منتظر بیٹھا رہا کہ میری قسمت نے یاوری کی۔ حضرت نے اپنے ایک خادم سے پوچھا کہ باہر کون ہے؟ کوئی کشمیری معلوم ہوتا ہے جا کر اسے اندر لاؤ کیونکہ اس کا جینا میرے بغیر محال ہے۔ نوکر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ حضرت نے بلایا ہے۔ (12) میں حسب ارشاد سات دروازوں میں سے ہوتا ہوا جب حضرت کے پاس پہنچا تو پہلی نظر اُن کے چہرے پر ڈالتے ہی پہچان گیا کہ یہ وہی مردِ خدا ہیں جو عالمِ خواب میں مجھ سے ہم کلام ہوئے تھے اور ان کی صورت میرے خیال سے قطعاً نہیں اتری تھی۔ حضرت شیخ نے میری طرف نظر اُٹھائی اور مسکرا کر بولے'' اے درویش اگر تو وہ زخم نہ کھاتا تو یہاں تک نہیں آتا''۔ میں معافی کا خواستگار ہوا اور از سرِ نو توبہ کر کے ان کے خدمت گاروں میں شامل ہوا۔

حضرت کے ہاں دستور تھا کہ جب کوئی نو وارد طالب علم آجاتا تو پہلے اسے سات خلیفوں میں سے کسی ایک کے حوالے کر دیتے تا کہ وہ اس کی تربیت کرے لیکن حضرت میرے بارے میں بولے کہ'' اس کی تربیت میں خود کروں گا۔ کیونکہ یہ جوان راہِ دین میں چست ہے''۔

ان دنوں جاڑے کا موسم زوروں پر تھا اور برف وباران اور تیز ہوا کے دن تھے۔ حضرت نے سب سے پہلے صرفی کو خانقاہ کے مطبخ کے لئے جنگل سے لکڑی لانے کے کام پر مامور کیا۔ صرفی ہر روز اپنے ساتھیوں کو لے کر جنگل سے لکڑی لاتے۔ انہیں اپنے آپ پر ناز تھا کہ حضرت کی طرف سے انہیں یہ خدمت کرنا نصیب ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ تک جب یہ کام بطریقِ احسن انجام دیتے رہے تو مرشد کے حکم سے چلّہ کش درویشوں کے غسل خانوں کو صاف و

پاک رکھنا اور فضلہ کو باہر کے میدان میں زمین تلے دبا دینا ان کا روزانہ کام تھا۔ پھر صرفی کو لنگر کے لیے پانی لانے پر تعینات کیا گیا اور باوجود اس کے کہ سردیوں کی تند ہواؤں سے خون رگوں میں جم جاتا تھا یہ خدمت بھی انہوں نے دل و جان سے انجام دی۔ آخر میں صرفی نے استاد کے کہنے کے مطابق خانقاہ ہی کے ایک تنگ حجرہ میں چلّہ کشی اختیار کی اور حضرت شیخ سے علوم وفنون اور روحانی ودینوی مسائل میں جانکاری حاصل کرتے رہے۔

اس دوران میں حضرت خوارزمی نے زیارتِ حرمین کے لیے مکہ معظمہ کا عزمِ سفر کیا تھا۔ صرفی کو بھی اپنے وطن اور والدین کی یاد آگئی اور انہوں نے حضرت شیخ سے اجازت مانگی۔ حضرت شیخ نے صرفی کو خرقہ خلافت پہنا کر رخصت ہونے کی اجازت دیدی اور خود مکہ شریف کی طرف روانہ ہوئے۔ صرفی بھی چند منزل تک ان کے ہمراہ رہے اور پھر اپنے راستے سے واپس کشمیر آگئے۔

مولانا صرفی جتنی دیر سفر میں رہے اس دوران ان کی شہرت کشمیر کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی اور لوگ غائبانہ طور پر ان کے علمی و روحانی کمالات کا چرچا سن کر گرویدہ ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب آپ واردِ کشمیر ہوئے تو عقیدت مندوں نے جوق در جوق ان کی خدمت میں آنا شروع کیا اور صرفی انہیں اپنے ارشادات سے مستفید کرتے رہے۔

کشمیر اب بھی افراتفری میں مبتلا تھا اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ اصحابِ علم اور بزرگانِ دین کی کیفیت بقول ملا بہاوالدین متو یہ تھی:

ہر کجا صاحبِ ضمیرے بود　　اوفتادہ بدار و گیرے بود
ہریک از اہلِ علم وصاحبِ کمال　　روبہ غربت زدہ بفرطِ محال

حضرت صرفی ملکی نظام کی اس درہمی کے مخمصے میں پھنسنے سے بچنے کی خاطر سری نگر کے علاقہ درگجن میں شیخ سلطان کشمیریؒ کی تعمیر کردہ خانقاہ

میں جاگزین ہوئے۔ یہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کیا اور اکثر طالبین یہیں آکر ان سے فیضیاب ہوتے۔ انہی ایام کا ذکر ہے کہ یعقوب شاہ نے جو اُس وقت کشمیر کا بادشاہ تھا وزیر اعظم اسماعیل کے بیٹے میر محمد کو اپنے پاس بلا کر حکم دیا کہ وہ شیخ صرفی کو قتل کر کے ان کا سر دربار میں پیش کرے (13) میر محمد جب رات کے وقت خانقاہ میں پہنچا تو دیکھا کہ حضرت تہجد میں مشغول ہیں۔ صرفی نے سلام پھیرتے ہی میر محمد کی طرف نظر اٹھا کر اُس سے کہا کہ وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتا۔ حضرت کا پُر جلال اور روحانی نور سے منور چہرہ دیکھ کر میر محمد مبہوت رہ گیا اور دوسرے روز حضرت سے معافی مانگ کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا۔

ماحول کی اس ابتری اور زبوں حالی سے دل برداشتہ ہو کر صرفی نے پھر کشمیر سے ہجرت کا قصد کیا۔ ساتھ ہی انہیں اپنے مرشد کا دیدار کرنے کا دوبارہ اشتیاق پیدا ہوا تھا۔ پھر وہ میر محمد ہی کو اپنا خلیفۂ اوّل اور جانشین مقرر کر کے کشمیر سے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر آپ ہند میں گجرات کی جگہ ٹھہرے اور پھر قندھار پہنچے تو وہاں سرحد کے محافظ حسن بیگ کو صرفی کے آنے کا پتہ چلا۔ اس نے حضرت کو اپنے پاس بلوا کر پوچھا کہ آپ کا مذہب و مسلک کیا ہے۔ صرفی نے برجستہ یہ غزل پڑھی:

مذہبم عاشقی و عشق بتاں دینِ من است
مشربم رندی و دیوانگی آئینِ من است
ہمہ راجام تنعّم بکف و ساغرِ عیش
فارغ از عیش و تنعّم دلِ غمگینِ من است

حسن بیگ صرفی کی اس بدیہہ گوئی سے اس قدر متاثر ہوا کہ ان کو انعام میں مال و زر دینا چاہا لیکن صرفی نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آخر کار حسن بیگ

کے پرزور اصرار پر انہوں نے دو تین دن کا زادِ راہ لینے پر اکتفا کیا اور خراسان کی راہ لے لی۔ پھر کابل، بدخشان اور بلخ و بخارا کا سفر کر کے جب شیخ صرفی سمرقند پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت خوارزمی زیارتِ حرمین الشریفین کو گئے ہیں۔ صرفی بھی یثرب روانہ ہوئے اور روضہ رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس سفر میں آپ مشہد بھی گئے جہاں حضرت امام شاہ علی موسیٰ رضاؒ کا روضہ پاک دیکھا۔ جام میں حضرت شیخ احمد جامی سے فیض پایا۔ ان ایام میں انہوں نے بہت سے علمائے دین اور اولیاء اور مشائخ سے ملاقات کر کے ان کی صحبت کا شرف پایا۔

ایران کی سرزمین میں پہنچ کر صرفی نے شاہ طہماسپ والی ایران سے ملاقات کی اور اپنے کمالات و کرامات سے اسے مطیع و گرویدہ کیا۔ شاہ طہماسپ کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں متعصّبانہ نکتہ نظر رکھتا تھا لیکن جب شیخ صرفی نے اسے امور دین اور فرمان الٰہی سے آگاہ کر کے اپنے اس نازیبا رویہ سے باز آنے کو کہا تو شاہ کو لوگوں کے تئیں اپنے طریقِ کار میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہاں سے شیخ صرفی پھر حج کو گئے اور مکہ معظّمہ میں شیخ المحدثین حضرت علامہ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر المکی اور حضرت شیخ عبدالعزیز سے تفسیر حدیث کی سند حاصل کی اور پھر مدینہ مطہرہ تشریف لے گئے۔

مدینہ پاک میں چھتیس دن تک روزہ رکھنے کے بعد صرفی دریائی راستے سے ہندوستان آ گئے۔ گجرات پہنچ کر آپ نے وہاں ایک نیک سیرت خاتون سے حضرت امام اعظمؓ کا جامہ مبارک حاصل کیا۔ گجرات میں آپ کچھ عرصہ چلہ کش رہے اور چالیس دن کے لیے روزہ رکھنے کا ارادہ کیا۔ اُنتالیس دن گزرنے کے بعد بھی آپ میں بظاہر کسی قسم کی سستی پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن

ایک مصاحب کے کہنے پر افطار کیا۔

اس سفر میں صرفی نے دیگر علماء وفضلاء کے علاوہ فتح پور سیکری میں شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے بھی ملاقات کی اور سلسلہ چشتیہ کے اس عالم وفاضل کے ارشادات سے بہرہ ور ہوئے۔ 964ھ میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے آخری حج میں شیخ صرفی بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ اس موقع پر انہوں نے یہ تاریخ کہی ہے

"شکر خدا را کہ بہ مختصِ کرم منزلِ ماشد حرمِ محترم
ہر کہ بپرسید ز تاریخ سال نَحنُ اَجبناہُ "دخلنا الحرم" (14)

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اسی زمانے میں حضرت صرفی سے سرہند میں حدیث اور تصوف میں درس لیا۔

حضرت صرفی کی کشمیر میں واپسی کے زمانے میں بھی والیان کشمیر کی خانہ جنگیوں سے ملک میں تباہی کا بازار گرم تھا۔ بقول اعظم دیدہ مری "درآں وقت بسبب شورش والیان ایں جا (کشمری) کہ بہ فساد مذہب وملک ودولت را برباد دادند کشمیر محل آفات وحوادث شدہ بود" (15) یعقوب شاہ چک نے مخالفوں کو رفع دفع کرنے کے ساتھ ہی بہت حد تک تنگ نظری کا بھی ثبوت دیا اور اکثر معاملات میں اختلافات کو مذہبی نکتہ نگاہ سے جانچا جس کی وجہ سے خاص کر اہلِ سنت والجماعت اس سے متنفر ہو گئے اور انہوں نے سلطان کو بے بس کرنے کی راہیں نکالنے کے لیے سازشیں شروع کیں۔ انہی دنوں ایک افسوسناک سانحہ پیش آیا۔ قاضی میر علی کے پوتے قاضی موسیٰ مفتی اعظم کشمیر نے سری نگر کی جامع مسجد کی چھت اور کوٹھے کی مرمت کا کام ہاتھ میں لیا تھا اور وہ ایک سال سے پوری توجہ اور انہماک سے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں لگا تھا۔ قاضی موسیٰ یوسف شاہ کے باپ کے زمانے سے کشمیر کا قاضی تھا۔ کیونکہ یہ عہدہ چکوں کے

دور میں بھی سنی عالم ہی کے پاس رہا تھا۔ یعقوب شاہ نے اسے یہ بات منوانے کے لیے حتیٰ الامکان زور آزمائی سے کام لیا کہ قاضی موسیٰ اذان میں حضرت علیؓ کا نام بھی شامل کر لے لیکن بالآخر جب قاضی نے اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کیا تو یعقوب شاہ نے اسے سزا کے طور پر دیوانِ عام میں شہید کروا کے اس کی لاش ایک ہاتھی کی دم سے بندھوا کر شہر بھر میں پھروادی۔ (16) نتیجے کے طور پر چکوں کی حکومت کے خلاف ناراضگی کی آگ اور بھی تیز ہوئی اور ہر طرف سے بغض و عناد کی جوالا بھڑکنے لگی۔ سرکار کی مخالف ایک خفیہ سیاسی جماعت وجود میں آ گئی جس میں ریاست کے وہ اہل قلم اور فضلاء اور مشائخ بھی شامل ہوئے جو یعقوب شاہ کے طریق کار سے اختلاف رکھتے تھے اور اس کی سیاسی پالیسی کے مخالف ہو کر کشمیر کے نظام میں اہم تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس گروہ کی سرکردگی حضرت صرفی کرنے لگے۔ انہوں نے اس جماعت کے منشور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ریاست کے دوسرے فرقوں کے اکابرین سے وقتاً فوقتاً بحث ومباحثے کیۓ اور انہیں اپنے جامع الکمالات ہونے اور دینی، مذہبی اور سیاسی معاملوں پر قدرت رکھنے سے اپنا ہم خیال بنا دیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت صرفی چند ہم رائے مصاحبوں کو ساتھ لے کر اس خیال سے آگرہ چلے گئے کہ دربار اکبری میں کشمیر کو چک حکومت کی فرمانروائی سے آزاد کروانے کی طرف کوئی خاطر خواہ قدم اٹھائیں۔ صرفی کے ہم عمر خالہ زاد بھائی حضرت بابا داؤد خاکی بھی جو کچھ وقت پہلے کشمیر سے بھاگ کر ملتان میں پناہ گزین ہوئے تھے وہیں سے آ کر اس وفد کے ساتھ آ ملے۔ وفد کے دوسرے اراکین میں چندر خان۔ بہرام نایک اور فتح خان شامل تھے۔ یہ لوگ خواجہ حاجی بانڈے کی رہنمائی میں پیر پنچال کو عبور کر کے اکبر کے پاس آگرہ پہنچے (17) وفد نے اکبر شاہ کو تسخیر کشمیر کی ترغیب دی اور اپنی طرف سے اسے مکمل

تعاون کا یقین دلایا۔ کشمیر پر دھاوا بولنے اور اسے مرکز کے ساتھ ملانے کی خاطر وفد نے اکبر شاہ کے سامنے چند شرائط پیش کیں جنہیں اکبر نے فوراً قبول کیا۔ معاہدہ یوں تھا:

(الف) ریاست میں عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔

(ب) تجارتی اشیاء کی خرید وفروخت کا کام آزادانہ طور پر ہوگا اور اناج کا نرخ مقررہ کرنے میں کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی۔

(ج) کشمیریوں کو غلام نہیں بنایا جائیگا اور نہ ہی کشمیری عورتیں کنیزیں بنائی جائیں گی۔

(د) اہلِ کشمیر سے نہ تو بیگار ہی لی جائیگی اور نہ ہی انہیں کسی طریقے سے پریشان کیا جائیگا۔

(ہ) جن کشمیریوں نے ملک میں افراتفری پھیلانے والے عناصر کو ہوا دی ہے۔ ان کا ملکی نظام سے بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

ان شرائط کے تحت اکبر نے پہلے مرزا شاہ رخ کی سرکردگی میں ایک فوج کشمیر روانہ کی لیکن شاہ رخ کے ناقابل ہونے کی بنا پر یہ کمان مرزا قاسم خان میر بحریہ کو سونپ دی گئی اور اس کے ساتھ فتح خان اور مرزا علی اکبر شاہی بھی روانہ کئے گئے۔

لشکر اکبری چالیس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں پر مشتمل تھا (18) جنگ میں جب ایک بار مغلوں کو شکست ہوئی تو چک سرداروں کے ہاتھوں صرفی کے قید ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے (19) یعقوب شاہ نے آخر کار شکست کھائی اور بعد میں وہ محرم 1001ھ مطابق اکتوبر 1592 میں فوت ہوا۔ اس کی قبر آج بھی ریاست جموں و کشمیر میں کشتواڑ کی جگہ موجود ہے۔ اس

طرح سے سلطنت کشمیر ذیقعد 994ھ بموجب جولائی 1586ء میں مغلیہ حکومت کے ساتھ مدغم ہو گیی۔

اکبر اعظم کا راج لاگو ہونے کے بعد کشمیر میں اب اہلِ سنت نے جذبہ انتقام کے تحت شیعہ فرقے پر مظالم ڈھانا شروع کئے لیکن حضرت صرفی ابتدا ہی سے فرقہ وارانہ بھائی چارے اور ملی یکجہتی کے علم بردار تھے۔ ان پر یہ الزام لگانا کہ انہوں نے برسرِ اقتدار چک حکومت کو مذہبی تعصب کی بنا پر گدّی سے محروم کروانے کی کوشش کی کسی صورت میں محققانہ تجزیہ کے مطابق صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت صرفیؔ اگر چہ خود اہلِ سنت میں سے تھے لیکن ہر مسلمان صادق کی طرح ان کے دل میں بھی حضرت شاہ ولایت اور اہل بیت کی بے پناہ عقیدت ومحبت موجزن تھی جس کا ثبوت ان کے وہ قصائد اور مراثی ہیں جو انہوں نے حضرت علی مرتضیٰؓ کی مدح میں اور حضرات حسنینؓ کی شہادت پر تحریر کئے ہیں۔

چنانچہ اس موقع پر بھی جبکہ شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے کشمیر میں سنی فرقہ کے زیرِ عتاب آنے لگے حضرت صرفی نے پوری قوت اور زور وشور سے ان بے جا مظالم کے خلاف آواز اٹھائی اور ایسی مذموم حرکات کی سخت ملامت کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے مشتعل لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے جا بجا پند ونصائح دیئے اور ''مناقب الاولیا'' تصنیف کر کے فرقہ پرستی کی اس دہکتی آگ کو بجھانے کی پرخلوص کوشش کی۔ ان واقعات کے پیش نظر یہ بات ثابت ہونے میں کوئی شک نہیں کہ حضرت صرفی نے ہر وقت بے بجا ظلم اور تشدد کے خلاف نڈر ہو کر آواز اٹھائی ہے۔ وہ خود بھی ایک آزاد شہری کی حیثیت سے رہنا چاہتے تھے اور اپنے ہم وطنوں کو بھی آسودہ حالی کی زندگی گزارتے دیکھنا ان

کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ یہ بدقسمتی کی بات تھی کہ ان کی زندگی میں کشمیر کو چین نصیب نہ ہوسکا اور ہر طرف سے ایک دوسرے کے خلاف مذہبی جانبداری کی قابلِ نفرین حرکات سرزد ہوتی رہیں۔

چک خاندان کے دورِ اقتدار میں جہاں اہلِ سنت نے جور و ستم برداشت کیے وہاں مغلیہ راج قائم ہونے سے اہلِ شیعہ کو سنّیوں نے ستانا شروع کر دیا۔ لیکن یہ حضرت صرفی ہی تھے جنہوں نے ان دونوں نازک گھڑیوں میں بغیر کسی مذہبی یک طرفی یا ریاکاری کے حق و صداقت کا ساتھ دیا اور ملک میں رواداری اور یکجہتی دیکھنے کی غرض سے ہر فرقے کے ظالموں اور جابروں کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا۔

اکبر کی عملداری کشمیر میں شروع ہونے کے بعد حضرت صرفی نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا اور پھر حرمین الشریفین کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اس سفر میں انہوں نے کم و بیش ایک سال گذارا اور جب واپس آئے تو مختلف ممالک سے تفسیر۔ فقہ و حدیث اور دیگر علوم کی بیش بہا کتابیں اور مشاہیر علما کی چیدہ چیدہ تصانیف اپنے ساتھ لائے۔ اس علمی خزانے میں بالخصوص وہ کتابیں شامل تھیں جو اُن دنوں کشمیر میں دستیاب نہیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرفی کے ذاتی کتب خانے میں نوادرِ روزگار مخطوطات کی تعداد پندرہ ہزار سے زیادہ تھی۔

اپنی عمر کے پچھتر سال بسر کرنے کے بعد صرفی نے 12 ذیقعد 1003ھ بموجب 25 جولائی 1594ء بروز پنج شنبہ رات کو نمازِ عشا ادا کرتے ہوئے انتقال فرمایا۔ ان کی وفات کا سال "شیخ امم بود" "یدِ حافظ" اور "شیخ الباطن" سے نکلتا ہے۔ صرفی کی تاریخِ وفات علمائے دہر۔ فضلائے زمانہ اور ان کے بہت سے شاگردانِ رشید نے نظم کی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے جب ان کی رحلت کی خبر سنی تو یہ نوحہ کہا:

یاراں ہمہ رفتند و رہِ کعبہ گرفتند
مامست قدم بر در خمار بماندیم
از نکتہ مقصود نشد فہم حدیثے
لا دین و لا دنیائے بیکار بماندیم(20)

حضرت صرفی کی قبر شہر سری نگر میں زینہ کدل کے جنوب کی طرف جناب شیخ عبدالوہاب نوری کے قبرستان میں ہے جہاں صرفی نے پہلے ہی اپنی خانقاہ بھی بنوا رکھی تھی۔ ایک کوٹھری میں خود آپ اور ملحقہ دو حجروں میں شاہ قاسم حقانی اور حبیب اللہ نوشہری عبادتِ الٰہی کیا کرتے تھے۔ محلّہ مذکورہ کو تب سے ایشاں صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے اور حضرت صرفی کے مزارِ مقدس کو زیارتِ ایشاں کہا جاتا ہے۔ لفظِ ایشاں فارسی میں جمع غائب کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ ترکستان میں اس لفظ کے معنی شیخ۔ استاد اور مرشد وغیرہ کے ہیں چنانچہ مشہور عالمِ خواجۂ احرارؒ کو بھی تذکرہ نگاروں نے ایشاں لکھا ہے (21)۔

ایشاں عام طور پر اپنے شاگردوں کے سمیت خانقاہ میں رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے صرفی کو ایشاں بھی کہتے ہیں(22) دوسری روایت کے مطابق حضرت صرفی اس نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ روحانی امور میں ان کے برگزیدہ ہونے کی بدولت ایک بار آنحضرتؐ نے خواب میں انہیں اس نام سے پکارا تھا۔

حضرت صرفی کا عمر بھر خاص شغل یہ رہا ہے کہ پڑھنے لکھنے میں زندگی گذاردی۔ جب فارغ ہوتے تو اپنے ہم عصر علماء سے دینی و مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا کرتے اور اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے۔ خوبصورت اور خوش سیرت تھے۔

صرفی نے 953 ھ میں پچیس سال کی عمر میں ایک سید زادی کے ساتھ شادی کی تھی جو سید علاوالدین ابنِ سید قیام الدین کی صاحبزادی تھی۔ اس سے صرفی کا ایک فرزند محمد یوسف پیدا ہوا جو شادی کے بعد ایک دختر چھوڑ کر عالمِ جوانی میں ہی فوت ہوا۔

حضرت صرفی اپنے عہد کے اُن بلند پایہ عالموں اور مفکروں میں شمار ہوتے تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی فنی اور علمی باریکیوں کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ حضرت صرفی نے تصوف و معرفت۔ دین و مذہب۔ علمِ تفسیر و حدیث اور شعر و شاعری غرض ہر سنجیدہ مضمون پر خامہ فرسائی کی اور اپنے کمالِ تفکر اور ذہنی اپج کی بدولت ہم عصر علماء اور اصحابِ قلم میں اس درجہ ممتاز ہوئے کہ ''آئینِ اکبری'' کے مصنف کے بقول

''در تمام انواعِ شعر و علوم مختلف تسلط کامل داشت''

صرفی کی تصانیف کی تعداد دو درجن کے قریب ہے جن میں سے اکثر زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں اور صرف قلمی نسخوں کی صورت [illegible] منتشر حالت میں موجود ہیں۔

نظامی گنجوی کی ''پنج گنج''۔ امیر خسرو کی ''خمسہ'' اور مولانا عبدالرحمن جامی کی ''سبعہ'' کے اتباع میں صرفی نے بھی ایک ''پنج گنج'' تصنیف کی ہے جیسا کہ خود ان تین اساتذہ سخن کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تو انم بہ نظمِ نظامی رسید
مئے از جام خسرو چو جامی کشید

اس خمسہ میں ان کی پانچ مثنویاں مسلک الاخیار۔ وامق عذرا۔ لیلے مجنوں، مغازی النبیؐ اور مقامات مرشد شامل ہیں۔

''خمسہ'' کے علاوہ حضرت صرفی کی تصانیف یہ ہیں:

(1) شیخ فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر ''سواطع الالہام'' دربارِ اکبری میں حضرت صرفی کو دیدی تو انہوں نے فی البدیہہ اس کے آخری دو پاروں کی عربی زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھ ڈالی جو مفسرانہ اصول اور رموز ونکات کا ایک خزینہ ہے۔

(2) صحیح بخاری کے احادیث کی مبسوط شرح اور تفسیر۔

(3) ''مناسک الحج'' صرفی نے اس کتاب میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں حج کے ان تمام مسائل اور فرائض پر عالمانہ بحث کی ہے جن سے واقف ہونا ایک مردِ مومن کیلئے ضروری ہے۔ یہ تصنیف عربی زبان میں ہے۔

(4) ''حاشیۂ توضیع وتلویح'' علامہ شیخ سعد الدین تفتازانی کی علمِ فقہ پر مشہور کتاب ''توضیع وتلویح'' پر حاشیہ۔

(5) ''اربعین'' حضرت علےٰ مرتضیٰؓ اور اہلِ بیت کی شانِ اقدس میں صحاحِ ستہ سے احادیث جمع کر کے صرفی نے چالیس چالیس حدیثیں فارسی نظم میں پیش کی ہیں۔

(6) ''کنز الجواہر'' فن تعمیہ پر ایک محققانہ کتاب جس کا سن تصنیف 1002ھ ہے۔

(7) ''یدِ بضا''۔ مولانا نے اپنے تمام معمے اس کتاب میں یکجا کر دیئے ہیں۔ اس میں ان کی شرح بھی شامل ہے۔

(8) ثلاثیات بخاری کی تمہید اور تشریح: ''صحیح بخاری'' شریف کے تین زاویوں والی احادیث کے معنی اور ان کی شرح۔

(9) ''رواتح'' یہ کتاب صرفی نے حضرت جامی کے ''لواتح'' کی تقلید میں لکھی ہے۔ اس میں پینتالیس رایحہ ہیں جن میں معرفت کے راز اور

سلوک وتصوف کے مدارج کا بیان ہے۔آج تک اسکے صرف دوروا یح اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ مولانا نے یہ کتابچہ 976ھ مطابق 1568ء میں قلمبند کیا۔

(10) ''رسالہ ذکریہ'' اس منظوم ومنثور رسالے میں بھی سلوک وتصوف کے رازوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

(11) حضرت نے عمر کے آخری دنوں میں ''تفسیر کبیر'' کی طرز پر قرآنِ حکیم کی ایک شرح لکھنا شروع کی تھی اور شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس کے مسودہ کو دیکھ کراس کام کی داد دی تھی لیکن ابھی صرفی نے اس کام کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ دنیائے فانی نے وفا نہ کی اور آپ کا انتقال ہوا۔

(12) ''مناقب الاولیاء'' اس مجموعہ میں حضرت صرفی کے وہ مناقب درج ہیں جوانہوں نے خلفائے راشدین، صحابہ کبار، اہل بیت اوراولیائے کاملین کی شان میں تحریر کئے ہیں۔

(13) ''قصائد''۔مولانا صرفی نے وقتاً فوقتاً چہار یارانِ باصفا۔حضرت امیر کبیرؒ، اولیائے کرام اور اپنے مرشد حضرت شیخ خوارزمی کی تع... وتوصیف میں چند قصیدے لکھے ہیں جن کے ابیات کی تع... زیادہ ہے(23)

(14) ''رباعیات وقطعات'' مولانا نے فاضل اوقات میں کبھی کبھی رباعیات اور قطعات لکھے ہیں جن میں سے اکثر سال 962ھ کی تخلیق ہیں۔ رباعیات کی تعداد تین سو اور قطعات پچیس سے زیادہ ہیں۔صرفی کی ایک مشہور رباعی یہاں درج کی جاتی ہے:

اے بادیہ پیمائے رہِ کعبہ گل
از فیض و فتوحِ کعبہ دل غافل

این کعبہ تو بود بربّ الکعبہ
یک کہنہ رباطے برہِ کعبہ دل

(15) ''دیوانِ صرفی'' مولانا کی فارسی غزلیات کا مجموعہ جو ساڑھے آٹھ سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں 980ھ تک کی لکھی ہوئی غزلیات درج ہیں۔ چند مشہور اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم ز دل دزدیدہ صبر و ہم دلِ دیوانہ را
یار من باخانہ مے دزدد متاع خانہ را



بررخ فگند چاشتگاہ آں مہ نقاب را
پیش از زوال شام رسید آفتاب را



در صد ہزار آئینہ یک روست جلوہ گر
در ہر چہ بینم آں رخ نیکوست جلوہ گر
خلقے بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست
ویں طرہ بیں کہ دوست بہر سوست جلوہ گر



زضعف تن عجب حالے ست بیمار محبت را
کہ نتواند کشید از ناتوانی بارِ محنت را(24)

''پنج گنج'' میں جو پانچ مثنویاں ہیں ان کا مختصر ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

☆ ''مسلک الاخیار'' یہ کتاب صرفی نے نظامی کے ''مخزنِ اسرار'' کے جواب میں لکھی۔ اس مثنوی میں انہوں نے حقیقت و معرفت کے نکات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان وقائع اور حالات کو بھی نظم کیا ہے جو انہیں

اپنے مرشد ظاہری کے ساتھ مختلف نشستوں میں پیش آئے۔

☆ ''وامق عذرا'' یہ قدیم عربی داستان فارسی میں سب سے پہلے پانچویں صدی کی ابتداء میں داخل ہوئی۔ اس طرح سے ابوالقاسم حسن عصری (441ھ۔350ھ) غالباً فارسی زبان کا وہ پہلا سخن گو ہے جس نے ''وامق وعذرا'' کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔

☆ ''لیلےٰ مجنوں'' حکایت لیلیٰ ومجنوں کی سرزمینِ اصل بھی عربستان ہے جہاں اس رومانوی قصے نے جنم لیا اور پھر عرب وعجم کے داستانی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہوا۔ عربی میں یہ داستان پیش کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے ابن الندیم کا نام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور شاعروں نے بھی اس حکایت کو عربی الاصل میں نظم اور نثر دونوں صورتوں میں پیش کیا۔ عربی شعراء میں سے اگرچہ کئی ایک نے اس نیم تاریخی اور نیم افسانوی کہانی کو اپنے اپنے طور پر پیش کیا ہے لیکن نظامی گنجوی وہ پہلا شاعر تھا جس نے فارسی میں اسے خوب سے خوب تر بنا کے شعر میں ڈھالا اور اس طرح سے نظامی ہی کی بدولت فارسی ادب میں یہ حکایت ایک اعلیٰ پایہ کی مثنوی کی شکل میں داخل ہوائی۔

☆ ''مغازی النبیؐ''۔ یہ مثنوی حضرت صرفی نے ''سکندر نامہ'' کے مقابلے میں لکھی ہے۔ اس کی تصنیف کا عزم کرتے وقت انہوں نے موضوع کا انتخاب اس طرح سے کیا کہ کسی عظیم شہنشاہ یا تاریخی اہمیت کے کسی شخص کا حال بیان کرنے کی بجائے آنحضرتؐ کے سوانح پاک اور ان کے غزواتِ مبارک کو اپنا موضوع بنالیا۔

☆ ''مقاماتِ مرشد'' صرفی کے خمسہ کی اس آخری مثنوی کو شاعر نے نظامی کے ''ہفت پیکر'' کے جواب میں لکھا ہے۔ اس مثنوی میں صرفی نے حضرت

شیخ کمال الدین حسین خوارزمی کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے وہ اکثر و بیشتر کمالات اور کرامات بیان کی ہیں جن کے بارے میں صرفی نے ان دنوں میں خود حضرت خوارزمی کی زبان سے سنا تھا جب ان کا قیام خوارزم میں تھا۔

مولانا شیخ یعقوب صرفی کا مقام شعر و شاعری کی بہ نسبت فلسفہ و تصوف۔ دین و معرفت اور فقہ و حدیث کے میدان میں بلند اور برتر ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو مجموعِ فضل و کمالات (25) اور مذہبی معاملات میں سب سے بڑی سند قرار دیا (26)۔

صرفی نے تمام مضامین پر قلم اٹھاتے وقت حکمت و فراست کے وہ موتی پروئے ہیں کہ ان کو علمِ ظاہر و باطن کے جامع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شیخ صرفی کو اپنے ملک کے ہم عصر علماء اور فضلاء میں قابل ترین خیال کیا جاتا تھا اور وہ ابوالفضل کے بقول ''از فنونِ شعر آگاہ و بگونا گوں دانش آشنا بود'' (27)

دربارِ داراشکوہ کے ممتاز شاعر اور صرفی کے شاگرد ملا محسن فانی کشمیری نے اپنی مثنوی ''مصدر آلاثار'' میں نظامی۔ امیر خسرو اور جامی کے ساتھ ساتھ صرفی کی بھی اس انداز میں ستائش کی ہے:

صرفی ازاں تحفہ زابرار شد — بدرقہ مسلکِ اخیار شد
بحر سخن موج زد از سینہ اش — گشت عیاں جوہر آئینہ اش
ملکِ سخن راست ازو فتح یاب — یک سخنش فاتحہ صد کتاب
نورِ دلش شمع رہِ گمرہان — ہر سخنش گوہر تاجِ شہاں
صفحہ دل از رقمِ غیر شُست — کرد شرف نامہ وحدت درست
از نفسِ ملکِ سخن نور یاب — روشن ازو آئینہ آفتاب
ملکِ سخن گر نہ بمیراث بود — مسلک اخیار بمن چوں نمود (28)

مولانا صرفی کی شاعری غزلیات۔ مثنویات۔قطعات۔ قصائد۔ رباعیات اور مناقب وغیرہ جیسی اصناف سخن پر مشتمل ہے۔انہیں ایک ماہر علوم و فنون ہونے کی حیثیت میں شاعری کے جملہ لوازمات سے کماحقہ آگاہی حاصل تھی۔ بحوراور اوزان۔ ردیف وقوافی اور صرف ونحو کے معاملات انہوں نے اپنے کلام میں حد درجہ سلیقہ اور اس حسن ترتیب کے ساتھ نبھائے ہیں جو کامیاب اور موثر ترین شاعری کی عمارت کو پائدار بنیادوں پر استوار کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔

حضرت صرفی کی مثنویات پڑھنے کے بعد بالخصوص ہمیں ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے حالانکہ انہوں نے اپنی تمام تر مثنویاں قلم برداشتہ اور بغیر کسی ریاضت کے قلم بند کی ہیں۔

فارسی کے ساتھ ساتھ حضرت صرفی عربی زبان کے بھی عالم بے بدل تھے۔اس وجہ سے اُن کے کلام میں جابجا عربی اشعار بھی آئے ہیں جن سے ان کی شاعری کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیری کا شمار آج بھی کشمیر کے اُن جلیل القدر عالموں اور سخن وروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے علم و ہنر کی بدولت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی شہرت حاصل کی تھی اور جو آیندہ نسل [illegible] کے لئے بھی اپنے کمال کے ابدی نقوش انسانی فکروذہن پر ثبت کر [illegible]



حوالہ جات:

(1) تاریخ کشمیر کبیر۔محی الدین مسکین۔1322ھ

(2) ایضاً۔ص143

(3) خزینۃ الاصفیاء۔جلد دوم۔ مطبع نولکشور۔کانپور۔ص338

(4) صرفی نے اپنے تخلص کو جس رنگ میں باندھا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

به عشقت همه عمر خود صرف کردم
ازاں رومرا غیر صرفی لقب نیست
چوں کرد صرف راه تو نقد حیات خویش
یعقوب را به عشق تو صرفی شد است نام

(5) کشیر۔ جی ایم ڈی صوفی۔ جلد دوم۔ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور۔1949ء۔ص359

(6) آپ کشمیر میں ملہ بابہ صاحب کے نام سے معروف ہیں اور سری نگر میں محلّہ خندہ بھون میں دفن ہیں۔

(7) مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ اس فعل کی نوعیت کیا تھی۔

(8) مرزا حیدر 958ھ میں شہید ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے:

شہ گورگاں میرزا حیدر آنکہ بہ ملک شہادت زدہ کوس شاہی
قضائے الہٰی چنیں بود تاریخ بدہ بہر وصلش ''قضائے الہٰی''

(9) حضرت شیخ حسین خوارزمی کا لقب۔

(10) عبدالوہاب نوری نے صرف حضرت امیر کبیرؒ کے جلوہ گر ہونے کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''شبے جناب حضرت شاہ ہمدان حاضر شدہ فرمودند کہ اے فرزند ترا بہ مخدوم اعلم سپردم۔ زود خودرا پیش وی رسان تا وارث فیض ماشوی'' (فتحات کبیرویہ)

(11) شیخ نوری کے مطابق اس رات حضرت امیرؒ نے استاد حافظ بصیر سے

فرمایا ''زنہار مانع مانہ شوی و او را بگوتا خود را از و پیش مخدوم اعلم رساند'' (فتحات)

(12) مولف خزینۃ الاصفیاء کا کہنا ہے کہ ''حضرت خوارزمی باستقبال شیخ صرفی بذات خود بیرون از خانقاہ آمدند''

(13) رشحات کلام صرفی۔ محمد طیب صدیقی ضیغم۔ سری نگر۔ 1964ء۔ص 28

(14) دربار اکبری۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ ص 791

(15) اشجار الخلد۔

(16) تاریخ حسن۔ جلد دوم۔ محکمہ تحقیق و اشاعت سری نگر۔ ص 331

(17) رشحات کلام صرفی۔ محمد طیب صدیقی۔ 1964ء۔ص 31

(18) مصنف ''فتحات کبرویہ'' نے یہ تعداد تیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادے بتائی ہے۔

(19) کشمیر انڈر دی سلطانز۔ محبّ الحسن۔ علی محمد اینڈ سنز سری نگر۔ 1974ء۔ص 186

(20) منتخب التواریخ۔ جلد دوم۔ کالج پریس کلکتہ۔ 1865ء۔ص 403

(21) ان کا سال وفات 895ھ بمطابق 1489ء ہے۔

(22) کشیر۔ جلد دوم۔ص 364

(23) ایشاں صاحب محلّہ زینہ کدل میں محی الدین نوری صاحب کے پاس میں نے 1962ء میں صرفی کے برادر میر محمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا قصائد صرفی کا جو نسخہ دیکھا تھا اس میں 33 قصیدے درج تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ نسخہ اب موجود ہے یا نہیں (خیالؔ)

(24) اب تو مر جانا بھی مشکل ہے تیرے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

اس شعر کو اگرچہ عام طور پر مرزا غالب کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے لیکن کمال احمد صدیقی نے اپنے مرتب کردہ غالب کے مصدقہ دیوان میں یہ کہہ کر اسے شامل نہیں کیا ہے کہ یہ غالب کا نہیں بلکہ کسی اور شاعر کا ہے۔

(25) منتخب التواریخ۔ جلد سوم۔ کلکتہ۔ 1865ء۔ ص 142

(26) ایضاً۔ جلد دوم۔ انگریزی ترجمہ۔ 1924ء۔ ص 266

(27) آئین اکبری۔ جلد اول۔ ص 175

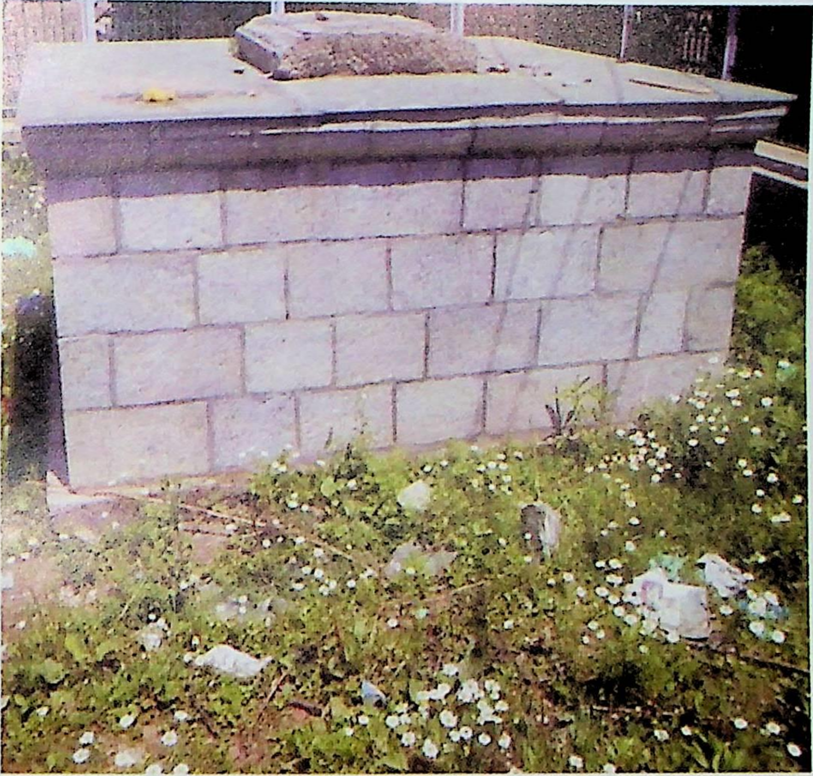
(28) مصدر الآثار قلمی۔ رضا لائبریری رامپور۔ مخطوطہ نمبر 424۔ ص۔ 219-220

غنی کشمیری
سوانح اور شخصیت

سلاطین مغلیہ میں سے شاہجہان کو تخت نشین ہوئے تین سال گذر چکے تھے کہ کشمیر کے مطلع تابان سے شیخ یعقوب صرفی اور ملا محسن فانی کے بعد ایک اور روشن ستارہ طلوع ہوا۔ ملک کے اس فرزند نے شہر سری نگر کے ایک گمنام محلّہ میں 1040 ہجری مطابق 1630 عیسوی میں جنم لیا۔ بچّے کا نام اس مناسب [illegible] محمد طاہر رکھا گیا کہ اُسے کشمیر کے ایک باکمال بزرگ حضرت شیخ [illegible] کے مجلسی مصاحب حضرت خواجہ طاہر رفیقی اشائی سہروردی سے روحانی عقیدت تھی (1) اور بعد میں یہ اقبال مند بیٹا غنی کشمیری کے نام سے مشہور ہو کر دور و نزدیک کا محبوب شاعر بن گیا۔

غنی کے آبائی قبیلہ اشائی کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ سروالٹر لارنس کے بقول اس گروہ کے لوگ اصل میں مغل تھے (2) پیر حسن شاہ کا کہنا ہے کہ اشائی قبیلہ خراسان کے ایک گاؤں اشاور سے بھاگ کر کشمیر میں آبسا۔

غنی کے خاندان کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔



قدیم شہر سرینگر کے محلّہ سید حسن بلادوری (نزد راجویری کدل) میں غنی کشمیری کا ویران اور خستہ حال مقبرہ

صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس کے والدین آسودہ حالی اور فارغ البالی کے دن گذارتے تھے۔غنی کے چھوٹے بھائی محمد زمان نافع سے متعلق دو چار سطریں اس حوالے سے تذکروں میں پائی جاتی ہیں کہ نافع بھی شاعر تھا۔اس کے یہ اشعار نمونہ کے طور پر پیش ہیں:

مگیر لذت دنیائے شور و شرزدہ را
مزاج زہر بود نعمت نظر زدہ را
مے کشی و باز مے پرسی شہید کیستی؟
ایں غلط اندازی و بازی بہ مامے زیبدت
پیر گشتی نافع اکنوں ہالہ ساں شب تاسحر
خرمنِ ماہی در آغوش دوتا مے زیبدت

ملا شیخ محسن فانی کشمیری مشہور صاحب کمال عالم اور حضرت شیخ یعقوب صرفی کے بھتیجے تھے۔فانی نے کشمیر میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا اور سینکڑوں طلباء اُن سے سیکھتے اور نام پاتے رہے۔شہزادہ داراشکوہ فانی کا خاص قدردان تھا جس نے اپنے اس منظور نظر فلسفی شاعر کو کچھ عرصہ تک اپنی صحبت میں بھی جگہ دی۔ بعد میں فانی کشمیر کے قاضی القضاۃ قرار پائے۔لیکن درس دینے کا سلسلہ پھر بھی جاری رکھا۔آخر 1082 ہجری یعنی 1671 عیسوی میں وفات پائی۔مصرعہ تاریخ وفات یوں ہے:

رفتہ فانی بہ عالمِ باقی

صنف سخن گوئی میں غنی اور نافع دونوں نے اسی فانی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔البتہ اس بات میں اختلاف رائے موجود ہے کہ دیگر علوم وفنون کے حصول میں بھی فانی ہی غنی کے استاد تھے یا اس نے محض اپنے پرشوق اور نکتہ شناس ذہن کی بدولت ہی سب کچھ سیکھ لیا۔"شمع انجمن" کے مولف کا کہنا ہے

''چوں طبع بلند داشت درکمتر روزگار حیثیتے شایستہ بہم رسانید وآخر بغاصی بحر سخن افتاد وجواہرے کہ بہ نقد جاں تواں خرید بیرون آورد''

فی الحقیقت اس بات میں استاد کی رہنمائی سے زیادہ شاگرد کی افتادِ طبع ہی کو دخل تھا کہ غنی ایک قلیل عرصے میں ایک بڑا شاعر بن کر آسمان شاعری پر چمکا۔ فانی کی صحبت میں سر حلقہ شاگردان بن گیا اور استاد کے لئے یہاں تک باعث فخر ہوا کہ بقول مرزا محمد افضل سرخوش ''ہر گاہ شیخ را مسلہ مشکل شدے از وے استفسار نمودے''۔ غنی نے اپنی موزون مزاجی سے علوم وفنون پر خود ہی قدرت بھی حاصل کر لی اور اس قابل بھی ہوا کہ دوسروں کو بھی سکھایا۔ ''تحایف الابرار'' میں درج ہے کہ ''نافع آداب طریقت از برادر خود ملا طاہر غنی حاصل نمود'' اور حسن شاہ کھویہامی کا کہنا ہے کہ ''برادر ملا طاہر غنی شاگرد ملا محسن فانی بود و از برادر خود کسب فیوض معانی نمود'' (3)

غنی کے احوال حیات قلم بند کرنے میں جس بخل اور بے توجہی سے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے کام لیا ہے۔ اس سے بڑا سانحہ فارسی دان حلقے اور خاص کر کشمیریوں کے لیے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں لے دے کے گنتی کے چند ایک تذکرہ نگاروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے جنہوں نے غنی کی حیات اور فن کے بارے میں اس قدر قلیل اور بے ترتیب مواد جمع کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ من جملہ ان تمام تذکروں سے بھی غنی کی زندگی کے واضح پہلوؤں یا اہم واقعات کی کوئی نقاب کشائی نہیں ہو پائی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے غنی کے متعلق ایک دوسرے کی سالم وثابت تحریریں اپنی اپنی تالیفات میں بعینہ دوہرائی ہیں۔ مثلاً سرخوش کی یہ عبارت ''ملا طاہر غنی صاحب طبع عالی بود پایہ سخن وری را بدرجہ کمال رسانیدہ از خطہ کشمیر بلکہ از اقلیم ہند ہم چو اوخوش خیال نازک ہند بر نخاستہ واکثر از معاصرین ومتاخرین قایل بخوش

کلامی بودہ اند" بلگرامی صاحب نے بھی "ماثر الکرام" میں ہو بہو نقل کی ہے۔ اسی طرح "ریاض الشعراء" کے مصنف علی قلی والہ داغستانی نے بھی غنی پر دو چار الفاظ تحریر کر کے دم لیا ہے۔

غنی جب 1060 ھ میں اپنی عمر کے بیسویں برس میں داخل ہوا تو شاعری شروع کی اور گوشہ گمنامی سے باہر نکل آیا۔ شاید اسی وقت سے محمد طاہر نے غنی تخلص اختیار کیا۔ جس کے حروف کے اعداد سے بھی سال 1060 بنتا ہے۔ جیسا کہ سرخوش کا بھی کہنا ہے "غنی تاریخ شعر گفتن وابتدائے تخلص یافتن اوست" غنی نے شاعری شروع کرتے ہی اپنی رفعت تخیل اور بلندی طبع کے وہ جوہر دکھائے کہ معاصرین دنگ رہ گئے۔ اس میدان میں اترے ابھی اس جوان سال شاعر کو ایک ہی برس ہوا تھا کہ 1061 ہجری یعنی 1651 عیسوی میں ابوطالب کلیم کا انتقال ہوا۔ غنی نے اس سانحہ پر یہ فصیح و بلیغ اور معنی آفرین قطعہ قلم بند کیا:

حیف کز دیوار ایں گلشن پرید   طالبا آں بلبل باغ نعیم

رفت و آخر خامہ را از دست داد   بے عصا طے کردہ ایں راہ کلیم

اشک حسرت چوں نمے ریزد قلم   خاک برسر کرد قدسی و سل[illegible]

گفت تاریخ وفات او غنی   "طور معنی بود روشن [illegible]

اوجِ تخیل کی ان فنکارانہ صلاحیتوں کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ غنی ازل ہی سے شاعری کا مزاج لے کر آیا تھا۔ تین سال بعد میر الٰہی ہمدانی کا انتقال ہوا تو غنی نے تاریخ وفات نظم کرنے کی غرض سے ایک اور بلند پایہ فن پارہ تخلیق کیا:

نیست دور از اثرِ صحبت او   کہ لبِ گور در آید بہ سخن

برسر خاکِ وی اربابِ زماں   جامہ پوشیدہ سیہ چوں سوسن

گفت تاریخِ وفاتش طاہر   برد الٰہی زجہاں گوئے سخن

اس ابتداء کو دیکھتے ہوئے جو توقعات غنی کے ساتھ وابستہ ہو سکتی تھیں اُس نے نہ صرف انہیں بطریقِ احسن پورا کیا بلکہ اس کا قلم بتدریج کمال کی حدوں کو چھوتا ہوا حدِ کمال کو پہنچ گیا۔

غنی کا زمانہ سرزمین کشمیر میں فارسی علم و ادب کا دورِ زریں کہلایا جاتا ہے۔ شعر و سخن کی محفلیں ہر جگہ منعقد ہوا کرتی تھیں اور اصحاب اقتدار اور امراء کے ہاتھوں شاعروں کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ مغل بادشاہوں کو ابتدا ہی سے علم و ادب کے ساتھ والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کے درباروں کو شعراء اور فضلاء نے بار بار رونق بخشی ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسی حوصلہ افزائی کی بدولت مغلیہ دور نے وہ عالم و فاضل پیدا کیے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی حیثیت میں معجز نما صلاحیتوں کے کمالات دکھائے ہیں۔ غنی کے دور میں بھی شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی طرف سے جو مغل حکام کشمیر میں تعینات ہوئے۔ خوش قسمتی سے اُن سب میں سخن گوئی کا ذوق اور سخن شناسی کا وصف بدرجۂ اتم موجود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کی وادی ہند اور ایران کے اکثر و بیشتر شعراء کی محبوب جگہ بن گئی اور وادی کے در و دیوار محمد قلی سلیم، عنایت اللہ خان آشنا، مولانا ذہنی، اوجی کشمیری، طغرائی مشہدی، مولانا فصیح، میر الٰہی، مولانا فہمی، محمد صالح ندیم کشمیری، بدیع، خواجہ ہاشم، قاضی محمد عارف، محمد رفیع منشی، غلام رسول استغنا کشمیری اور ضیاء الدین بدایونی جیسے سخن سنجوں کے شیریں نغموں سے گونجنے لگے۔ ان شعراء میں مقامی سخن وروں کے علاوہ باہر کے کچھ ایسے شعراء بھی شامل تھے جو دربارِ شاہی سے وابستہ رہے اور وقتاً فوقتاً حکام کے ساتھ ان کی دعوت پر کشمیر آئے۔ 1042ھ بمطابق 1632ء میں ظفر خان احسن کشمیر کا سربراہ ہو کر یہاں آیا تو صائب اصفہانی کو بھی اپنے ہمراہ لایا۔ احسنؔ خود بھی شاعر تھا اور شاعروں کا گرویدہ بھی۔ کشمیر کی تعریف اور یہاں کے قدرتی نظاروں سے متعلق

اس کا کلام کنول کے پھولوں ۔ڈل جھیل ۔کنارۂ ڈل کے باغات ۔جھیل مانسبل ، زعفران زاروں ، آبشاروں اور ایامِ خزاں کی رنگینوں پر لکھی ہوئی فارسی نظموں پر مشتمل ہے ۔نمونہ کلام یہ ہے:

دِلم به کوئے تو امید وار مے آید
نگاه دار که روزے بکارمے آید

اسی طرح شاہجہاں کے ساتھ ملک الشعراء ابوطالب کلیم وارِد کشمیر ہوا اور شہنشاہ کی واپسی کے بعد بھی اجازت لے کر پینشن پا کر تادمِ مرگ اسی سرزمین کا ہو رہا ۔ظفر خان کو جب کشمیر کی گورنری سونپی گئی تو اس کے مصاحبوں میں ساداتِ ایران کا مشہور شاعر میر الٰہی بھی تھا ۔1073ھ مطابق 1662ء یعنی اورنگ زیب کی حکومت کے چوتھے سال میں میر ضیاء الدین حسین بدخشی نے کشمیر کی حکومت سنبھالی ۔پرہیزگار اور متقی ہونے کے سبب بادشاہ سے اسلام خان کا لقب پایا ۔خود شاعر تھا اور ہم عصروں میں غنی سے خاص طور پر رغبت رکھتا تھا ۔غنی نے بھی اپنے وقت کے تمام حکام میں سے صرف اسلام [illegible] اپنی خلوت نشینی پر ترجیح دی ہے ۔اسلام خان کشمیر ہی میں [illegible] 1074 1663ء میں راہی ملکِ عدم ہوا تو غنی نے ان الفاظ میں اپنے اس محبوب [illegible] دوست اور مشفق کا ماتم کیا:

شد نفس ناله درگلو مارا
ہمچو نے زیں مصیبتِ جا نکاه
جست ایں مصرعه از زبانِ غنی
مُرد اسلام خان والا جاه

مرزا صائب جب کشمیر سے واپس ایران گیا تو اس نے وہاں بھی غنی کے

نام کی شہرت سنی۔ دریں اثنا جب اس کے گوش گزار غنی کا یہ شعر ہوا:

موئے میان تو شدہ ''کرالہ پن''
کرد جدا کاسۂ سرہا زتن

تو لفظ کرالہ پن کے معنی دریافت کرنے کا اس قدر مشتاق ہوا کہ دوسری بار خود کشمیر آیا اور جب شاعر سے اس کشمیری لفظ کی تشریح پوچھی تو غنی نے جواب دیا ''کرالہ پن نامہ رشتہ ایست کو کوزہ گراں کاسہ راز چرخ بدوُ جدا مے سازند (5) اس واقعہ کی صداقت پر شک بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایران کے ملک الشعراء کے لئے یہ بات قابل قبول تھی کہ وہ محض ایک لفظ کے معنی پوچھنے کشمیر آنے کی صعوبت برداشت کر لیتا۔ چونکہ اکثر تذکرہ نگاروں نے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تقریباً سبھی نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے لہٰذا اسے عام طور پر صحیح تصور کیا جاتا ہے۔ الغرض ذکرِ غنی اس واقعہ کے بغیر بالکل اسی طرح نامکمل رہتا ہے جس طرح حافظ اور تیمور کی مبینہ ملاقات کا ذکر کئے بغیر حافظ کے سوانح تشنہ تکمیل رہتے ہیں۔ صائب نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جب اس نے غنی کا یہ شعر پڑھا:

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہم رنگِ زمیں بود و گرفتار شدم

تو سراپا نیاز ہو کر بولا ''کاش ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بہ غنی مے بخشید ند وایں یک بیت حوالہ بمن مے کردند'' (6) اسی طرح ایک اور دفعہ کا ذکر ہے کہ مرزا صائب کہیں باہر گیا تھا اور اس کی بیاض گھر میں کھلی پڑی تھی۔ ایک شخص اسے اٹھا کر غنی کے پاس لایا۔ غنی نے دیکھا کہ بیاض میں درج ایک شعر کا مصرعۂ اول غائب ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں تھا:

کہ از لباسِ تو بوئے کباب مے آید

غنی نے فی البدیہ شعر کو اس طرح پورا کیا:

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت

کہ از لباسِ تو بوئے کباب مے آید!

واپسی پر جب صائب نے یہ دیکھا اور اسے پتہ چلا کہ مصرعہ غنی نے لکھا ہے تو خواہش ظاہر کی "کاش کہ صائب دیوانِ یک مصرعہ مے نگاشتے و تضمینش ملا غنی مے کردے"۔ اس کے بعد مرزا صائب غنی کا اس قدر گرویدہ ہوا کہ اپنی ذاتی بیاض میں اس کے دو سو سے زائد اشعار درج کئے جنیں پڑھ کر وہ وقتاً فوقتاً محظوظ ہوتا تھا۔ (7)

اس عالمِ عقیدت مندی اور قدر شناسی میں بھی غنی نے کسی بادشاہ یا نواب کی تعریف و توصیف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا ورنہ یہ بات چنداں مشکل نہ تھی کہ وہ دربارِ شاہی میں اشعر الشعراء بن جاتا اور انعام پر انعام پاتا لیکن وہ بہر صورت اپنے ہی حال میں مست و مدہوش رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلیم کا ایک قصیدہ پسند آنے پر شاہجہاں نے اسے ایک ہزار اشرفیاں اور خلعتِ فاخرہ عطا کی تھی اور اسی دور میں صائب کو ایک نواب سے صرف ایک شعر کے صلے میں پانچ ہزار اشرفیاں ملیں جو اس نے ایران سے یوں لکھ کر بھیجا تھا:

دور دستاں را بہ احسان یاد کردن مشکل است

ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر مے افگند

لیکن غنی کسی کی خیرات لے کر اس کی مداح سرائی کرنا کیسے گوارا کر لیتا جب کہ خود اس کے ایک ایک شعر کی مدح خوان ساری دنیا تھی:

غنی چرا صلہ شعر از کسے گیرد

ہمیں بس است کہ شعرش گرفت عالم را

"تاریخ جدولیہ" میں مذکور ہے کہ غنی نے ایک بار شاہ جہاں کے دربار

میں قصیدۂ ثنا خوانی پیش کیا اور ہزار روپیہ انعام پایا (8) لیکن اس بات کو محض غلط بیانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ واقعہ غنی کا نہیں بلکہ محمد علی فروغی کا ہے جس نے 1062ھ مطابق 1651ء میں شاہ جہاں کی آمد کشمیر کے موقعہ پر جب وہ چوتھی اور آخری بار یہاں آیا۔ ایک قصیدہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جس پر اُسے ہزار روپیہ انعام ملا اور حکم شاہی کے موجب بارہ روپیہ فی یوم روزینہ بھی مقرر رہوا۔

شہنشاہ ہند اورنگ زیبؔ عالمگیر نے غنی کا کلام سنا تو عش عش کر اٹھا اور شاعر سے ملاقات کا مشتاق ہوا۔ 1079ھ بمطابق 1686ء کے دن تھے۔ کشمیر میں سیف خان کی گورنری تھی۔ گورنر کو شہنشاہ کا حکم ملا کہ غنی کو بہ تکریم و تعظیم دربار میں لایا جائے۔ سیف خان نے جب غنی کے سامنے بادشاہ کی خواہش کا اظہار کیا تو جواب ملا ''شہنشاہ کو لکھ دو کہ غنی دیوانہ ہو گیا ہے'' سیف خان کو تعجب ہوا کہ بھلا ایک صاحبِ ہوش وخرد اور مردِ دانا کو سودائی کیسے کہوں۔ غنی نے اسی لمحے کپڑے پھاڑ ڈالے اور دیوانوں کی طرح حاکمِ کشمیر کے بھرے دربار سے نکلا جس کے تین دن گذرنے کے بعد ہی اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔ سرخوشؔ کے استاد محمد علی ماہرؔ نے تاریخ وفات یوں بیان کی:

چو دادش فیض صحبت شیخ کامل محسنِ فانیؔ
غنی سر حلقہ اصحابِ او در نکتہ دانی شد
تہی چوں کرد بزم شیخ را گفتند تاریخش
کہ آگاہے سوئے دار بقا از دارِ فانی شد

غنی کے مدفن کے بارے میں کچھ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا۔ ایک رائے کے مطابق آپ ''در مقبرہ ملا محسن فانی آرمیدہ'' (9) مرحوم مولانا حیرت کاملی سے راقم نے سنا ہے کہ غنی کا مقبرہ سری نگر کے ایک گم نام محلّہ شاعرواری میں

ہے۔ یہ محلّہ کوہ ماران کے مغرب میں قلعہ کی فصیل کے باہر ہی واقع ہے۔ اس میں ایک خستہ حال قبر بھی ہے جسے عام طور پر حضرت ادہم صاحبؒ کی زیارت کہتے ہیں۔ لیکن اس محلّہ میں آج کسی ایسی قبر کا نشان نہیں ملتا جسے غنی کا مدفن کہا جا سکے۔ البتہ معتبر طور پر معلوم ہوا ہے کہ غنی اپنے ہی محلّہ اشائی کوچہ متصل راجوری کدل میں محلّہ سید حسین بلادوریؒ کے شمال مغرب میں ساتھ ہی ایک قبرستان میں دفن ہے جو غنی کا خاندانی مقبرہ رہا ہے۔ سنگ مزار کی ڈاکٹر صوفی نے نشاندہی بھی کی ہے (10) لیکن انہوں نے غلطی سے اس جگہ کا نام قطب الدین پورہ لکھا ہے جو عالی کدل کے پاس واقعہ ہے۔ آج یہ قبر شکستہ حالی کی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ جدید محقق محض قیاس کی بنا پر ہی کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ جس طرح حافظ شیرازی نے اپنے مقبرہ کے بارے میں یہ شعر کہا تھا جو بعد میں واقعاتی لحاظ سے بالکل درست ثابت ہوا:

بر سرِ تربتِ ما چو گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

اسی طرح غنی نے اپنے مزار کی ناگفتہ بہ حالت کا اندازہ کرتے ہوئے پیشین گوئی کی تھی کہ:

ہم چو آتش روشن از من بود ہر شمع مزار
من کہ مُردم کس چراغے بر سرِ خاکم نسوخت

غنی کی وفات کے بعد محمد علی ماہر نے 1102ھ بمطابق 1690ء میں دیوانِ غنی کو نقل کیا۔ اگرچہ اس سے قدیم تر ایک نسخہ کا بھی پتہ چلا ہے جو 1081ھ بمطابق 1670ء میں لکھا گیا ہے (11) ماہر کا رقم کردہ نسخہ دیوان بعد میں غنی کے دو شاگردوں مسلم اور لالہ ملکِ شہید کے ہاتھوں ترتیب پا کر 1261ھ بمطابق 1845ء میں لکھنؤ کے مصطفائی پریس سے چھپ کر نکلا۔

مسلم دیوان کی تمہید میں لکھتے ہیں ''چوں کہ ایں ہیچ مدان کج مج زبان بجناب آں مغفور نسبتِ شاگردی داشت واز صحبت دائمش علمِ مفاخرت می افراشت خواستم باتفاقِ خادم الفضلاء و ملک الشعراء سر حلقہ شاگردانِ رشید ملک شہید بہ تدوین دیوانِ سحر بیانش حقِ شاگردی بہ تقدیم رسانم و بہ شاگردئی اور کودر اوستادِ عالمے گردانم وقصد آں کردم کہ بیت بیت و مصرع مصرعش از ہر جا بہم رسانیدہ بصورتِ دیوانے جمع آرام وایں ریز ہائے خوانِ احسانش در سفراہ اخلاص بگذرام کہ ہر کس ازیں نعمت روحانی بہرہ بردارد آں مغفور رابفاتحۂ خیری یاد آردو مرانیز محروم نگذارد'' (12)

غنی کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے خداداد کمال کا ملک تھا جس کی بدولت بسیار گوئی کے باوجود اس کے ایک شعر میں بھی کسی قسم کی سطحیت یا فن کی ذرہ بھر کمی نہیں پائی جاتی۔ اس کا ایک ایک مصرعہ ادبِ عالیہ کا ایک نمونہ ہے۔ اگرچہ فارسی ادب کا یہ بیش بہا سرمایہ زمانے کی دست برد سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکا ہے لیکن غنی کے صرف وہی دو ہزار اشعار جو مذکورہ دیوان میں درج ہیں، فارسی زبان کے کسی بھی مجموعہ غزلیات سے کم پایہ کے نہیں۔

دیوانِ غنی کے علاوہ ایک رزمیہ نظم کا بھی غنی سے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے جس میں اورنگ زیب اور اس کے بڑے بھائی داراشکوہ کی جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صوفی نے اس مثنوی کا مسودہ دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کی طرز بیان غنی سے بالکل جدا ہے اور اس میں جو اشعار شاہ جہاں کی مداح میں کہے گئے ہیں۔ ان کی غنی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ امکانِ غالب ہے کہ اس جنگ نامے کا مصنف کوئی اور غنی ہوگا ملاّ طاہر غنی نہیں (13) واللہ اعلم بالصواب۔

غنی کا سال وفات اگرچہ عام طور پر 1079ھ بیان کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے عینِ شباب میں انتقال کیا جیسا کہ سرخوش کا بھی بیان ہے کہ ''مرغِ روحش درعینِ شباب بسر پنجۂ شاہین اجل گرفتار گردید'' لیکن غنی نے ''دربیانِ ضعفِ پیری وسفید گشتنِ مو'' بہت سے ایسے اشعار لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر کوئی مشکل سے کہہ سکتا ہے کہ ان میں ذاتی تجربات اور حقیقی واردات کا بیان موجود نہیں ہے۔ مثلاً:

آدمی در عہدِ پیری بے خرد گردو غنی
مے شمارم طفل خودرا ریخت تا دنداں مرا



موئے سرگردم سفید اما خیالم درسر است
اخگرِ پنہاں تہہ ایں تودۂ خاکستر است



ریخت دنداں ز دہن رفت جوانی برباد
آہ زیں ژالہ کہ در مزرعِ بختم افتاد



جاں بلب از ضعف نتواند رسید
ما بہ زور ناتوانی زندہ ایم



ز پیری چناں گشتہ ام ناتواں
کہ دنداں بہ جنبد بہ جائے زباں



موگشت سفید وہ ریخت دنداں
در صُبح شود ستارہ پنہاں



موئے سیہم سفید گردید و ہنوز
وقف زسفیدی و سیاہی نشدم

نیز اس مضمون میں یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

بگذشت عمر و موئے سفیدے بجا گذاشت
خاکسترے ز قافلہ یادگار ماند



تکیہ از ضعفِ بدن ہر چند دارم بر عصا
برنمے خیزم زجائے خویشتن چوں نقش پا

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غنی کی عمر اُنتالیس سال سے زیادہ تھی اور وہ عالم پیری میں فوت ہوا ہے۔

اگرچہ اس کے سالِ وفات کو اس لحاظ سے معتبر مانا جائے کہ معاصرین نے غنی کی وفات پر تاریخیں لکھیں لیکن ہمیں یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ اس کی پیدائش 1040ھ سے کم از کم دس سال قبل ہوئی ہے۔ چنانچہ اخیر عمر میں ضعفِ بصارت کے مارے غنی نے عینک بھی استعمال کی ہے جس کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے:

لشکر ضعف بسر تاخت مگر برسر او
کہ ز عینک بکف آورد سپر دیدۂ من

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے غنی کی شخصیت اس لحاظ سے مغلیہ دور کے تمام شعراء میں ایک مثالی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے مغل سلطنت کے

عظیم الشان دربار کا کوئی اثر نہیں لیا اور نہ ہی اس کی خودداری نے یہ گوارا کیا کہ وہ شاہی انعام واکرام سے بہرہ ور ہونے کی خاطر حکام وقت کی قصیدہ خوانی کرے۔ اس کے برعکس اس نے خودشناسی کے فلسفے کو سمجھا اور عمر بھر اگر کسی چیز نے اسے مرعوب رکھا تو وہ موت کا لاینحل مسئلہ تھا۔ غنی نے ہمیشہ مشیت الٰہی کو اپنی نظروں کے سامنے رکھا اور کل نفس ذائقۃ الموت کے پیشِ نظر اُس کا سب سے گہرا یقین یہ رہا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور دنیا کی تمام سہولیات اور آسائشیں انسان کا کچھ بھلا نہیں کر سکتیں۔ انسان کو اپنی ہمت بازد اور فقر وغنا پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیئے تا کہ اس کی گردن اربابِ حل وعقد کی عارضی نوازشوں کے بوجھ سے دبنے نہ پائے اور وہ دین و دنیا میں سرخ رو کہلائے۔ انسان کی فانی زندگی کے چند عارضی لمحوں کی بنیاد پر سطوت وحشمت کے بلند مینار کھڑا کر دینا غنی کے دائرۂ فلسفہ سے باہر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے وقتاً فوقتاً خوفِ عقبیٰ اور موت پر ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جنہیں پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ غنی نے اپنی زندگی کو ہوا کے ایک گذرنے والے جھونکے سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ مثال کے طور پر:

تابوتِ مردۂ دوش ہشیار کرد مارا   پائے بخواب رفتہ بیدار کرد مارا
غافل مشوز عاقبتِ کارِ خود غنی   دل نہ بخواب مرگ کہ دنیا فسانہ ایست
بر روئے زمیں ہیچ کس آسودہ نباشد   گنجے بود آرام کہ در زیر زمیں است
جز زیرِ خاک جائے منِ خاکسار نیست   روئے زمیں زمردمِ بالانشیں پر است
غنی زیرِ زمیں اہلِ فنا را   بود عیشے کہ بر روئے زمیں نیست
رسد بگوشِ من ایں حرف ہر دم ازلبِ گور   بیا کہ خاک زشوقِ تو چشم در راہ است

غنی نے عمر بھر گوشہ نشینی کے گیت گائے ہیں اور فی الحقیقت وہ خلوت ہی میں اپنے دن گذارا کرتا تھا۔ اس کی لاابالی طبیعت نے نہ تو کسی کے آگے ہاتھ

پھیلانے کی زحمت برداشت کی اور نہ ہی اس نے اپنے ہم عصر علماء اور فضلاء کی بارعب صحبتوں اور مجلسوں میں اپنی جگہ کو پر کرنے کی پروا کی۔ اس خلوت نشینی کے دوران غنی کا یہ روزمرہ رہا ہے کہ بغیر کسی جھنجھٹ کے شاعری کرے اور یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ شہرت کی غنی کو کوئی تمنا نہیں تھی بلکہ اس کے مطابق اصل شہرت خلوت نشینی ہی کی دین ہوتی ہے۔ ان اشعار میں بھی اس فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دامِ عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نامِ عنقا را



ہر چند غنی خانہ نشیں ہمچو نگین است
نامش ز در بستہ بر آمد چہ تواں کرو



کے رام تواں کرد غنی گوشہ نشیں را
در دستِ کسے صورتِ دیوار نیامد



کردہ زجہاں شغلِ سخن گوشہ نشینم
تاخامہ مسافر شدہ من خانہ نشینم

اس سلسلے میں غنی کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ جب اپنے حجرہ میں ہوتا تو اسے اندر سے مقفل کر دیتا اور جب باہر جاتا تو دروازے کو کھلا چھوڑ کر جاتا۔ کسی نے جب اس کی وجہ پوچھی تو غنی نے جواب دیا کہ ''مکان کا سرمایہ تو میں خود ہوں۔ جب کمرے میں ہوتا ہوں تو اسے اندر سے بند کر کے اپنی حفاظت کرتا ہوں اور جب میں ہی کمرے میں نہ ہوا تو اسے مقفل کرنے کا فائدہ کیا''

علامہ اقبالؔ نے اس واقعہ کو ایک لطیف پیرائے میں یوں نظم کیا ہے:

غنی آں سخن گوے بُلبُل صفیر　　نواسنجِ کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود دربستہ داشت　　جو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے　　عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر　　فقیر و باقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست　　دریں خانہ جز من متاع کجاست
غنی تانشیند بہ کاشانہ اش　　متاع گرانے ست درخانہ اش
چوآں محفل افروز درخانہ نیست　　تہی ترازیں ہیچ کاشانہ نیست

سرخوشؔ کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ غنی نے اس مناسبت سے غنی تخلص اختیار نہیں کیا کہ اس کے حروف سے ایک ہزار ساٹھ کے اعداد بناتے ہیں اور اسی سال اس نے شاعری شروع کی۔ ظاہر ہے کہ ہر نام سے کوئی نہ کوئی عدد بنتا ہے۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ غنی کے حروف کی تعداد سے شاعری کی زندگی کا وہ سال بنتا ہے جسے تذکرہ نگاروں نے اس کے آغازِ سخن گوئی کا سال بتایا ہے۔ بجائے اس کے ''غنی'' کے حروف پر غور کیا جائے۔ ہم اس تخلص کو اپنی معنوی حیثیت میں لیں گے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے غنی کی ذات فقر و غنا کا مرقع تھی۔ وہ ایک ایسا فقیر تھا جسے اقبالؔ نے ''اقلیم معنی کا امیر'' بتایا ہے۔ لفظِ غنی شاعر کو اپنے اوصاف کا ترجمان نظر آیا اور اس نے یہی تخلص اختیار کیا۔

اب دیکھئے کہ فقر و غنا کی تعریف اور اپنے استغنا کا ذکر شاعر کس طرح کرتا ہے:

غنی از دولتِ دنیا نگر دد عیبِ کس زائل
کہ زر نتواند از روئے محک بردن سیاہی را



ہر کہ زد چوں من قدم در راہِ استغنا غنی
اطلسِ گردوں بہ پائے ہمتش پاتا بہ ایست



غنی اگرچہ فقیر است ہمتے دارد
فشاندہ است بکونین دستِ خالی را



در علمِ فقر ہر کہ شد استاد چوغنی
برداشت نسخہ ازورق بوریائے ما



چوں مہ نو کہ نگر د دز شفق ہرگز سرخ
ناخنِ ہمت من رنگ نگر دد ز حنا



ما بہ فقر و فاقہ خر سندیم ہمچو آسیا
گر رسد روزی غبارِ خاطر ما مے شود

اس عالم فقر وخلوت میں غنی کوزیادہ تر سماع کے ساتھ دلچسپی تھی:

در سماعِ نغمہ چاک از بس کہ شد پیراہنم
درلباسم غیرتارِ چند چوں طنبور نیست

غنی نے اپنی عمر کا تقریباً سارا حصہ اپنے حجرہ ہی میں گذارا۔ تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے کہ غنی سفر کو بھی نکلا ہے لیکن اس کے دیوان میں چند ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے صریحاً پتہ چلتا ہے کہ اسے سفر کو بھی جانا پڑا ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ سفر غنی نے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں کیا ہوگا۔ لیکن حال یہ ہے کہ حب الوطنی کی کشش اور اپنے باغ کشمیر کی یاد

قدم قدم پر شاعر کو ستاتی رہی:

بسکہ شد زنجیر پایم رشتہ حب الوطن
در سفر دائم چو سوزن چشم دارم درقضا
برنگ آبلہ پائے در سفر مارا
زشوقِ صبح وطن چشم تر سفید شداست
در سفر ہمرہم غمِ وطن است
گل با خار چیدہ را مانم
کرداست ہوائے ہند دلگیر مرا
اے بخت رسان بباغِ کشمیر مرا
گشتم زحرارتِ غریبی بے تاب
از صبحِ وطن بدہ طباشیر مرا

اور جب سفر سے واپس آیا تو گھر میں اس طرح سے خلوت نشینی اختیار کی کہ دوبارہ باہر جانے کا نام تک نہ لیا۔

پا بس کہ کشید در سفر رنج
شد خانہ نشین چو اسپ شطرنج

صائب اور دیگر مشاہیر شعراء نے اپنے وقت میں غنی کی بہت سی غزلوں کی زمین میں غزلیں لکھیں لیکن غنی کے عالمِ خودداری کا یہ عالم تھا کہ اُس نے کسی ہم عصر کی ردیف میں کوئی غزل لکھنا گوارا نہ کیا کیونکہ اس کا عقیدہ تھا کہ:

غنی طرح سخن خود کن اگر میل سخن داری
چرابايد تصرف در زمین دیگراں کردن

اور کسی نے جب غنی سے رفیع کی طرح میں غزل لکھنے کو کہا تو غنی نے بڑی بے باکی سے یہ جواب دیا:

نگفتہ ایم غزل در زمین طرحِ رفیع
کہ مے شود سخنِ مادریں زمیں کم سبز

دیوانِ غنی میں صرف ایک رباعی ایسی نظر آتی ہے جس میں شاعر نے حضرت بوعلی قلندرؒ کی عظمت کو تسلیم کر کے ان کی مدح سرائی کی ہے۔ یہ رباعی پڑھ کر غنی ان سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ شاعر نے حضرت بوعلی کو شاعری میں تمام اہلِ سخن سے برتر درجہ دیا ہے:

از اہلِ سخن کس بہ قلندر نرسد　　در شعر باو عرفی و سنجر نرسد
ہر مصرعِ اوبس کہ بلند افتادست　　ترسم کہ باو مصرعِ دیگر نرسد

زمانے نے غنی کی قدر نہ کی اور وہ بھی زمانہ سے شکوہ کیئے بغیر نہ رہا۔ در اصل اس میں اس کی اپنی افتادِ طبع کو زیادہ دخل تھا۔ ایک طرف اگر اس نے اربابِ حل وعقد کی منت اٹھانا اور ان کی قصیدہ گوئی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا تو دوسری طرف اس نے ''دہر نا امن گشتہ'' کی نوحہ خوانی بھی کی۔ اس قسم کے طبعی یا فکری تضاد کی توقع ایک ایسے شاعر سے رکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں جو کبھی اپنے حواس کھو دیتا ہے اور کبھی دوسروں کی بے حسی پر خندہ زن نظر آتا ہے۔ کبھی خانہ نشینی ہی کو اپنے لئے سلامتی کا باعث سمجھتا ہے اور کبھی دنیا میں ایک انقلاب کی خواہش کرتا ہے:

دہر نا امن چناں گشتہ کہ چوں مردمِ چشم
تا درِ خانہ نہ بندم نہ برد خواب مرا
غنی در ملکِ دنیا انقلابے آرزو دارم
کہ خاک از گردشِ گردوں غبارِ آسیا گردد

اس قسم کا تضاد ہمیں اس وقت بھی نظر آتا ہے جب غنی اپنی شاعری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ اشعار پڑھیے۔

نگر دو شعر من مشہور تا جاں در تنم باشد
کہ بعد از مرگ آہو نافہ بیروں مے دہد بورا
شعر دگراں راہمہ دارند بخاطر
شعرے کہ غنی گفت کسے یاد ندارد

اوران ابیات پر توجہ دیں:

بود گویا طفلِ نو رفتار شعر تازہ ام
از زبانم تابروں شد برزبانہا اوفتاد



چناں نامِ من روشناس است درہند
کہ نقشِ نگیں درمیان سیا ہے

غنی کے سوانح کی روشنی میں اس کی شخصیت کو پہچاننے سے صاف نظر آئے گا کہ اس کی ذات اگرچہ مجموعہ اضداد نہیں تھی لیکن اس کی طبعی امنگوں اور ذہنی افتادوں کی جولانیاں ایسے ایسے نقوش ذہن پر کندہ کر دیتی ہیں کہ اسے ایک بڑے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان کا بھی درجہ دینا پڑتا ہے۔



حوالہ جات:

(1) کشمیر:۔جی ایم ڈی صوفی۔ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور۔ 1949ء،ص463

(2) ویلی آف کشمیر، سر والٹر لارنس، کیسر پبلشرز سری نگر۔

(3) تاریخ حسن، جلد چہارم، 1960ء، ص26

(4) مراد محمد جان قدسی اور محمد قلی سلیم سے ہے۔ عہد شاہجہانی کے یہ دو مشہور شاعر کلیم کے زمانے میں گذرے ہیں اور تینوں سری نگر کے تاریخی مزار

الشعراء واقع در علاقہ در بجن میں مدفن ہیں لیکن سنگ مزار کی نشان دہی آج تک نہیں ہو سکی ہے۔

(5) تذکرہ شعراء، میر حسین دوست سنبھلی۔

(6) ایضاً

(7) دوست سنبھلی نے ان اشعار کی تعداد دو ہزار بتائی ہے۔

(8) نگارستانِ کشمیر کے مولف نے ہزار کے بارہ ہزار کر دئے ہیں۔

(9) یہ جملہ مورخ کشمیر مفتی سعادت شاہ پاندانی نے تاریخ اعظمی کے ایک مطبوعہ نسخہ میں ذکر غنی کے باب میں بطور حاشیہ درج کیا ہے۔

(10) کشیر، جی ایم ڈی صوفی، جلد دوم، ص362

(11): یہ نسخہ کشمیر کلچرل اکادمی سری نگر کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔

(12) دیوان غنی، لکھنؤ1845ء ص6

(13) کشیر، جلد دوم، ص465

☆☆☆

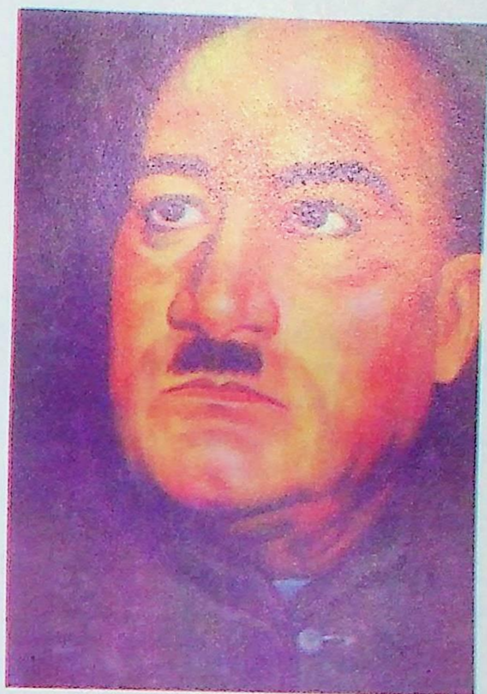
جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات

اردو زبان کے متقدمین سے لے کر آج تک کے ہم عصر شعراء نے وقتاً فوقتاً کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصیدہ خوانی کی ہے۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں برصغیر کے جو سخن ور کشمیر کے مدح خوان بنے اُن میں علامہ اقبالؔ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، چودھری خوشی محمد ناظر، فانی بدایونی، محمد دین فوق، جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری وغیرہ شامل ہیں۔

بعد میں عاشقانِ کشمیر کے اِس قافلے میں ساغر نظامی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، شاہد عزیز روش صدیقی، شاذ تمکنت، راہی معصوم رضا، وامق جونپوری اور شمیم کرہانی بھی شامل ہو گئے۔ روش صدیقی نے تو سرزمین کشمیر پر نازل شدہ حسن فطرت کی شکل میں الٰہی فیضان کی ثنا خوانی میں ایک پورا شعری مجموعہ ''خیاباں خیاباں'' تخلیق کیا۔

ان شاعروں نے یا تو بذاتِ خود کشمیر آ کر یا اُس کے بے پناہ حسن کی رنگارنگیوں کا بیان سن کر اس کی تعریف میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ اس طرح سے حافظ، غالبؔ، ذوق اور چکبستؔ بھی ذکرِ کشمیر سے دامن نہ چھڑا سکے اور بشمول عرفیؔ لاتعداد غیر کشمیری فارسی شعرأ نے بھی اس وادیٔ گلفام کی مدح سرائی کی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب سارے ہندوستان میں تحریکِ آزادی کا ڈنکا بج رہا تھا کشمیر میں بھی ایک ایسی ہی تحریک کا باضابطہ آغاز



شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی



حفیظ جالندھری

13 جولائی 1931 کو دودرجن کے قریب کشمیری شہداء نے اپنا خون بہا کر کیا تھا۔اسی خون سے سرزمین کشمیر جبر اور استبداد کے خلاف مبارزت کے جذبے سے سرشار ہو کر لالہ زار بن گئی۔

اس تحریک کے دم خم دیکھ کر اُس وقت کے برصغیر کے دو اہم شعراء کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے اس کارواں میں قلم کی جولانیوں کے سہارے شامل ہوگئے اور اس طرح علامہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری اہلِ کشمیر کی جنگ آزادی میں مجاہدین حریت کے رجز خوان بن گئے۔اِس دوران یہ دونوں عظیم المرتبت سخن گو کشمیر بھی آئے اور یہاں آکر کشمیر کی وہ تصویر اپنے قلم کے کینوس پر اُتاری جو انسانی ہزیمت، بیچارگی، پسماندگی اور اجتماعی بے کسی کی عکاس بن گئی۔

یہ جذبہ اُس وقت اور بھی اُجاگر ہوا جب جوشؔ اور حفیظؔ دونوں نے مختلف اوقات پر تحریک کے روحِ رواں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو اپنا منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حسن اتفاق کی بات ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی (1894-1982ء) اور حفیظؔ جالندھری (1900-1982ء) نے جو کچھ کشمیر کے حوالے سے اپنے شعری فن پاروں کی شکل میں تخلیق کیا اُس میں شیخ محمد عبداللہ کے لئے اُن کے منظوم قصائد کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔یہ دونوں شیخ صاحب کے شیدائی تھے اور وہ بھی اُن کے قدردانوں میں شامل تھے۔

اس ضمن میں جہاں جوشؔ نے شیخ محمد عبداللہ پر لکھی ہوئی ایک ہی لافانی نظم سے شیخ کو بھی ایک طرح کی جاودانی حیثیت عطا کر لی وہاں حفیظ بار بار عبداللہ کی تعریفوں میں نظموں پر نظمیں لکھ کر اپنی صریرِ خامہ سے مدھر اور دل نشین آوازیں اُبھارتے رہے۔

جوشؔ اور حفیظؔ کی اس قبیل کی منظومات میں مقابلتاً حفیظؔ کا کلام اکثر و بیشتر بے اثر اور فنی نزاکتوں کی حامل شاعری سے زیادہ نعرہ بازی ہی کی مثال پیش کرتا ہے، البتہ اُن کی ''تصویرِ کشمیر'' اور ''خون کے چراغ'' اہلِ کشمیر کو حفیظ کا بہترین نذرانہ ہیں۔

کشمیر کے حوالے سے جوشؔ ملیح آبادی کی چار نظمیں اور شیخ صاحب پر اُن کی نظم دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ رہ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے ایک دو قطعات بھی اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ان نظموں میں ''شیخ عبداللہ''، ''اے جوانانِ کشمیر''، ''اے جنت کشمیر''، ''فضائے کاشمر'' اور ''مناظر سحر'' جیسے نایاب فن پاروں کو محفوظ کرنے کی غرض سے یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کے پسِ منظر میں جوشؔ کے صرف یہ دو قطعات ہم تک پہنچ سکے ہیں:

ممنوعہ شجر سے لطفِ پیہم لینے
نیساں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو پھر کاشمر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

اور:

سنو اے بستگانِ زلف گیتی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

چونکہ قطعۂ ثانی 1946ء کی کشمیر چھوڑ وتحریک کے دوران لکھا گیا لہٰذا غالب امکان یہی ہے کہ یہ قطعہ بھی کشمیر ہی کے حوالے سے تخلیق کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شیخ محمد عبداللہ پر جوشؔ کی نظم شاعر نے سری نگر میں ایک مشاعرے میں پڑھی۔ جوشؔ کو شیخ صاحب سے زبردست عقیدت تھی اور کشمیری عوام میں اُن کی بے مثال مقبولیت کو دیکھ کر اس جذبۂ احترام میں اور اضافہ ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے جوشؔ نے دیکھا کہ شیخ صاحب سامعین میں خواتین کے ایک مجمع کے قریب بیٹھے ہیں تو انہوں نے شیخ کو آواز دی ''قبلہ! اب زنانے سے ذرا مردانے میں تو تشریف لائیے'' اور اُس کے بعد جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی گھن گرج والی آواز اور دلوں کو دہلانے والے پٹھانی لہجے میں شیخ محمد عبداللہ کے نام تحت اللفظ یہ سدا بہار نظم سنائی:

کشورِ ہند میں بحمد اللہ
میں ہوں جوشؔ ایک رندِ نامہ سیاہ
لعل و الماس سے دمکتی ہے
فقر کے باوجود میری کلاہ
میرے آگے وہ بحر ہے پایاب
نہیں ملتی خضر کو جس کی تھاہ
سرکشی کے طفیل وہ لا ہوں
نہیں بڑھتا جو سوئے لا الہ
طرح دارانِ شہر کا خادم
تاجدارانِ دہر کا بدخواہ
کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے
دیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ

رندِ ہوں رندِ نبھ نہیں سکتی
شیخ صاحب سے میری رسم و راہ
اُن کی محفل میں ہے چراغِ ثواب
میری محفل میں آفتابِ گناہ
اُن کی لوحِ جبیں پہ داغِ سجود
میرے آئینے میں تجلیٔ ماہ
ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا
جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ
جس کی ہر اِک روش ہے حسب مراد
جس کا ہر اِک اصول ہے دل خواہ
تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس
تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ
ہے وہ اس تیرہ دورِ باطل میں
حق نگہ، حق شناس، حق آگاہ
نام اس شیخ کا بتاؤں تمہیں
دلِ رنداں میں بھی ہے جس کی چاہ
چارہ گر رہنما غریب نواز
شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ
صرف اِسی شیخ سے محبت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ (1)

جوشؔ ملیح آبادی شخصی راج کی غلامی کے خلاف لاکھوں اہلِ کشمیر کی

جدوجہد کی حدت وحرارت محسوس کر چکے تھے اور اس مفلوک الحال اور ظلم و جبر کی چکی میں پسی ہوئی درماندہ قوم کو بیدار کرنے کی خاطر انہوں نے جو نظمیں تحریر کیں انہیں پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ شیرِ کوہستان شیرِ کشمیر کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے کشمیر میں اپنی لہراتی ہوئی بلند آواز کو اور بلند کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس کشمیر آ پہنچا ہے اور میر انیسؔ کے اُس مصرعے کی ہو بہو مثال پیش کرتا ہے جو انیسؔ نے حضرت حسینؓ کی صفات شجاعت بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے؟

"اے جوانانِ کشمیر"، "جنت کشمیر"، "مناظرِ سحر" اور "فضائے کاشمر" کو یہاں پر اُن کے مکمل متن کے ساتھ درج کیا جاتا ہے تاکہ کل کے تحقیق کاروں اور جوشیاتؔ کے طالب علموں کو اُن کے حب کشمیر کے حوالے سے اپنی تحقیقات کو ایک دستاویزی صورت بخشنے میں آسانی میسر ہو سکے:

اے جوانانِ کشمیر

اے جنت کشمیر کے بیدار جوانو
اے ہمت مردانہ کے ذی روح نشانو
سو بات کی یہ بات ہے اس بات کو مانو
جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو
بے غرق ہوئے کوئی اُبھرتا ہی نہیں ہے
جو قوم پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے
بے ذوقِ وفا کوئی تہمتن نہیں بنتا
بے سلسلۂ برق نشیمن نہیں بنتا

سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا
جنگل میں جو لذت کش پیکاں نہیں ہوتا
وہ شیر کبھی شیر نیستان نہیں ہوتا
سوتے ہوئے دھارے کبھی طوفاں نہیں بنتے
جو قید نہ ہوں یوسفِ کنعاں نہیں بنتے
مرتے جو نہیں عیسیٔ دوراں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ انساں نہیں بنتے
بے سوزِ نم اشک فشانی نہیں ملتا
بے آگ میں کودے ہوئے پانی نہیں ملتا
کمزور کو آسودگیٔ دل نہیں ملتی
جب تک نہ جلے، شمع کو محفل نہیں ملتی
کانٹوں سے جسے لذت کامل نہیں ملتی
اس رہروِ نااہل کو منزل نہیں ملتی
گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا
جب تک کہ ہر اِک ذرّہ پُر افشاں نہیں ہوتا
اِک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی رقصِ بہاراں نہیں ہوتا
جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا
جب تک دلِ یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رخسارِ زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

ہوتا ہے تلاطم کا اب آغاز جوانو
سیلاب میں در آؤ بصد ناز جوانو
یہ موج یہ گرداب ہے جانباز جوانو
دو وقت کی آواز پر آواز جوانو
دنیا میں کسی خوف کے قائل نہیں ہوتے
جو شیر کے بچے ہیں وہ بزدل نہیں ہوتے

طوفان کو ٹھکراؤ ہواؤں کو بدل دو
دریاؤں کو روندو تو پہاڑوں کو کچل دو
مردانہ بڑھو موت کو پیغامِ اجل دو
پھولوں کی تمنّا ہے تو کانٹوں کو مسل دو
تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پر تبسم نہیں آتا

سینوں کو چلو عرصۂ ہمت میں اُبھاریں
ہاں آؤ طمانچہ رخِ سیلاب پہ ماریں
شیروں کی طرح آؤ کچھاروں میں ڈکاریں
پلتی ہیں سدا خون کے دھاروں میں بہاریں
عزت کو خرابات قرینے نہیں دیتی
دنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

اے جنت کشمیر

عالم تیری برنائی گل رنگ کا شیدا کونین کے دل میں ترے جلوے کی تمنا
آفاق کے شانے پر تیری زلفِ گرہ گیر اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

ہاں تجھ کو جلانے کی تمنا میں مریں گے
چلتی ہوئی تلوار سے ہم قطع کریں گے
پہنائیں تو اغیار ترے پاؤں میں زنجیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر
منڈلائیں گے شاہیں جو تری پاک فضا پر
اغیار نیاموں سے نکالیں گے جو خنجر
ہم جنگ کے میدان میں چمکائیں گے شمشیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر
ظلمات کو رنگ اپنا جمانے نہیں دیں گے
اُس خاک پہ ہم رات کو چھانے نہیں دیں گے
جس خاک کا ہر ذرّہ ہے خورشید کی تصویر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر
تو کیف کا میخانہ صبوحی کا علم ہے
تو ناز کا بت خانہ تبسم کا حرم ہے
تو کوثر و تسنیم کے ہر خواب کی تعبیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

مناظرِ سحر

کیا روح فزا جلوۂ رخسارِ سحر ہے
کشمیر دل نواز ہے فردوسِ نظر ہے
ہر پھول کا چہرہ عرقِ حسن سے تر ہے
ہر چیز میں اک بات ہے ہر شئے میں اثر ہے

ہر سمت بھڑکتا ہے رخِ حور کا شعلہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے طور کا شعلہ

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذرّوں کا تبسم
چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جن پر ترنم
گردوں پہ سیاہی و سپیدی کا تصادم
طوفان وہ جلوؤں کا وہ نغموں کا تلاطم

اُڑتے ہوئے گیسو وہ نسیمِ سحری کے
شانوں پہ پریشان ہیں یا بال پری کے

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا
وہ چاندنی مدہم وہ سمندر کا جھلکنا

وہ چھاؤں میں تاروں کے گل تر کا مہکنا
وہ جھومنا سبزے کا وہ کھیتوں کا لہکنا

شاخوں سے ملی جاتی ہے شاخیں وہ اثر ہے
کہتی ہے نسیمِ سحری "عیدِ سحر ہے"

خنکی وہ بیاباں کی وہ رنگینیٔ صحرا
وہ وادیٔ سرسبز وہ تالابِ مصفا
پیشانیٔ گردوں پہ وہ ہنستا ہوا تارا
وہ راستے جنگل کے وہ بہتا ہوا دریا

ہر سمت گلستاں میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رخسار گلوں کے

وہ روح میں انوارِ خدا صبح وہ صادق
وہ حسن جسے دیکھ کر ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق
زرّیں وہ اُفق نور سے لبریز وہ مشرق

وہ نغمۂ داوٗد پرندوں کی صدا میں
پیراہنِ یوسف کی وہ تاثیر ہوا میں

وہ برگِ گل تازہ وہ شبنم کی لطافت
اِک حسن سے وہ خندۂ سامان حقیقت
وہ جلوۂ اصنام وہ بت خانے کی زینت
زاہد کا وہ منظر وہ برہمن کی صباحت

ناقوس کے سینے میں صدائیں وہ فغاں کی
وہ حمد میں ڈوبی ہوئی آواز اذاں کی

آقا کا غلاموں سے یہ ہے قرب کا ہنگام
دل ہوتے ہیں سرشار فنا ہوتے ہیں آلام
چھا جاتی ہے رحمت تو برس پڑتے ہیں انعام
اس وقت کسی طرح مناسب نہیں آرام

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے (2)

کشمیر کی حسین وادیوں کی رطب اللسان تعریف و توصیف میں قلم بند کی گئی جوشؔ کی یہ ایک اور نظم ''فضائے کاشمر'' اب ایک نایاب شعری فن پارے کی حیثیت رکھتی ہے:

زہے فضائے کاشمر، بہشت حسن جاوداں
ترانہ ریز و مئے چکاں، شگوفہ بار و گل فشاں
ہر ایک سنگ اِک صنم ہر ایک خار اِک جناں
ہر ایک پیچ ہے دھنک، ہر ایک جادہ کہکشاں
زمین پہ سرخ بادلے، فلک پہ موجِ پرنیاں
وفورِ آب و رنگ میں، ہجومِ برگ و بار میں
فضائے لالہ کار میں، ہوائے کوہ سار میں
تموجِ سرور میں، تلاطمِ بہار میں
بہشت شاخسار میں، چنار و دیودار میں

طیور مست و پُرفشاں کبھی یہاں کبھی وہاں
نیا تصور طرب ہر اک جواں اُمنگ میں
نواگری سرور میں، قلندری ترنگ میں

مذاقِ غنچہ خشت میں، مزاجِ پنبہ سنگ میں
ہزار مے کدوں کی رو، سبو کے ایک رنگ میں
فضائے شوخ وشنگ میں رواں رواں گلابیاں

فضائیں اضطراب میں، گھٹائیں پیچ وتاب میں
سروں کی رو رباب میں کہ مے رگِ شباب میں
کہانیاں حباب میں، جوانیاں سحاب میں
شکار موج آب میں اور آبِ موج خواب میں
کہ مست جوں شراب میں، فسانہ بار ونغمہ خواں

جوشؔ جب پاکستان چلے گئے تو اُنہیں اُن کے قریبی دوست پنڈت جواہر لال نہرو نے وہاں نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن شاعرِ انقلاب کی سیمابی طبیعت کو غالباً ہندوستان کی اُردو دشمن فضا راس نہیں آئی تھی اور وہ سرزمین پاک میں باقی ماندہ زندگی اطمینان سے گزارنے کے لئے وہاں گئے لیکن پاکستان میں بھی انتہا پسندوں نے اُن کے خلاف طوفانِ بے ہنگم کھڑا کر کے اُنہیں بے حد ملول اور دل آزردہ کر دیا۔ اس بنیاد پرستی کے ردعمل کے غیر متوقع ماحول میں جوشؔ نے یہ درد بھرے اشعار کہے:

رہا ہندو کی نظروں میں ہوں مسلم
بنا زندیق پاکستان آیا
اُدھر جن سنگھیوں نے دھول اڑائی
ادھر مودودیوں نے غل مچایا
وطن نے جب بجھادی شمع اردو
تو میں کم بخت پاکستان آیا

مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا
رحیما داورا مولا خدایا (3)

ہندوستان میں کچھ عناصر ایسے بھی تھے جو جوشؔ کے پاکستان چلے جانے پر اپنے اطمینان کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ وہ اُن کی نظروں میں ایک ''رند بلانوش ملحد'' تھا دوسری طرف جب وہ پاکستان میں قیام پذیر ہوئے تو وہاں جس طرح سے انہیں پریشان کیا گیا وہ اس غم ناک حقیقت کی روداد یوں بیان کرتے ہیں: ''میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ پورا پاکستان اور شہرِ کراچی تو اس قدر بلبلا اُٹھا گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہو۔ تمام چھوٹے بڑے اردو انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادباء اور شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہو کر شیر و شکر ہو گئے۔ وہابیوں، بریلیوں، دیو بندیوں، قادیانیوں، سُنیوں اور شیعوں نے اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا کر تبرا اور مدحِ صحابہ کے مابین اس طرح مصالحت کی گئی اور میرے خلاف متحدہ طور پر اعلان جنگ فرما دیا گیا۔ میرا پاکستان آنا ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر لوٹ پڑا ہے یا ابرہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے''۔

''میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں۔ غیرت نے اجازت نہیں دی۔ میں نے دل سے پوچھا، خان صاحب! اب کیا ہوگا۔ دل نے کہا ہمت نہ ہار:

اگر خارے بود گلدستہ گردد (4)

پاکستان میں اگرچہ جوشؔ کو شاعرانِ پاکستان میں شامل کر کے اُن کے

نام سے سرکاری سطح پر پانچ روپے کا ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا گیا لیکن وہ اپنے قیامِ پاکستان کے بارے میں یہی کہتے ہیں:

میں کراچی میں ہوں ایسے جیسے کوفے میں حسینؑ

شیخ محمد عبداللہ کی یہ رائے بھی صحیح ثابت ہوئی کہ جوشؔ نے پاکستان میں جو زندگی گزاری اُس میں صرف بدمزگی تھی(5) وہ اس خیال کا اظہار اپنے سوانح حیات میں ان الفاظ میں کرتے ہیں ''قبلۂ رنداں جوشؔ ملیح آبادی بھی میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ اُن کا پٹھانوں کا طنطنہ اور اُن کا شاعرانہ جلال اُنہیں خاصے کی شخصیت بنا دیتا ہے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اُن کے قدردانوں میں سے تھے۔ وہ مئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں چونکہ میں کبھی اس شے کی طرف رغبت پیدا نہیں کرسکا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انہوں نے میرے بارے میں نظم لکھی۔ اس نظم میں چھیڑخوانی کا یہ انداز موجود ہے۔ بعد میں جوشؔ صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پاکستان چلے گئے۔ اُن کے جانے سے اُن کے دوستوں کو صدمہ تو ہوا لیکن خود جوشؔ بھی کبھی مزے میں نہ رہے''(6)

اِس چھوٹی سی بات کو حسن اتفاق ہی تو کہا جاسکتا ہے کہ جوشؔ اور شیخ عبداللہ کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔ جوش 5 دسمبر 1898ء کو اس عالمِ ہست و بود میں آئے اور شیخ صاحب کا یومِ پیدائش بھی 5 دسمبر ہی ہے۔ جوشؔ عمر میں عبداللہ سے سات سال بڑے تھے۔

جوشؔ کی شاعری پر اپنی گہری ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے فیض احمد فیضؔ اُن کے بارے میں جو رائے زنی کرتے ہیں، اُس عبارت کو یہاں تبرکاً نقل کیا جاتا ہے ''جوشؔ کے کلام کی قدر و قیمت میں کلام نہیں۔ کسی نظام کے خلاف آواز اُٹھانا

ہمیشہ جراٗت اور دلیری چاہتا ہے۔ ہمارے موجودہ ماحول میں اس احتجاج کی وقعت مختلف وجوہات کے سبب اور بھی زیادہ ہے۔ اس لئے اس بات میں شک نہیں کہ جوؔش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور اُنہیں فکرونظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اگر اُن میں بہت سے ناکام اور بے رنگ نقالی کی حد سے آگے نہیں گزر سکے تو اس کی ذمہ داری اُن کے کندھوں پر ہے۔ جو گنتی کے چند ایک لکھنے والے ہمارے ادب میں تھوڑا بہت اضافہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُنہیں جوؔش کی رفاقت اور گرمیٔ گفتار سے یقیناً اعانت اور امداد ملی ہے"۔ (7)

کشمیر کے ساتھ حفیؔظ جالندھری کے والہانہ عشق اور اہلِ کشمیر کے ساتھ اپنی یکجہتی کے مسلسل اظہار کے بارے میں سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں "اُن کی شاعری میں کشمیر حسنِ بیان کا کوئی سہارا یا استعارہ نہیں ہے بلکہ ایک مستقل موضوع ہے۔ فکروخیال کا ایک مسلسل دھارا ہے جس میں حقیقت اور کشمیر سے ذاتی محبت خاص طور پر جھلکتی ہے جو نغمہ اور آنسو بن کر شعر کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔

میں سمجھتا ہوں حفیؔظ کو اپنے فن میں نفاستِ زیبا اور فکر کی مخصوص چھاپ کشمیر ہی نے بخشی ہے۔ شاعر کے ذاتی پس منظر کے طور پر یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ حفیؔظ بائیس برس کے تھے کہ پہلی بار بانہال کے راستے سے پاپیادہ ہی وادیٔ کشمیر کی سیاحت کو گئے۔ پھر اُس کے بعد 1946ء تک وہ تقریباً ہر سال باقاعدگی سے وہاں جاتے رہے اور اس طویل مدت میں اس کے دور دراز گوشوں تک گھوم آئے۔ اسی زمانے میں کشمیریوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک حریت کا علم بلند کیا تھا۔ اس تحریک کے قائدین سے حفیؔظ کے ذاتی مراسم تھے۔ چنانچہ حفیؔظ جب بھی کشمیر پہنچے تو مشاعروں اور ملی جلسوں میں اپنی شعلہ

نوائی کے ذریعے گویا عملاً تحریک حریت کشمیر میں شامل ہوتے رہے۔ حفیظؔ جب تک کشمیر نہیں آئے تھے محض غزل کے شاعر تھے۔ کشمیر دیکھا تو انہوں نے 1932ء میں اپنی زندگی کی پہلی نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''چشمہ ویری ناگ پر ایک آنسو'' جو اُس وقت کے مقبول رسالہ ''شباب اردو'' لاہور میں شائع ہوکر زبانِ زدِ خاص و عام ہوگئی۔ افسوس کہ یہ نظم جو مسلمانانِ کشمیر کی ناداری و محکومی کی منہ بولتی تصویر ہے ''شباب اردو'' کے اوراق کے ساتھ نایاب ہوچکی ہے۔

چونکہ حفیظ غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف بھی مائل ہوکر دلسوز گیتوں، رنگین نغموں اور حسین ترانوں کی اس طرزِ خاص کے موجد و مؤسس بن گئے جس کی سادگی اور پُرکاری، نغمگی اور شیرینی اُردو شاعری کا ایک عہد آفرین باب ہے۔

میں تو ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ حفیظؔ اگر کشمیر نہ گئے ہوتے تو تعجب نہیں کہ اردو شاعری حسن و نغمگی کے ان موتیوں سے کسی حد تک اور کب تک محروم رہتی جو آج حفیظؔ کی تخلیقات میں جابہ جا جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیر سے حفیظؔ کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ غزل میں بھی کشمیر کو نہیں بھولتے:

کشمیر ہے وہ جلوہ مگر اس کی راہ میں
فرقت کی وادیاں ہیں، پہاڑ انتظار کے
کشمیر میں حفیظ دل جلے کی یادگار
ڈھیری ہے ایک راکھ کی نیچے چنار کے (8)

1846ء کے رسوائے زمانہ بیع نامہ امرتسر کے خلاف بھی حفیظؔ جالندھری نے اپنی صدائے احتجاج بلند کی۔ اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ انگریزوں اور ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جس غیر انسانی اور غیر اخلاقی طریقے پر کشمیری قوم اور ملکِ کشمیر کی خرید و فروخت کا مذموم کام سرانجام دیا تھا وہ تاریخ

کی دنیا میں ایک ایسے کٹھن اور جان لیوا سفر کا آغاز تھا جس کے ہر گام پر کشمیریوں کے لہو کی چھینٹیں تڑپ تڑپ کر بزبانِ حال اپنی داستان کلفت بیان کر رہی تھیں۔

حفیظ کی نظم کا لہجہ طنزیہ ہے اور اپنے زورِ کلام کی بدولت انہوں نے انگریزوں کی مکاری اور گلاب سنگھ کی ملک گیری کی اس سازش کو بے نقاب کیا ہے۔ ابھی تک اس طویل نظم کو طبع شدہ صورت میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ گمانِ اغلب یہی ہے کہ یہ نظم انہوں نے پاکستان کے کسی ریڈیو سے خود نشر کی ہو کیونکہ وہ لحنِ داؤدی کے مالک تھے اور اُن کا ترنم سارے برصغیر میں لاجواب اور بے مثال تھا۔ اس نظم کا صرف یہ بند سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچ سکا ہے:

وادیاں کہسار بھی پھل پھول بھی اور سب اناج
ڈھور، ڈنگر، آدمی اُن سب کی محنت کام کاج
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد ہیں سب زر خرید
ان کے بچے بچیاں اولاد ہیں سب زرخرید
بک گئے کھیت اور کھلیاں سب پچھتر لاکھ میں
بس پچھتر لاکھ میں ہاں ہاں پچھتر لاکھ میں

فاروق ارگلی، حفیظ جالندھری کی ابتدائی زندگی کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں: ''ابوالاثر حفیظ کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے ایک معزز چوہان مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ اُن کے اجداد نے سترھویں صدی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ حفیظ نے ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں حاصل کی۔ خانگی حالات کی ناموافقت نے اُنہیں تعلیم سے محروم رکھا۔ پنجاب کی سرزمین میں جنم لینے والے اس غیر معمولی بچے کو جس کی مادری زبان پنجابی تھی، گیارہ سال کی عمر میں ہی اردو شاعری کا گہرا شوق ہو چکا تھا۔ زبان و ادب سے عشق اس حد تک

بڑھا کہ تیرہ سال کا حفیظ گھر سے بھاگ کر دہلی پہنچ گیا۔ مقصد تھا اردو زبان سیکھنا اور معیاری لب ولہجہ اختیار کرنا۔ اردو سے حفیظ کا عشق اُسے بار بار دہلی لے جاتا۔ دہلی میں کوئی رشتہ دار نہیں تھا اس لئے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آس پاس کسی کھنڈر یا مقبرے میں راتیں گزرتیں۔ شعر گوئی کا شوق پروان چڑھ رہا تھا۔ دہلی کے علمی حلقوں میں جان پہچان بڑھی۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار انصاری اور بیرسٹر آصف علی جیسی نامور شخصیتوں کی قربت ملی اور مولانا غلام قادر گرامی جیسے کامل اُستاد کی شفقتوں اور توجہ نے ان کی شاعری کو چمکا دیا تھا۔ حفیظ کی شاعری اور ان کی نغمگی سے متاثر ہو کر ریاست خیر پور (سندھ) کے والی نے اپنا درباری شاعر مقرر کیا لیکن اُن کی آزاد طبیعت کو درباداری راس نہ آئی اور اس منصب سے جلد ہی گلا خلاصی حاصل کر لی۔ تقسیمِ وطن سے پہلے ہی حفیظ لاہور میں مستقلاً قیام پذیر تھے اس لئے انہوں نے پاکستان میں ہی رہنا پسند کیا"(9)

"تصویر کشمیر" ستمبر 1936ء میں سرینگر کشمیر میں لکھی گئی اور 1938ء میں سرراس مسعود مرحوم کے دیباچے کے ساتھ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ سرراس مسعود لکھتے ہیں" حفیظ کا دل آئینہ خانہ ہے۔ دنیا کی رنگا رنگی، آوازوں اور صورتوں کے لباس میں اس آئینہ خانے کی سیر کیا کرتی ہے۔ نغمہ بھی، نالہ بھی، زشتِ بھی خوب بھی۔ کبھی مل جل کر کبھی الگ الگ یہاں آتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اِس گنبد میں قہقہے بھی لگاتے ہیں اور آہ و بکا بھی کرتے ہیں۔

"جس طرح حفیظ نے کشمیر کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی سیاحت کے دوران خود میں نے بھی اُسی نظر سے دیکھا اور اسی دل سے محسوس کیا تھا لیکن یہ خیال کہ میں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا تھا حفیظ کی کھینچی ہوئی تصویر

کشمیر کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔(10) حفیظ جالندھری کے بقول ''خون کے چراغ'' 1946ء میں مکمل ہوئی۔

چونکہ ہند میں حفیظ پر گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران نہ تو کوئی سنجیدہ تحقیق کی گئی ہے اور نہ ہی اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں، حسن و قبح اور من جملہ اُن کے فن پر کوئی کام سرانجام دیا گیا ہے۔اس مایوس کن صورتِ حال کے پیشِ نظر حفیظ کے بارے میں چند مقتدر اور معتبر ثقافتی شخصیات اور دانشوران نے اپنے دور میں جو آراء قلم بند کی ہیں اُنہیں یہاں پر اختصار کے ساتھ دوہرانے سے غالباً حفیظ اپنے ہندوستانی اہالیانِ فہم و دانش کو اُن پر مزید تحقیق کرنے اور اُنہیں زیرِ تجزیہ لانے کی ترغیب دے گا۔

حفیظ کے بارے میں مولانا عبدالقادر گرامی، پطرس بخاری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور پنڈت ہری چند اختر نے ابوالاثر کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔مولانا گرامی نے تو حفیظ کی تعریف میں ایک فارسی شعری تخلیق کو شاعر کی نذر کیا جس کی پذیرائی حفیظ نے اس طرح کی ہے کہ ''فخرِ ایشیا ملک الشعراء حضرت استاد مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی (قدس سرہ) نے ذیل کے اشعارِ آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرّے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ورنہ من آنم کہ من دانم۔ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں کہاں گرامی شہنشاہِ قلمِ سخن اور کہاں حفیظ گدائے گوشہ نشین اور عامیِ کج مج زبان۔لیکن گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا:

فصاحت مجسم بلاغت مصوّر
کلامِ حفیظ است اللہ اکبر
معانی دلآویز و الفاظ دلکش
کلامِ حفیظ است یا سلکِ گوہر

معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں
بآب استِ ماہی بہ آتش سمندر
معانی در الفاظ پنہاں و پیدا
بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکر
فصیح معظم بلیغِ مکرّم
حفیظ سخن گو حفیظِ سخن ور
بہ فہرست معنی است نامش مقدم
بہ بزمِ گرامی کلامش مؤخر
بطرز آفرینی طبعِ بلندش
بود آسماں کارگاہِ محقر
گرامی سحرِ گفت سالک بگوشم (11)
زبانِ حفیظ است یا موجِ کوثر

سید احمد شاہ بخاری پطرس نے حفیظ کو جالندھر کے نغم [illegible] کہتے ہوئے اُس کی شاعری کے بارے میں کہا ہے ”وہ کچھ مد [illegible] مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کی ایک [illegible] پرواجنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگتی ہیں۔(12)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ کی شاعری سے اثر پذیری کے عالم میں گویا سرشار ہو کر اس شاعر کو یوں خراج عقیدت ادا کرتے ہیں ”حفیظ کی شاعری امید افزا ابتداء سے تکمیل تک جا پہنچی مگر میرے دل میں جو جگہ ”نغمہ زار“ کی نظموں

کے لئے ہے وہ کسی اور نظم کے لئے نہیں۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا وہ فن اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بلند تر اور پختہ تر ہے۔ ادبیات میں اُن کا مقام جاودانی ہے اور اس کا سکہ جوان دلوں پر جمار ہے گا''(13)

اور استادِ سخن اُردو پنڈت ہری چند اختر نے بھی اپنے مخصوص اور منفرد اندازِ بیان میں حفیظ کا یوں تجزیہ کیا ہے''حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے مصرع پر، مصرع دوسرے مصرع پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدۂ دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہوتی جاتی ہے اور یہ سب کچھ اس لطافت اور سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گردوپیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پائیں۔ منظر کشی کا یہ اسلوب قادرالکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس رنگِ سخن نے فطری شاعری کی دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے''(14)

اختر نے حفیظ کے بارے یہ خیال آرائی شاعر کے مجموعۂ کلام ''سوز وساز'' کے دیباچہ میں کی ہے جہاں انہوں نے سید امتیاز علی تاج کے اُس اقتباس کو بھی دوہرایا ہے جو تاج نے حفیظ کے ''ہفت پیکر'' عنوان کے ایک اور مجموعہ کے مقدمہ میں شامل ہے۔''جو لوگ حضرت حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے اُن کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔ ہمیشہ یونہی ہوتا آیا ہے۔ دنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ ایک وقت میں دو حیثیتوں سے اعترافِ کمال کرنا اس کی بساط سے باہر ہے''(15)۔

آسمانِ اردو ادب کے تابناک ستاروں پطرس بخاری، محمد دین تاثیر، مولانا گرامی، ہری چند اختر اور امتیاز علی تاج کے یہ خیالات جو انہوں نے وقتاً فوقتاً حفیظ جالندھری کے بارے میں ظاہر کئے یہاں پر ایک دستاویزی حیثیت کے حامل ہونے کی شکل میں درج کئے گئے ہیں تا کہ ہندوستان میں حفیظ جیسے قادر الکلام اور سدا بہار شاعر پر تحقیق و تلاش کے گوشے منور کئے جا سکیں۔ یہ اس لئے اور بھی تقاضائے وقت کی صورت اختیار کرتا ہے کہ اس شاعر پر ہند میں جو تحقیقی یا تنقیدی کام ہوا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے اور اُس سے کسی طرح برصغیر کے اس اہم شاعر کی شاعرانہ شخصیت اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔

حفیظ کا پہلا مجموعہ کلام ''نغمہ زار'' اور ''سوز و ساز'' 1933ء میں شائع ہوا۔ 1946ء میں اُن کا تیسرا شعری مجموعہ ''تلخابۂ شیریں'' منظرِ عام پر آیا۔ اس کے دیباچے میں حفیظ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے یہ اقتباسات قارئین کی توجہ لازماً اپنی طرف مبذول کریں گے۔ حفیظ کا یہ قلم پارہ بجائے خود ادبِ لطیف کا ایک دلنواز نمونہ ہے جس میں شاعر نے اپنی باشعور زندگی کے چند پہلوؤں کی نقاب کشائی کے ساتھ ملکی سیاسیات اور اد اور ثقافتی دنیا کی روشنیوں اور تاریکیوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ پھر بھی طوالت کے خوف سے اس کے چند برمحل اقتباسات ہی پیش کئے جاتے ہیں۔

حفیظ نے ان خیالات کا آغاز اپنے ذوقِ محبوبی کی اس حدت اور حرارت بھری یاد کے دریچے پھر ایک بار وا کر کے یوں کیا ہے۔ اُن کی اس تحریر سے پنجاب کے کھیتوں کی ہریالی کی مہک، سرسوں کے ساگ کی خوشبو اور وارث شاہ کی شیرین زبان کی رنگا رنگیاں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ ''تجھے یاد ہوگا جب میں پہلے پہل تیری طلب میں نکلا تھا، کھیت کیسے سہانے تھے، ان کی مینڈوں پر سے گنگناتا ہوا میں گزرا، وادیاں اور اُن کا اچھوتا پن، حسن، پھر وہ دامن کہسار۔

”میرا پتھروں پر ڈگمگانا، مشکلات کی اُبھری ہوئی چٹانیں، اُن کی دھاروں اور تیز نوکوں پر اپنی آنکھوں کو تول تول کر رکھنا کتنا بھلا تھا۔ میرا عزم مجھے بلند کر رہا تھا۔ اس طرح تنہا چلنا ہی میرے ذوق وشوق کا انعام تھا اور میرے عزم کو بڑھانے والا کون تھا۔ تیرے جلوۂ منظر کے سوا؟۔

”اپنی ہی روش پر چلنے اور اُس پہلی چوٹی تک پہنچ جانے پر میری اوّلین مسرت کے وہ گرم گرم آنسو جن کی نمکینی اب تک میرے لبوں پر ہے جب تو نے پہلے پہل نزولِ جلال فرمایا تھا محض میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے مجھے اور آگے اور آگے چلانے کے لئے۔

”مجھے یاد ہے تیرے ارشاد پر میں نے اپنی نگاہ وادیوں پر ڈالی تھی جن سے ہوتا ہوا میں آیا تھا۔ نیچے دور دور تک تیرے حسن کے پرتو سے مملو بچھی ہوئی پستیوں کی بساط اور اس بساط پر جمے ہوئے مہرے جب میں نے پہلے پہل روایتی اندازِ سخن سے الگ ہٹ کر اپنے انداز سے لکھنا شروع کیا اسی وقت سے مجھے اپنے ہم عصروں کی چھری، کلہاڑی اور دریدہ ذہنی سے بعذرِ انکسار بچ نکلنے کی تمنا یا توقع ہے۔ دنیائے سخن میں باغِ بہشت سمجھ کر آزارے نباشد کے یقین پر داخل ہوا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہاں جنگل کا قانون ہے۔

”مجھے ایسی مخلوق کی بھیڑ بھاڑ میں سے راہ نکالنی پڑی ہے جس کا شعور ابھی دبوچ لینے، تکا بوٹی کر ڈالنے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغِ ادب ان کی شکار گاہ ہے۔ مجھے ان کے اکے دکے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ٹولیاں بھی مجھ پر لپکیں جھپٹیں۔

”پہلے یہ دھمکی دیتے ہیں کہ کوئی سہم جائے یا الجھ پڑے تو ہجوم کرتے ہیں۔ اُن سے بچنے کے لئے صرف ایک ہتھیار درکار ہے۔ بے پروا مسکراہٹ۔ اے راہیِ ادب! اے مسافرِ شعروسخن، اگر تیرے پاس مسکراہٹ کا

زبردست عصا نہیں تو اس باغ میں داخل نہ ہونا۔ اس جنگل سے نہ گزرنا:

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

''بچپن میں عام رسم و رسوم کے ہنگامے، میلے ٹھیلے اور اُن کے ساتھ ساتھ مذہبی غلو اور مذہبی بحثوں کے نظارے دیکھے۔ لڑکپن میں جنگِ عالمگیر اور اس کی ہولنا کیوں کی آوازیں اور اُن کے تاثرات عنوانِ شباب کے سوالوں سے گتھے ہوئے پھر جنگ کے بعد ہندوستان میں روحِ آزادی کا عمل، ردِ عمل، ترکی اور خلافت کے لئے عام اضطراب، شدھی تنظیم، یہ سب کچھ اور ایسا ہی بہت کچھ میرے دماغ پر مبہم مگر میرے قلب کی گہرائیوں میں واضح اثر چھوڑتے ہوئے گزرے۔ ان بیجوں کو اُگنا تھا اپنے اپنے وقت پر۔ زمین اور وقت کی آب و ہوا سے غذا لیتے ہوئے'۔

''میرے گھرانے پر موت وارد تھی اور میری جان پر نزولِ غم۔ میرے بھائیوں کو پلیگ، ہیضہ لئے جا رہا تھا اور مجھے قافیے اور غزل۔ زندگی میرے سر پر ہر قدم تازہ ذمہ داریوں کا پہاڑ لادتی اور شاعری مجھے ہانکتی تھی:

اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بارِ دوشِ بے کسی ، کوہِ گرانِ زندگی

''میں گوشہ نشین نہیں ہوں۔ مجھے اپنے عصر کے سخن وروں سے شرفِ ملاقات کے مواقع، بخت اور اتفاق نے سب سے زیادہ اور بار بار بہم پہنچائے ہیں۔ اکثر نامی ناموروں سے نیاز حاصل رہا ہے اور اُن سے بھی جو نام اور ناموری کے لئے لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے اسی ڈھرے پر چلے جا رہے ہیں۔ اسی ایک منزل کی طرف جہاں ایک دوسرے سے نفرت اور ایک دوسرے کا قتل زندگی کا ثبوت ہے۔

اُس طرف سیاستِ وقت کی تلوار زبانِ اردو اور اس میں جو کچھ ہے سب کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اس طرف اسی زبان کے سب سے بڑے دعویدار اور محافظ ایک دوسرے کی گردن مار رہے ہیں۔ یہ ہے ماحول میرے وقت کی اردو شعروشاعری کا:

فلک بے مہر عالم دشمن و معشوق بے پروا
مرا بر آرزو ہائے نظیری خندہ می آید (16)

اب حفیظ کی یادگار نظم جو شہدائے کشمیر کے لئے شہیدانِ آزادی کے مزاروں کی پکار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

سرخ پھولوں سے زمیں کشمیر کی ہے سرخ رو
لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار
راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار
معرکہ اس خاک پہ گزرا ہے دارو گیر کا
لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے کشمیر کا

یہ ہماری جاودانی زندگانی کے نشاں
چاند تاروں کی طرح روشن ہیں زیرِ آسماں
خوشنما چنڈول اُڑتے اور لہراتے ہوئے
چہچہاتے آسمانی راگنی گاتے ہوئے
کوئی یہ نغمے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں
جنگِ آزادی میں ایسے محو ہیں اہلِ زمیں

اِک طرف بھوکی رعایا، اک طرف جاگیردار
اک طرف دہقان، اک جانب سپاہِ شہریار
بیکسوں کی آہیں، مظلوموں کی چیخیں دردناک
شورِ محشر ہے کہ ہم بھی سن رہے ہیں زیرِ خاک
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلح جنگ جو
آبِ جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہو
یہ لہو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا
راہِ آزادی میں تازہ گل کھلاتا جائے گا
تا بکے آتش سے کھیلے گی کرائے کی یہ فوج
قلزمِ جمہور میں جاگی ہے آزادی کی موج
فطرتِ انساں کو ہے طوقِ غلامی نا پسند
حریت اُٹھی ہے لے کر پرچم عزمِ بلند
اُٹھے ہیں مزدور جانبازی دکھانے کے لئے
لعنتِ سرمایہ داری کو مٹانے
ان کے چہرے ہیں مرقعے جوش وضبط وصبر کے
توڑ ڈالیں گے یہ سب آئینِ ظلم و جبر کے
حسن نصب العین ہو جن کی نگاہوں پر نثار
ہم شہیدوں کی نگاہیں اُن کی راہوں پر نثار



اے رفیقو! سرفروشو! سنتے جاؤ ایک بات
ہم بھی زندہ تھے کبھی ہم کو بھی پیاری تھی حیات

دیکھتے تھے ہم بھی صبح و شام کی رنگینیاں
ان نگاہوں نے بھی کی ہیں حسن کی گل چینیاں
ہم بھی ان سینوں میں دل رکھتے تھے دل میں درد بھی
گرم آنسو آنکھ میں، ہونٹوں پر آہِ سرد بھی
دل دھڑکتا تھا ہمارا بھی نگاہِ ناز پر
رقص ہم بھی کر چکے ہیں زندگی کے ساز پر
ہم نگاہِ حسن کے طالب بھی تھے مطلوب بھی
عشق ہم نے بھی کیا تھا، ہم بنے محبوب بھی
ہم تمہاری ہی طرح کودے تھے اس طوفان میں
جان کی بازی لگادی ہم نے اس میدان میں
تھے غلامی سے تمہاری ہی طرح بیزار ہم
جنگِ آزادی کے تھے پہلے علم بردار ہم
تھا پرِ پرواز اپنا بھی کبھی افلاک پر
آج ہم قبروں میں ہیں سوتے ہیں فرشِ خاک پر
جسم ہیں سوئے ہوئے جانیں مگر بیدار ہیں
اشتراکِ اہل ہمت کے لئے تیار ہیں
معرکہ آراؤ، ہاں آگے بڑھو بڑھتے چلو
غاصبوں پر تند شیروں کی طرح چڑھتے چلو
اب تمہارے ہاتھ اس آغاز کا انجام ہے
ہم یہاں کام آگئے ، آگے تمہارا کام ہے

زور و زر سے، مکر و حیلہ سے نہ شور و شین سے
موجِ آزادی نہ کترائے گی نصب العین سے



منہ اگر آزادیٔ کشمیر سے موڑو گے تم
ہم شہیدوں، ہم وفاداروں کے دل توڑو گے تم
لالہ رو یہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ
ہم نے اپنے خون سے روشن کئے ہیں یہ چراغ
سرفروشو! ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے
آگے اور آگے بڑھو نامِ خدا لیتے ہوئے

اور کشمیر پر کہی گئی یہ رزمیہ نظم جو محکوم کشمیر کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے:

تصویرِ کشمیر

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرۂ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
لطف جب ہے کہ اُٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
چار سو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نور اِن کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش

ایک ہی قانونِ قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش
روکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پر دیواروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کے دیوزاد تودے نور کے آئینہ دار
نقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکسِ زرنگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گل اندر گل بہار اندر بہار
کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعرِ دلگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندیاں ہر سو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی
کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیواروں کے بن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہرِ لبن
بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن
سن لیا تھا نام بیچارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دامنِ سنُ مرگ سے قائم ہے فطرت کا سہاگ
حسن کی مورت امرناتھ آئینہ ہے شیش ناگ
ہائے چشموں کی روانی، ہائے چرواہوں کے راگ
اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک مرے سینے کی آگ
نقشِ حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصو

دل رُبا دوشیزگی ہے چہرۂ لولاب پر
حسن سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر
کوثر و تسنیم غش ہیں اِس ردائے آب پر
رشک ہے فردوس کو اِس سبزۂ شاداب پر
آب میں مے کا اثر ہے خاک میں اکسیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عام شاعر کہہ گئے کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت چند حوریں اِک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے میں کہتا ہوں کہ ہاں

عالمِ بالا پہ ہے پَرتو اِسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی، گلزار بھی، کہسار بھی
خوبصورت پھول بھی، اشجار بھی، اثمار بھی
خوبصورت ہر بشر مفلس بھی اور زردار بھی
ظاہرِ کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُرکار بھی

باطنِ کشمیر لیکن پیٹ ہے انجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حُسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہر جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوع انسانی یہاں

نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وادی و کُہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخل آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مُرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک طرف مہمان خوش اوقات، خوش دل، خوش لباس
اِک طرف ہے میزبان فاقہ زدہ تصویر یاس

اِک طرف مَے کا نشہ، پھل کا مزہ، پھولوں کی باس
اِک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس
اِک تماشائی ہے، اِک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے، ہائے آنچل کی یہ اوٹ
چادرِ آبِ رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
ہائے مانجی کا یہ کنبہ جس کا سرمایہ ہے بوٹ
یہ مشقت، یہ فلاکت لب پہ نغمہ، دل پہ چوٹ
شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

سطحِ ڈل لرزاں، کنول رقصاں شکارے ہیں رواں
اِن کے اندر کچھ حسیں بھی پیارے پیارے ہیں رواں
لیٹے لیٹے خوابِ راحت کے سہارے ہیں رواں
آسمانِ حسن پر گویا ستارے ہیں رواں
نیم باز آنکھیں مگر ہر سو نشانہ تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
دن چناروں کی فضائیں شب چراغوں کی بہار
ہے یہ زرداروں کی اور اونچے دماغوں کی بہار
ان کے چاکر دیکھتے ہیں دل کے داغوں کی بہار
ہے دھواں چولہے کا ان کو مشغلہ کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جس کی محنت سے چمن میں روئے گل پر خندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقشِ صناعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمعِ اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
اس زمیں پر آسماں کا لطف بھی ہے، قہر بھی
اپنے بچوں کے لئے یہ شہد بھی ہے زہر بھی
آب و گل کا یہ عجوبہ ہے عجب تخمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لئے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لئے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لئے
ہر نفس اِک سلسلہ ہے قید بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم میں تیغ و گلو کا امتیاز
اور دونوں پائے مغرب پر ہیں مجبورِ نیاز
یہ برہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی نماز
کر رہے ہیں قیدِ نا محسوس کی رسی دراز

ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نخچیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا



خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگمان ہوتی ہے دنیا اِک ذرا سی بات سے
ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے
لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشمِ لذت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمۂ شاہی پہ آؤ لے کے اِک بوتل چلیں
شہر کے جھگڑوں سے گاندربل کی جانب ٹل چلیں
آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھا بل چلیں
ہستیِ مزدور کو پیروں کے نیچے مل چلیں
اس کی یہ مسکین صورت دام ہے تزویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں!
کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں!
حسن و صنعت کے لئے مشہور ہیں ہم کیا کریں!
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں!
ان کی صورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندۂ کشمیر کو اندوہ گیں
ہنستے ہیں اہل تماشا کوئی ہمدردی نہیں
غیر ملکی زائروں کو ہوگیا ہے یہ یقیں
جنتی ہے مزدور ہی اس باغِ جنت کی زمیں
یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زائروں کا موسمِ گرما میں رہتا ہے ہجوم
اہلِ دل کم، بیشتر ان میں نظر آتے ہیں شوم
منحصر مزدوریٔ ارزاں پہ ہیں ان کے قدوم
ہیں تو یہ جگنو مگر خود کو سمجھتے ہیں نجوم
یہ زمیں گوشہ ہے ان کی خانگیٔ جاگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان کے دم سے رونقِ گلمرگ، شانِ پہلگام
لیکن ان دونوں میں ہے بدذوقیوں کا اژدہام
رات دن آلودہ کرتا ہے انہیں انبوہِ عام
حسن فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام
کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس گروہِ عام کا ہے ذوق کتنا بے بساط
یا شکم کی پرورش یا مرد و زن کا اختلاط
آ دکھاؤں میں تجھے راہِ حصولِ انبساط
شام در باغِ نسیم و صبح در باغِ نشاط

دیدۂ و دل کے لئے سامان ہے تطہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ
کچھ نہیں دیکھا ابھی، پھر دیکھ پر اِک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فن تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار
سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لئے یہ آبشار
سرد کیوں ہیں پا بہ گل اور دم بخود ہیں کیوں چنار
سر جھکائے کیوں کھڑے ہیں نخل ہائے باردار
سبزہ کیوں منہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لئے رنگین گل روتے ہیں خوں
اس حسیں بارہ دری پر سوگ سا طاری ہے کیوں
محوِ عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستوں
کیوں شکستہ قلب فواروں کو ہے جوشِ جنوں
منتظر ہے باغ کس کے خواب کی تعبیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمِ شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹی میں نہ رول
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول

ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصور شرط ہے آنکھیں نہ کھول
چشمِ دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں سے کوئی کہہ دے بند کر دیں کھیل کود
باغ کو خالی کرے اہلِ نمائش کا وجود
ہوگئی ہے رات سو جائے کہیں بزمِ نمود
ہونے والا ہے یہاں اب پاک روحوں کا ورود
پیش خیمہ آ گیا اِک بزمِ خلوت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ
دیکھ روشن ہوگیا ہر ایک لالے کا چراغ
خود بخود پُر کر لئے رنگین پھولوں نے ایاغ
عرش پر جانے لگا پامال سبزے کا دماغ
رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آئے، نے نواز آئے، مزامیر آ گئے
نغمۂ خاموش کی بن بن کے تصویر آ گئے
دفعتاً بیرونِ در کچھ اہلِ شمشیر آ گئے
اندرونِ در شہنشاہ جہانگیر آ گئے
ساتھ اک پُرنور حلقہ عدل کی زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کا در پھر کھلا بادِ بہاری آ گئی
اِک ردائے سبز بہرِ پردہ داری آ گئی
صد نقاب اوڑھے ہوئے پرہیزگاری آ گئی
لیجئے نورِ جہاں کی بھی سواری آ گئی
گردِ جھرمٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

غنچۂ گل میں مثالِ بو ہوئے دونوں نہاں
باغ میں داخل ہوا شاہِ جہاں صاحبقراں
سخت گیر و داد گستر قہرمان و مہرباں
ہمرکاب اقبالِ شاہی شان و شوکت ہم عناں
میرِ ساماں ساتھ اور سامان بھی تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

محوِ سیر باغ ہے یہ مرکزِ توقیر بھی
اب چمن میں گونج اُٹھا اِک نعرۂ تکبیر بھی
غل ہوا وہ آئے شاہنشاہ عالمگیر بھی
فقر کے قبضے میں تخت و بخت بھی تسخیر بھی
سامنے قرآن ، قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عجب دھندلی ضیا، اُجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
بانیانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں

خوف ہے تعزیر کا ان کو نہ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تو نے دیکھا اے تصور کیا ہے لبِ پھولوں کا رنگ
آبشاروں کا یہ نغمہ نہر کا یہ جلترنگ
ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ
چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی امنگ

بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے
روز ہنگامہ جو پھر پیشِ نظر ہونے کو ہے
ہائے یہ منظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
سوئے بالا پاک روحوں کا سفر ہونے کو ہے

ہم نشیں عالم ہے یہ اک نالۂ شبگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر بسر راتیں کیا کرتا ہوں میں
نذرِ خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں میں
ماضیِ کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں میں
بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں میں

پوچھتا رہتا ہوں مقصد اُن سے اس تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعرِ رنگیں بیاں
تو نے دیکھے شوکتِ انسانِ فانی کے نشاں

دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا رازداں
وہ بھی کرسکتا ہے یونہی حسنِ فطرت کو عیاں
ہے یہ اِک ادنیٰ نمونہ قوت و تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
حوصلے والوں کی نفسیات کو سمجھے نہیں
اِن سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں
توڑ کر ہمت کھلونا بن گئے تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چار دن کی زندگانی ہی سہی
شوکتِ مغلیہ اب قصہ کہانی ہی سہی
اِک سبق دیتی ہیں تعمیریں پرانی ہی سہی
نقش باقی ہے ہمارا، نقشِ فانی ہی سہی
راز تو کھلتا ہے اس سے عالمِ تغیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا مجالِ دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ اُن کے احسانات پر
جو نظر تھی قصر و ایوانات پر، باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیِ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا بے کار و زشت
رائیگاں ہوتی رہی دہقان کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ، ساغر و مل، سبزہ و گل، سنگ و خشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت

خواب دیکھا، منہ نہ دیکھا، خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک جہاں کشمیریوں کا حال پر ہنستا ہے آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر روباہ مزاج
بے دلی، بے اعتمادی، مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج

کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں، یہ شکستہ کاخ و کو
زنگ خوردہ اسلحہ، ٹوٹے ہوئے جام و سبو
ہڈیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہو
جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسردہ ہے تو

یہ خرابہ ہے خدا کی بہترین تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا لایا جماعت پر وبال
ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال
ہائے یہ مدقوق بچے، ہائے روٹی کا سوال

ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آئے
سر پہ ہمسایے کے ہمسایہ ہی جب طوفان اُٹھائے
کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے
مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہارِ رائے

ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائے گا تکفیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

1953ء میں وزارتِ عظمیٰ سے برخاست کر کے شیخ عبداللہ کو پسِ زنداں ڈال دیا گیا۔ اپریل 1964ء میں وہ دوسری بار قید و بند سے رہا ہو کر نکلے تو حفیظ نے اس موقعے پر اپنے اس محبوب کشمیری رہنما کی خدمت میں سلام پیش کیا جس سے یہ منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:

شیرِ کشمیر اے مجاہد مردِ فردِ بے نظیر
تو ہے پھر آزاد گیارہ سال تک رہ کر اسیر
شیخ عبداللہ شیدا کملی والے ہی کا ہے
اس اندھیری رات میں طالب اُجالے ہی کا ہے
شیر بھی شیدائی ہے اللہ کے محبوب کا
حق نے بخشا ہے اُسے بھی علم زشت و خوب کا
امتحان رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لئے
جلوے خود بیتاب ہیں اُن کی نگاہوں کے لئے
میں حفیظ بے نوا ادنیٰ غلامِ مصطفٰے
آج پھر تجھ سے مخاطب ہوں بنامِ مصطفٰے

تیری میری دوستی اسلام کا انعام ہے
راہِ حق میں کام آئیں یہ ہمارا کام ہے
شیر میں نے تجھ کو دیکھا برسرِ پیکار و کار
تو نے کردیں وادیاں بیدار، جاگے کوہسار
کاش تیرے ساتھ ہوتا قید میں کشمیر میں
رنگ بھرتا اور بھی کشمیر کی تصویر میں
اپنی آنکھوں دیکھتا میں ٹوٹنا زنجیر کا
یہ نیا پہلو ہے اب کشمیر کی تصویر کا
شیخ عبداللہ تو مومن ہے شیدائے رسولؐ
کر سلامِ شاعرِ اسلام دوری میں قبول (17)

اپریل ہی کے مہینے میں یہ خبر آئی کہ شیخ محمد عبداللہ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد پنڈت جی کی ایماء پر پاکستان جارہے ہیں جہاں وہ ہندوپاک کے مابین کئی حل طلب مسائل خاص طور کشمیر کے مسئلہ پر بھی صدر ایوب خان کے ساتھ بات کریں گے۔ اس موقعے پر بھی حفیظؔ شیخ کی محبت کا برملا اظہار کرنے سے نہیں چوکے اور اُن کی ایک استقبالیہ نظم عبداللہ کے واردِ پاکستان ہونے سے پہلے ہی مظفرآباد ریڈیو سے کئی دنوں تک حفیظؔ کے خوبصورت مترنم لہجے میں نشر ہوتی رہی۔ اس نظم کا صرف مطلع ہی ذہن میں محفوظ رہ سکا ہے:

شیر کشمیر اس طرف پایانِ کار آنے کو ہے
مدتوں تھا سب کو جس کا انتظار آنے کو ہے

5 دسمبر 1964ء کو جب شیخ عبداللہ انسٹھ برس کے ہو گئے تو حفیظؔ نے

اس سالگرہ پر بھی یہ نظم قلم بند کی جو ''کلیم اللہ کے پیرو'' کے عنوان سے اُسی شام مظفر آباد ریڈیو سے پڑھ کر سنائی گئی۔ اس کا انتخاب یوں کیا گیا ہے:

تیری عمرِ رواں کا ہر نفس وقف عبادت ہے
مبارک ہو کہ اُنسٹھواں تیرا جشنِ ولادت ہے
شبِ کشمیر میں ہے صبحِ روشن تیری پیشانی
یہ پیشانی کہ ہیں کہسار و وادی جس سے نورانی
یہ نورانی تبسم جس میں پیدا دل کی تابانی
یہ تابانی ہویدا جس سے ہے تائیدِ ربانی
یہی تائیدِ ربانی رہائی کا سہارا ہے
یہی کشمیریوں کے جان و دل میں جلوہ آرا ہے
محمدؐ کی محبت نے کیا ایسا قوی تجھ کو
کلیم اللہ کی بخشی خدا نے پیروی تجھ کو
تجھے میں یاد کرتا ہوں تو کیا کیا یاد آتا ہے
تصور میں مجھے گزرا زمانہ یاد آتا ہے
اُدھر تیرے جلو میں سیلِ آدم یاد آتا ہے
اُدھر تو قید میں رہنے سے بھی آزاد آتا ہے
کچھاروں میں سے اکثر شیر کی آواز سنتا ہوں
جدائی مجھ کو رلواتی ہے رو کر سر بھی دھنتا ہوں
وہ تیری قرأتِ قرآں وہ حضرت بل کی تقریریں
رجز خوانی تیری! عزمِ مصمم کی وہ تدبیریں
وہ رزم و بزم میں تیری ہی رنگا رنگ تصویریں
مسلسل جادہ پیمائی، رفاقت کی وہ زنجیریں

وہ زنجیریں مجھے باندھے ہوئے ہیں میرے یار اب تک
اِسی باعث مرا کشمیریوں میں ہے شمار اب تک
وطن کے شیر! اُس جانب سے میری ہم نوائی کر
مرا کشمیر مجھ کو پھر دکھا دے رہنمائی کر!
چھتہ بل سے مرے ڈونگے کو لے کر نا خدائی کر
شکارے میں میرے اشعار کی نغمہ سرائی کر
تری عمرِ رواں کا ہر نفس وقفِ عبادت ہے
مبارک ہو کہ اُنسٹھواں ترا جشنِ ولادت ہے (18)

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے محض عقیدت کی بنا پر شاہنامہ اسلام تحریر کیا جس کی وجہ سے اُسے شاعر اسلام کا لقب بھی دیا گیا۔ ہماری نظروں میں وہ محض ایک شاعر تھا جو ایک خاص مذہب کا پیروکار ہوتے ہوئے دنیا کے تمام مذاہب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا اور اُن کا احترام کرتا ہے۔ شاہنامہ اسلام کا مصنف وہی حفیظ تھا جس نے ''ابھی تو میں جوان ہوں'' جیسا سدا بہار رومانی نغمہ بھی لکھا ہے۔

عصمت چغتائی نے جتنے افسانے اور ناول اردو میں لکھے جن میں 'لحاف'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'ضدی' وغیرہ شامل ہیں وہ موضوعاتی لحاظ سے انھی ادبی تخلیقات سے تعلق رکھتے تھے جن کی وجہ سے سعادت حسن منٹو کو عریاں نویسی اور فحش نگاری کے الزامات میں بار بار عدالتی مقدموں میں گھسیٹا گیا۔ لیکن جب ہم عصمت چغتائی کا تاریخی ناول ''ایک قطرہ خون'' پڑھتے ہیں تو واقعہ کربلا پر مبنی اس ناول کو پڑھ کر آنکھیں بار بار چھلک پڑتی ہیں۔ اس قسم کی نگارشات عام طور پر مصنف کے قلم سے مذہبی عقیدت کے نتیجے میں تخلیق کی جاتی ہیں۔

حفیظ جالندھری کی کشمیر نوازی اور پائمال اہلِ کشمیر کے ساتھ اُن کی فکری

یک جہتی کے عالم میں جنون کی حد تک والہانہ پن تھا۔اس کا اظہار انہوں نے بار بار الگ الگ مواقع کے پسِ منظر میں مختلف موضوعاتی منظومات سے کیا ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے وطن کے لئے قومی ترانہ ''شاد باد منزلِ مراد'' تخلیق کیا وہاں پاکستانی کشمیر کو بھی ایک ترانے سے نوازا جس میں انہوں نے وادیٔ کشمیر کو باغوں اور بہاروں والی، دریاؤں اور کہساروں والی اور جنت کے نظاروں والی سرزمین سے مشابہت دی ہے۔ یہ گیت ہر محبّ وطن کشمیری کا نغمۂ دل ہوسکتا ہے۔

حفیظ جالندھری کے کلام میں سے اگرچہ ہندوستان میں شاہنامہ اسلام کی غیر قانونی طور پر نقل شدہ جلدیں کہیں کہیں دستیاب ہیں البتہ انہوں نے 1942ء میں خود اپنی زبانی اپنی مطبوعات کا ذکر کیا ہے جن میں تصویرِ کشمیر نام کی تخلیق بھی شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں ''تصانیف میں نظموں اور گیتوں کے دو مجموعے ''نغمہ زار'' اور ''سوز و ساز'' طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''تلخابۂ شیریں'' زیرِ طبع ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ ''شاہنامۂ اسلام'' تین جلدوں میں چھپ کر شہرت و نام حاصل کر چکی ہے۔اس میں سات ہزار اشعار ہیں۔ کچھ نظمیں ''تصویرِ کشمیر'' وغیرہ الگ الگ کتابی شکل میں بھی نکل چکی ہیں۔ بچوں کے لئے ''بہار کے پھول''، ''پھول مالا'' اور ''ہندوستان ہمارا''، ''حفیظ کے گیت'' اور دیگر نظمیں چار حصوں میں طبع ہو چکی ہیں (19) اور یہ مطبوعات ہندوستان میں تقریباً ناپید ہی ہیں۔

حفیظ جالندھری کی تعریف و توصیف میں جہاں مولانا غلام قادر گرامی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ہری چند اختر، پطرس بخاری اور سید امتیاز علی تاج جیسے برصغیر کے ممتاز نقادانِ ادب اور شعر شناس اساتذہ رطب اللسان نظر آتے ہیں وہاں ہندستان میں 1947 کے بعد گویا حفیظ کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور خاص توجہ کی طالب اس شاعر کی عظمت کو بھارت کی اردو دنیا میں طاقِ نسیاں کی نذر کیا گیا۔

غالباً حفیظ کا نا کردہ گناہ یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان کی شہریت قبول کرلی۔ پاکستان کا قومی ترانہ لکھا اور کشمیر کے تعلق سے ہندوستانی سرکار کے موقف سے اتفاق نہیں کیا۔

جوشؔ جب پاکستان چلے گئے تو انہیں بھی مملکتِ پاکستان میں کم وبیش ایک تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ہندوستان نے انہیں بھی بہت حد تک فراموش کردیا۔ ادھر وہ پاکستان میں بھی ایک مخالف ماحول کی تیز وتند ہواؤں کے تھپیڑوں سے خود کو بچاتے رہے اور بالآخر یہ شاعرِ انقلاب جس نے سارے برصغیر میں سالہا سال تک اپنی شاعری کی دھوم مچا رکھی تھی ایک دل برداشتہ اور دل شکستہ سخن گو کا کربِ دل میں دبا کر دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔

اخیر پر جوشؔ، حفیظؔ اور عبداللہؔ جیسے تین عاشقان اور محبان یک دیگرے کے بارے میں یہ واقعہ ضرور دوہرانا ہوگا کہ جہاں شیخ محمد عبداللہ اور جوشؔ ایک ہی تاریخ یعنی 5 دسمبر کو پیدا ہوئے وہاں یہ بات بھی حسن اتفاق سے کم نہیں کہ یہ تینوں کے تینوں ایک ہی سال یعنی 1982ء میں خدا کو پیارے ہوگئے۔ یہ شعر ان تینوں شخصیات پر آج بھی فرداً فرداً صادق آتا ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا



حوالہ جات

(1) حیرت ہے کہ کشمیر پر جوشؔ کی تحریر کردہ نظمیں ماسوائے ''مناظر سحر'' اور شیخ عبداللہ پر اُن کی نظم ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کی مرتب کردہ ''کلیات

جوشؔ ملیح آبادی'' میں کہیں نظر نہیں آتیں (خیالؔ)

(2) کلیات جوشؔ ملیح آبادی۔ مرتبہ عصمت ملیح آبادی۔ فرید بک ڈپو دہلی 2007۔ص62

(3) جوشؔ بانی صفحہ 3۔ جوش لٹریری سوسائٹی انڈیا، کینیڈا، جنوری تا جون2009ء

(4) یادوں کی بارات، آیٔنہ ادب لکھنو، 1973۔ص220-219

(5) خیالات۔غلام نبی خیالؔ۔ کشمیری رائٹرس ایسوسی ایشن سری نگر، 2009 ص118

(6) آتش چنار۔ علی محمد اینڈ سنز سری نگر۔1986،ص268-267

(7) جوشؔ بانی۔ مدیر: علی احمد فاطمی۔ جوش لٹریری سوسائٹی انڈیا کینیڈا۔ جلد اول۔ جنوری تا جون2008

(8) مجلّہ ماہِ نو۔ کراچی، شمارۂ خاص۔ اکتوبر1962ء

(90) کلام حفیظؔ جالندھری۔ فرید بک ڈپو، دہلی۔2003ء، صفحہ نمبر4-3

(10) ایضاً صفحہ نمبر234

(11) مراد مشہور شاعر سالکؔ بٹالوی سے ہے۔

(12) کلیات حفیظؔ۔ صفحہ نمبر14

(13) ایضاً صفحہ نمبر16

(14) ایضاً صفحہ نمبر103

(15) ایضاً صفحہ نمبر107

(16) ایضاً صفحہ نمبر210-208-205

(17) ہفت روزہ محاذ، شیر کشمیر نمبر، سری نگر 19، دسمبر 1964ء

(18) ہفت روزہ محاذ سری نگر، مدیر غلام نبی خیال، 12 دسمبر 1964ء

(19) اوراق گل، مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، حسب الحکم اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالکم و ملکھم، رامپور یوپی 1944، صفحہ نمبر 174



فیض احمد فیضؔ

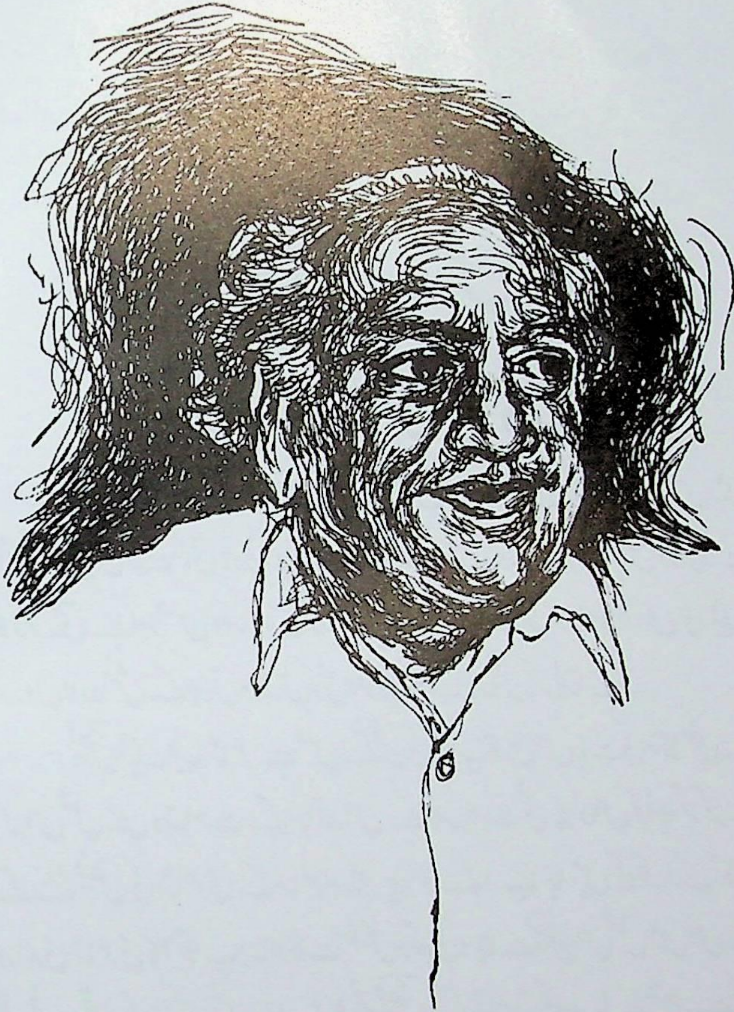
”تلخیِ امروز اور شیرینیِ فردا کا شاعر“

فیض احمد فیضؔ کی داستانِ زندگی کلفتوں اور راحتوں کی کہانی ہے، جس میں بالآخر صدیوں سے بہتی ہوئی نور کی ایک بوُند ہر شب کو ماہِ تمام کی سیمیں روشنی سے منّور کر لیتی ہے اور حسن وصداقت کا یہ نور سالہا سال کا احاطہ کرتا ہوا انسان کی نیک قدروں اور دانش کے جلال و جمال کو نئ جلوہ باری سے روشن کر لیتا ہے۔

فیضؔ ایک ایسا شاعر ہے جس کے فن کی تجزیہ نگاری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس عمل میں وضاحت کے ساتھ اس کے ہمہ جہت فنی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لئے فیض کی شاعری کے سالم اور بھرپور حوالے دیئے جائیں کیونکہ ایسی آفاقی اور ابدی شاعری کا انتخاب بسا اوقات مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن اس عمل میں اس کے فکر وفن پر تحریر کردہ کسی بھی مقالے کا حجم فیضؔ کے تمام تر مجموعہ ہائے شعر سے بھی زیادہ ہوگا جو کسی بھی تجزیہ نگار کے لئے عام طور پر ممکن العمل نہیں ہے۔

فیض احمد فیضؔ کرب کا شیدائی ہے جو حسنِ ماہ سے دل کو جلاتا ہے۔

فیض نے زندان کی آہنی زنجیروں سے تلواریں نہیں بلکہ قلم کی نوکیں بنالیں اور اس کا یہ بے ضرر مگر بااثر ہتھیار برِ صغیر کی اُردو شاعری کے مزاج میں ایک انقلابی تبدیلی لانے کا باعث بن گیا۔



مقام فیضؔ راہ میں کوئی جچا ہی نہیں۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

عمل: صادقین

کسی شاعر یا دانشور کو اگر جیل جانے کا اتفاق ہو اور اگر اُسے زندان میں دوسرے قلمکاروں، شاعروں یا ادیبوں کی اُن نگارشات کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ نصیب ہوا جو بجائے خود قید خانوں ہی میں تخلیق کی گئی ہوں تو اس تجربے کا عالمِ احساس ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ جہاں آپ نے کسی زندان نامہ میں دردِ دل یا غمِ جہاں کا نوحہ پڑھ لیا وہاں آپ کو یہ اپنی ہی زندگی کا حال دکھائی دیتا ہے۔ زندانی تخلیقات میں کسی اور قیدی کے خیالات میں استبداد اور وقتی جبر کے بوجھ تلے ایک آزاد فضا کی صبح کے طلوع کی بشارت دی گئی ہو تو یہ سارا منظر نامہ آپ کو اپنی ہی پا بہ جولاں زندگی کی کہانی نظر آتا ہے۔

میں خود اس تجربے کے انوکھے دور سے گزر چکا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد، جواہر لعل نہرو، سجاد ظہیر، ناظم حکمت اور جولیس فیوچک کے علاوہ ذوالفقار علی بھٹو اور سب سے بڑھ چڑھ کر میں اپنے آپ کو فیض احمد فیضؔ کے عاشقوں اور فدائیوں میں شمار کرتا ہوں۔

عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب فیض احمد فیض، سجاد ظہیر اور ان کے کئی احباب کو راولپنڈی سازش کیس میں ملوث کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا تو کشمیر میں بھی کشمیر سازش کیس میں ماخوذ کر کے مجھے دو سال تک قید و بند میں رکھا گیا۔ اس دوران میں نے اُن برگزیدہ اصحابِ دانش و قلم کی زندانی تخلیقات کا بھرپور اور پُر شوق مطالعہ کیا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ نہرو اور آزاد تو کئی سال تک تحریکِ آزادی ہند کے دوران جیل خانوں میں اپنے ہی وطن میں قیدیوں کی زندگی گزارنے پر مجبور کیئے گئے۔ ناظم حکمت کو تُرکی سے بالآخر اسی نوع کا المناک دور دیکھنے کے بعد روس جلاوطن ہونا پڑا اور چیکوسلواکیہ کے جولیس فیوچک کو عالمِ شباب میں ہی نازی عدالت نے برلن میں 25 اگست 1943ء کو پھانسی کی سزا سنائی جسے صرف تیرہ دن بعد عمل میں لایا گیا۔

تختۂ دار پر چڑھائے جانے سے قبل جیولس فیوچک نے موت کے فرشتے کو اپنی آنکھوں کے سامنے رقصاں دیکھ کر زندگی سے اپنی بے پناہ چاہت کو امر بنانے کے لئے یہ الفاظ رقم کر لئے:

''مجھے زندگی سے محبت تھی اور اُسی کے حُسن نے مجھے مرنے کے لئے میدان میں بھیج دیا۔ انسانو! مجھے تم سے محبت تھی اور میں خوش ہوتا تھا جب تم میری محبت کا جواب محبت سے دیتے تھے۔ جب بھی تم نے مجھے غلط سمجھا تو مجھے تکلیف ہوئی۔ تم میں سے جسے بھی میں نے تکلیف پہنچائی مجھے معاف کرو اور مجھے چاہنے والو! مجھے بھول جاؤ۔ یاس کو کبھی غم کے ساتھ وابستہ نہ کرنا۔ میری اماں اور باپ اور بہنو اور تم میری آگسٹینا اور میرے تمام ساتھیو! جنہیں میں نے ہمیشہ رفیق رکھا۔ تم سے میری یہ آخری وصیّت ہے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ آنسو غم کے میل کو دھولیں گے تو چند لمحے بیٹھ کر رو لینا لیکن دل کو ملول نہ کرنا۔ میں مسرّت اور شادمانی کے لئے زندہ رہا اور میں مسرّت اور شادمانی ہی کے لئے جان بھی دے رہا ہوں۔ اسی لئے میری قبر پر غم و یاس کا بُت نصب کر کے میرے ساتھ ناانصافی نہ کرنا''۔

جیولیس فیوچک کا یہ اقتباس یہاں پر اس لحاظ سے بر محل اور حسبِ حال ہے کہ فیض احمد فیضؔ کے یہاں ان دونوں کے خیالات اور حیات پرور محسوسات کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

اپنی رفیقۂ حیات ایلسؔ کے نام ایک خط میں فیضؔ بھی ناظم حکمت اور جیولیس فیوچک کے کل کی اُمید کا نقیب نظر آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''پبلو نرودا کی نظم For Singing Tomorrow بہت حسین ترکیب ہے۔ ہاں یہ سب کچھ آنے والے نغمہ سنج دلوں کے لئے ہے۔ آج کا درد بھی، آنسو بھی، کلفت بھی اور محرومی بھی۔ اگر آج کا دن موجود ہے تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اس طرح ہر دُکھ بھرا دن جو گزرتا ہے اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ تسکین ساتھ لاتا ہے کہ جو دن

گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد بھی جو دن آئے گا اُس سے مختلف ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو۔ اس لئے لازم یہی ہے کہ آنے والے دنوں پر نظر جمائے رکھیں اور بیتے ہوئے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں"۔ (1)

فیضؔ ہر بدصورتی میں خوبصورتی تلاش کرتا تھا۔ اس کی نظروں میں اگر سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں پڑے ہوئے کُتّے بھی دوسروں کے پھینکے ہوئے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے چھیننا بند کریں اور خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے کا عزم کریں تو وہ دنیا کو تبدیل کر سکتے ہیں اور آقاؤں کی ہڈیاں چبا سکتے ہیں۔ شرط صرف یہی ہے کہ کوئی اُن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے۔

حسنِ کائنات اور جمالِ انسانی پر مستانہ وار فریفتہ ہونے والا فیضؔ جب کریہہ المنظر نظّارے دیکھتا ہے تو اس کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے اور اسے سماج کے زخم خوردہ انسانوں میں ایک عجیب قسم کی زندگی کا جلوہ نظر آتا ہے جسے وہ پل بھر کے لئے اپنے محبوب کے عشق سے پرے اپنی نگاہوں کا مرکز بنا کر کہتا ہے:

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجئے
"مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"

جستجوئے حسن اور تلاشِ جمال کے اس شوق اور لگن کے بارے میں فیضؔ خود کہتا ہے "مجھے یاد ہے کہ ہم لاہور میں مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا۔ چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا، چاندنی بدرو اور ارد گرد کے کوڑے

کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی ۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُر اسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے۔ جب شہر کی گلیوں اور محلوں میں کبھی دو پہر کے وقت، کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کہ کوئی پرستان ہو"۔(2)

"صلیبیں میرے دریچے میں" میں اسی حُسنِ خیال اور دُنیائے حسن و جمال کے خوش آئند پہلوؤں کا شاعر نے یوں تذکرہ کیا ہے۔"ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج بوجھل مٹی بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اسے دیکھ کر دل بے پناہ اور قابل بیان مسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز ننھی کونپل کے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی ۔جیل کی دیواریں اور پہرہ دار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں ،سب غیر حقیقی ہیں ۔اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔جیل میں محرومیاں بہت ہیں لیکن جینے اور ہنسنے اور پیار کرنے کے اسباب میں یہاں بھی کمی نہیں ہوتی"۔(3)

فیضؔ تابناک اُمید، روشن مستقبل اور انسان کی ابدیت اور اس کی عظیم انسانی اقدار کا ایک مجسم تھا۔اس پس منظر میں جب وہ جیل خانے میں بھی تھا تو وہ اُسی ابدی امید کے نغمے ایک مخمور گویّے کی طرح گاتا تھا:

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطّر آتی ہے اشکوں سے منوّر جاتی ہے

فیضؔ کی تہلکہ مچانے والی شاعری کا سرُور اس کے ہم عصروں کے دل و دماغ کو بھی اپنے قابو میں کر چکا تھا۔اس کے ایک روسی مدّاح اور تجزیہ نگار

الیکزنڈر سرکوف نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ''ایک بار پرانی دہلی میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ جب مشاعرہ اختتام کو پہنچنے کو تھا تو سردار علی جعفری مائک پر آکر فیضؔ کے اشعار سنانے لگا۔ اُس کی ادائیگی اور اُس جیسے طرح دار آواز کے مالک کی زبانی، محفل پر گویا جادو طاری ہوا۔ ایسا لگا کی فیضؔ اس مجلس میں موجود تھا۔ سردار اس ادائیگی میں اس قدر کھو گیا کہ وہ اپنا کلام سنانا بھول ہی گیا۔'' (4)

دُنیا بھر میں جہاں جہاں بھی حرّیت کی عوامی تحریکیں چلی ہیں خواہ اُنہیں زور زبردستی اور طاقت کے بے محابا استعمال سے دبایا گیا ہو اُن کی کامیابیوں نے محکوم اقوام کو آزادی کی کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی زندگی عطا کی ہے۔ ان تحریکوں سے وابستہ عوامی جذبات اور عام ردِعمل کو لوک سطح پر ایک ایسی پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ ان سے منسوب کہانیاں، حکایات اور نغمات آج دنیا کے متمول لوک ادب میں شامل ہیں۔

فیضؔ جب داغستان کے دورے پر تھا تو اُسے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آیا جس کا مختصر تذکرہ وہ یوں کرتا ہے۔ ''داغستان میں خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ بساط بھی اُلٹ گئی اور چودھویں صدی میں امیر تیمور نے داغستان پر لشکر کشی [illegible] جو یہاں کے کوہ و دمن کا سب سے خونچکاں باب ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور [illegible] یہیں پر کٹے ہوئے سروں کے مینار بنوائے اور سر بُریدہ لاشوں کے انبار لگائے۔ داغستان کے بہت سے پرانی عوامی گیت، جنگ نامے اور قومی سرفروشوں کے قصے کہانیاں اسی دور سے متعلق ہیں۔'' (5)

فیضؔ آنے والے کل کے تناظر کو بھی اپنی دور بین نگاہوں سے دیکھ کر بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی کرنے والا ایک منفرد فنکار تھا۔ بیسویں صدی میں جہاں اُس نے ایران، چین، سنکیانگ اور افریقہ کی کشتہ سرزمین اور عوام کے سوختہ دلوں کی دھڑکنوں کو اپنے احساس کے کان لگا کر پوری طرح سُن لیا۔ وہاں

اُس کے لاشعور میں اُن اقوام میں اُس وقت آزاد ہوئے ممالک میں استعمار اور شخصی حکومتوں کے ناقابلِ برداشت اور عفونت زدہ تسلسل کے اختتام کا بھی ایک اندازہ تھا۔ یہ صورتِ حال مصر، لیبیا، بحرین، ٹیونس، شام، عراق اور افغانستان میں شعلہ بداماں ہے۔

جولیس روزن برگ اور اس کی اہلیہ ایتھل دونوں امریکی اشتراکی تھے جنہیں 1953ء میں امریکہ نے موت کے گھاٹ اُتارا۔ یہ سزا اُنہیں اس لئے دی گئی کہ وہ مبیّنہ طور پر دورانِ جنگ جاسوسی میں ملوث تھے۔ ان الزامات میں ایٹم بم سے متعلق جانکاری سوویت یونین کو دینا بھی شامل تھا۔

امریکہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جب عام شہریوں کو سزائے موت دی گئی۔ اس سلسلے میں افسوس ناک بات یہ ہے کہ امریکی حکومت نے اس ضمن میں کئی دیگر ایسی شخصیات کو بھی بہیمانہ طور پر زیرِ عتاب لایا جن کے نام کا ایک حصہ روزن برگ تھا۔ جولیس ایک برقیاتی انجینئر تھا اور ایتھل ایک اداکارہ اور گلوکارہ تھی۔ ان دونوں کے خلاف مقدمہ اگست 1950ء میں شروع ہوا۔ بالآخر ان دونوں کو برقیاتی کرسی پر بٹھا کر بجلی کے جھٹکوں سے ان کی جان نکالی گئی:

نہ مدّعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

''زنداں نامہ'' کے آغاز میں سابق میجر محمد اسحاق ''روداد قفس'' کے عنوان سے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' روزن برگ جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کے لکھی گئی ہے جو مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہے۔ فیضؔ کی اس نظم کی آفاقیت عجیب وغریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ہر ملک کے شہیدوں کو ایک

صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، سرنگا پٹنم، جھانسی، جلیاں والہ، قصہ خوانی ، سٹالن گراڈ، ملایا کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراقش، ٹیونس سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور تہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑتے طلباء، مراقش، ٹیونس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت سب ایک ہی جاں فروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں:

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ نظم فیض نے روزن برگ جوڑے کے قتل کے تقریباً ایک سال بعد 15 مئی 1954ء کو منٹگمری جیل میں لکھی۔ فیض قید و بند کے دن ہی گزار رہا تھا کہ ایران میں وطن پرستوں کو جیل خانے میں گولیوں کا نشانہ بنانے کی خبر ایک امریکی جریدے میں شائع ہوئی اور اس خبر میں قتل گاہ میں لی گئی مقتولین کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ فیض فارسی زبان کا بہت بڑا عاشق تھا اور اس حوالے سے وہ سعدی اور حافظ کے وطن سے بھی محبت کرتا تھا۔ اس خونی واقعہ کو بھی اس نے ا[illegible] میں بیان کر کے عاشقانِ ایثار کے بارے میں اس شعر کو صحیح ثابت [illegible]

کشت گان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

اسی طرح فیض نے اُن فلسطینی شہداء کے لئے دو نظمیں لکھیں جو اُن کے بقول ''پردیس میں کام آئے''۔ ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے، ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لئے اور عرب اسرائیل جنگ کے بعد لکھی گئی ایک نظم اُن کے مجموعہ ''سرِ وادیِ سینا'' میں شامل ہے۔ 1970ء میں مشرقی بنگال میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی اُس سے بھی فیض متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے تین سال بعد

1974ء میں قتلِ بنگال کی یاد نے اُسے بے تاب کر دیا اور اُس نے ''ڈھاکہ سے واپسی پر'' کے نام سے ایک مختصر سی نظم میں اپنے دلی کرب اور فکری اضطراب کا اظہار یوں کیا:

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبّے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

فیضؔ اسی طرح چینی عوام کی محکومی میں ایک جلوۂ حرّیت دیکھ چکا تھا جس کا اشارہ اُس سے پہلے علامہ اقبال نے اس شعر میں کیا تھا:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

اس کے بعد فیضؔ نے پیکنگ کے عنوان سے ''دستِ تہہِ سنگ'' میں چینی قوم کی بیداری کی نوید اس طرح سے دی:

یوں گماں ہوتا ہے کہ بازو ہیں میرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک میرے تن کی حد ہے
دل میرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے
اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہ سوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا
اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا
ساقیا رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربہ کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

''ایرانی طلباء کے نام'' امن اور آزادی کی جدوجہد میں جوانوں کی قربانیوں کو فیضؔ نے ان اشعار میں ایک جاودانی حیثیت عطا کی ہے:

یہ کون سخی ہے
جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن چھن
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی ہیں
اِن جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم مرجان
جگمگ جگمگ رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جُھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

افریقہ کے غلاموں کی اذیتوں کا درد بھی فیضؔ کا اپنا دُکھ ہے جسے مٹانے کے لئے وہ افریقی حبشیوں کے ڈھول کی گھن گرج والے اس رجزیہ میں [illegible] کر گاتا ہے:

آجاؤ میں نے سن لی تیرے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ مست ہوگئی میرے لہو کی تال
آجاؤ افریقا

آجاؤ میں نے دھول سے ماتھا اٹھالیا
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
آجاؤ افریقا

جن شاعروں کے خیالات پر الہام کا ورود ہو وہ آنے والے حالات کے بارے میں تصوّراتی طور پر اُن کوائف کی جھلک واضح طور پر دیکھتے ہیں جو اقوام اور ممالک کی تاریخ ساز تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ ایک اور ممتاز ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین نے پچاس سال قبل تلنگانہ کی تحریک کو اپنے اشعار سے حرارت بخشی تھی اور آج یہ تحریک ایک ملک گیر موضوع کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔

مشرق وسطیٰ میں افریقہ میں اس وقت جو انقلاب آفرین اور ہنگامہ خیز واقعات رونما ہو رہے ہیں ان کی صدائے بازگشت فیضؔ کی اُن منظومات میں آج بھی سنائی دیتی ہے جو اُس نے گزشتہ صدی کے پانچویں عشرے میں تخلیق کیں۔ اس قبیل کی فیضؔ کی رجز خوانی ایک پیغمبرانہ پیش گوئی کی طرح اس زُود حس اور دوربین سخنور کی معاملہ فہمی اور سیاسیاتِ عالم پر اس کی گہری نظر کا ماحصل ہے جب وہ کہتا ہے:

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے
اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے بانیوں میں شامل فیضؔ نے اُس وقت ادبی میدان میں قدم رکھا جب سامراجی اور نوآبادیاتی طاقتوں نے ساری دنیا کو زیر کر لیا تھا اور ہندوستان ان کے آہنی شکنجے سے اپنے آپ کو چھڑانے کی خاطر تحریک حرّیت کے میدان کارزار میں برسرِ پیکار تھا۔ یہ قوتیں معاشرہ کے باشعور طبقوں کے لئے ناقابل برداشت بنتی جا رہی تھیں۔ اس پسِ منظر میں ترقی پسند ادبی

تحریک انگلستان سے نکل کر ہندوستان میں اُس وقت میں پہنچی جب سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور فیضؔ اس کے قافلہ سالار بن گئے۔

فیضؔ صرف چھ سال کا تھا جب انقلاب روس واقع ہوا جس نے ولادِ میر لینن کی قیادت میں سوویت یونین کی سیاسی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اس انقلاب کے اثرات ایشیا اور افریقہ تک پہنچے۔ ہند میں جواہر لعل نہرو، آچاریہ نریندر دیو، اکبر الٰہ آبادی، حسرت موہانی، سروجنی نائیڈو، مولانا برکت اللہ بھوپالی اور منشی پریم چند اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہوئے اور انہوں نے ابتداء میں تحریک کے شانہ بشانہ کام کیا۔

فیضؔ نے جب 1935ء میں اپنے ایک ساتھی سے لے کر کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھا تو وہ اسے اتنا پسند آیا کہ وہ اسے پلٹ پلٹ کر پڑھتا رہا اور ہزار جان سے اس پر فدا ہوتا رہا۔ (6)

جب ہندوستان آزاد ہوا تو کئی اور اہلِ قلم اور اصحاب دانش کی طرح فیضؔ بھی قدرے نا اُمید ہوا کیونکہ اس کی نظر میں 1947ء کی آزادی کا ثمر صرف حاکم سیاست دانوں کے لئے تھا اور عام آدمی بدستور اپنے آقاؤں کے لئے نوکری [illegible] گزار رہا تھا۔ فیضؔ نے اس نام نہاد آزادی کو یوں رد کیا:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
نجاتِ دیدہ ودل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

آزادئ ہند کے تناظر میں شاعرِ کشمیر غلام احمد مہجورؔ نے ''آزادی'' کے عنوان سے ایک ایسی ہی طنزیہ نظم لکھی ہے جس میں فیضؔ ہی کی طرح آزادی کے بعد کے ماحول اور بالخصوص کشمیر میں اس کے استحصال کا نقشہ ایک مقبولِ عام اسلوب



فیض احمد فیض



غلام نبی خیال اور فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی علی گڈھ میں "فیض احمد فیض عالمی سمینار" کی تقریب پر

اور انداز میں کھینچا گیا ہے۔

فیضؔ دوسری جنگِ عظیم میں فوج میں شامل ہو کر میجر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اس کے بعد پاکستانی فوج کے ایک اہم رُکن میجر جنرل اکبر خان کے ساتھ اُس کے مراسم پیدا ہوئے تھے۔ پاکستان وجود میں آنے کے بعد لیاقت علی خان کی سرکار کی طرف سے کشمیر کے تئیں سرد مہری کا مظاہرہ اکبر خان کے لئے سوہانِ روح بنتا جا رہا تھا اور اس نے فیضؔ کے ساتھ صلاح ومشورہ کر کے لیاقت سرکار کو گرانے اور اس کی جگہ ایک ترقی پسند حکومت قائم کرنے کا قصد کیا لیکن یہ خیال سوچ بچار تک ہی محدود رہا پھر بھی فیضؔ کو گرفتار کیا گیا اور اس کے خلاف کئی مقدمے دائر کئے گئے۔ اگر چہ یہ مقدمات اپنے منطقی انجام کو پہنچے بغیر فیضؔ اور اس کے ملزم ساتھیوں کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکے اور فیضؔ کو رہائی بھی نصیب ہوئی مگر فوجی آمر جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں اُسے پھر 1955ء میں حراست میں لے کر جیل خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس وقت فیضؔ کے خلاف بحیثیت ایک صحافی اُن ملک دشمن تحریروں سے لوگوں کے جذبات بھڑکانے کا الزام تھا جو اُس نے کبھی قلم بند کی ہی نہیں:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے (7)

فیضؔ رہائی کے دنوں میں "پاکستان ٹائمز"، "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور "امروز" اخباروں کا مدیر بھی رہا اور بعد میں "لیل ونہار" جیسے ایک باوقار جریدے کی ادارت بھی سنبھالی۔ اُس نے عربی اور فارسی کی تعلیم شمس العلماء مولوی میر حسن سے حاصل کی تھی اور بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ فیضؔ حافظ قرآن بھی تھا۔

کشمیر کے حوالے سے اس حسین خطۂ ارضی کے ساتھ اُس کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ البتہ یہ ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ فیض کا نکاح سری نگر میں شیخ

محمد عبداللہ نے پڑھوایا جب فیض کی شادی ایلس نام کی ایک انگریز خاتون سے طے پائی جو ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی سالی تھی۔ نکاح خوانی کی رسم اکتوبر 1941ء میں سری نگر میں ڈاکٹر تاثیر کی قیام گاہ پر انجام دی گئی۔ بعد میں ایک سادہ اور مختصرسی دعوتی تقریب ہوئی جس میں اہل خانہ کے علاوہ فیضؔ کے دو ترقی پسند شاعر دوستوں جوشؔ ملیح آبادی اور مجازؔ لکھنوی نے شمولیت کی۔

اس سلسلے میں کشمیری لال ذاکر نے ایک روز مجھے بتایا کہ فیضؔ کی نکاح خوانی کی رسم کے دوران وہ بھی اس مختصرسی محفل میں موجود تھے۔ ذاکر کے بقول اس رسم کی تکمیل کے اگلے دن مجاہد منزل سری نگر میں ایک محفلِ مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ اس محفل میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، مجازؔ لکھنوی اور اختر رضوانی نے شرکت کی۔ ذاکر صاحب کہتے ہیں کہ جب حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص اور دلکش ترنم کے ساتھ شاہنامہ اسلام سے اپنا کلام سنایا تو گویا اس نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس کے بعد ایک عام قسم کے شاعر اختر رضوانی کی باری آئی۔ سامعین سوچنے لگے کہ حفیظؔ کے بعد اختر کو پڑھوانا ساری محفل کا لطف ضائع کر دے گا لیکن جب اخترؔ نے حفیظ سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا:

شاہنامہ اسلام کے لکھنے والے!
اسلام کا شاہی سے تعلق کیا ہے؟

ذاکر صاحب نے کہا کہ اس شعر سے ایسا سماں بندھ گیا کہ ایک چھوٹے سے اخترؔ نے ایک بہت بڑے حفیظ کو پچھاڑ دیا۔ (8)

اس بارے میں اور بھی بیانات موجود ہیں۔ شمیم احمد شمیم نے لاہور میں فیض کے ساتھ ایک شام کو اپنی ملاقات کے حوالے سے فیض کی زبانی یہ بات قلمبند کی کہ ”آپ کو معلوم ہے کہ شیخ صاحب نے میرے نکاح پڑھے ہیں اور نکاح نامے پر صادق صاحب، بخشی صاحب، ڈاکٹر نور حسین اور کے۔ ایچ۔ خورشید کے دستخط

گواہوں کی حیثیت سے ثبت ہیں۔اس لحاظ سے میرا نکاح نامہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔(9)

فیضؔ اور ایلس کی شادی کے بارے میں یہ پسِ منظر بیان کیا گیا ہے کہ فیضؔ 1938ء میں امرتسر میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی قیام گاہ پر اپنی ہونے والی شریک حیات سے پہلی بار ملاقی ہوا۔تاثیر اس وقت وہاں کالج میں فیضؔ کا ہم جماعت تھا۔ تاثیرؔ ہی نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا منشور تیار کیا تھا جہاں اس نے فیضؔ کی منگیتر ایلس کی ہمشیرہ کرسٹوبیل المعروف بلقیس کے ساتھ شادی کی تھی۔ ایلس اپنی بہن سے ملنے ہند آئی تھی اور 1939ء میں دوسری جنگِ عظیم کے چھڑ جانے کی وجہ سے وہ واپس انگلستان نہیں جا سکی۔ ایلس سولہ سال کی عمر ہی سے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھی جس نے آزادیٔ ہند کی تحریک کے دوران جواہر لعل نہرو کے ایک قریبی ساتھی کرشنا مینن کے سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔

ایک دوسرے کے دامِ عشق میں گرفتار ہونے کے بعد جب فیضؔ نے ایلس کا نام بدل کر کلثوم رکھ دیا۔اس ناشنیدہ نام کے بارے میں کسی کو کوئی واقفیت نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب فیضؔ نے اپنا دوسرا مجموعۂ کلام "دستِ صبا" کلثوم ہی کے نام کیا تو یار دوستوں نے انگلیاں اٹھائیں اور طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

فیضؔ اور ایلس کا جو نکاح نامہ تیار کیا گیا وہ اُس نکاح نامے کی نقل تھا جو علامہ اقبال نے تاثیر اور بلقیس کے لئے بقلم خود تیار کیا تھا اور جسے حقیقی معنوں میں ایک مکمل اسلامی اور ترقی پسند دستاویز کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے مطابق پہلی بار ایک منکوحہ کو اپنے خاوند کو طلاق یا خلع دینے کا پورا حق اور اختیار دیا گیا تھا۔اس قاعدے کو بعد میں پاکستان میں مسلم فیملی آرڈننس 1961ء کے ذریعہ تبدیل کیا گیا۔

انگریزی جریدے "تھنک انڈیا" کے جنوری۔مارچ 2011 کے شمارے

میں امریتا پریتم اور ایلس فیضؔ کے مابین ایک گفتگو کا خلاصہ درج ہے جس میں ایلسؔ کہتی ہے کہ ”ہماری نکاح خوانی کشمیر میں ہوئی۔ کشمیر کے مہاراجہ نے ہمیں اپنا گرمائی پیلس دیا۔ شیخ عبداللہ نے ہمارے نکاح پڑھے۔ بارات میں صرف تین لوگ تھے۔ فیضؔ، اس کا بڑا بھائی اور اس کا دوست نعیم۔ بعد میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں جوشؔ اور مجاز لکھنوی بھی حاضر تھے۔ ہم کشمیر میں تین دن تک رہے اور پھر ولیمہ کی تیاریوں کے لئے واپس لاہور لوٹے“

ایلس کا یہ بیان کہ وہ اور فیضؔ مہاراجہ کے شاہی محل میں ٹھہرے، بہت حد تک تحقیق طلب امر ہے۔ مہاراجہ کو فیضؔ کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں تھا کیونکہ یہ شاہی حکام فیضؔ جیسے اشتراکیوں یا ترقی پسندوں کو ہمیشہ اپنا دشمن تصوّر کرتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ جب ہری سنگھ کو یہ پتہ چلا ہوگا کہ فیضؔ کے نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھوائے ہیں تو اُس نے فیضؔ کے تیئں زیادہ سے زیادہ بیگانگی کا مظاہرہ کیا ہوگا کیونکہ شیخ عبداللہ نے اُس وقت مہاراجہ کے شخصی راج کے خلاف ایک عوامی رہنما کی حیثیت میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

اس سلسلے میں جب میں نے اس واقعہ کی وضاحت اور توثیق کے لئے فیضؔ کی صاحبزادی پروفیسر سلیمہ ہاشمی سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے 24/نومبر 2011ء کو لاہور سے میرے نام ای میل کے ذریعہ یہ اطلاع فراہم کرلی۔

”یہ نکاح خوانی اُسی عمارت میں ہوئی جو اب مولانا آزاد روڈ پر واقع زنانہ کالج ہے۔ میری والدہ، دختر اور خالہ کئی سال پہلے سری نگر گئی تھیں۔ یہ غالباً 1986ء یا 1987ء کی بات ہے۔ وہ اُس کمرے میں چلی گئیں جہاں یہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اب اس کمرے میں کالج کی لائبریری قائم ہے۔ یہ بیواؤں کا پیلیس مہاراجہ کی طرف سے ڈاکٹر تاثیر کو عاریتاً دیا گیا تھا جہاں وہ 1941ء میں قیام پذیر تھا۔“

فیض نے البتہ شیخ عبداللہ کی وفات پر ایک تعزیتی پیغام بیگم عبداللہ کو

ماڈل ٹاون لاہور میں اپنی رہائش گاہ سے جس میں اُس نے اپنے غم کا اظہار یوں کیا'' شیخ صاحب ہزاروں اور لاکھوں کے محبوب تھے اور ہم بھی اُن کے انہی عاشقوں میں شامی ہیں۔ اگر چہ ہم سالہا سال سے نہیں ملے لیکن گزشتہ اور خوش ایا مکی یادیں ہمارے دلوں میں ہیں جو ہمارے لئے ایک سرمایۂ افتخار ہے۔

ہم بھی لاکھوں سوگواروں کے ساتھ شیخ صاحب کی وفات کا ماتم کرتے ہوئے آپ کو اپنی تمام تر ہمدردیاں بھیجتے ہیں''۔(10)

ہند پاک تعلقات کے حوالے سے فیضؔ نے اپنا مطمع نظر مختصراً کشمیری لال ذاکر کے ساتھ اُس ملاقات میں واضح کیا جو 31/جولائی 1978ء کو چنڈی گڑھ میں اُس وقت مسز چمپا منگت رائے کے مکان پر ہوئی جب فیضؔ پھر ایک بار ہند آ کر اسی مکان میں قیام پذیر تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کو مضبوط کرنے کے لئے اہل قلم کیا کر سکتے ہیں۔ فیضؔ نے یہ معنی خیز جواب دیا تھا'' شاعر یا تو پیار کر سکتا ہے یا اپنا دل جلا سکتا ہے۔ امن اور محبت کا پیغام دینے کے لئے ایک ادیب یا شاعر سے بہتر اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا''۔

اسی پسِ منظر میں فیضؔ نے ساری دنیا کے درد کی دہکتی آگ کو اپنے دل سے ہم آغوش کر کے اسے بار بار جلایا تھا تا کہ دُکھ بھرے سنسار کی تکالیف کا آتش فشاں سبزہ زار امن اور ترقی کے پھولوں کا سدا بہار گلستان بن جائے۔(11)

فیضؔ کو جن مقدمات میں ملوث کیا گیا تھا وہ ملک سے بغاوت اور حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش سے متعلق تھے۔ عام طور پر ایسے الزامات کی عدالتی طور پر توثیق ہونے کے نتیجے میں ملزم کو سزائے موت ہو سکتی ہے۔ فیضؔ اپنے اس نادیدہ انجام سے پوری طرح واقف تھا لیکن اُس نے اس خوف کا پردہ پھاڑ کر اپنے سارے وجود کو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس پر حاوی ہونے کا قصد کیا تھا۔ جیولیس فیوچک اور روزن برگ جوڑے کے افسوس ناک انجام کو اپنے تصورات کی دنیا میں

ایک تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے لانے کے باوجود فیضؔ نے آہنی سلاخوں کے پگھلنے اور زنجیروں کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا ایک غیر مرئی عمل اپنی امید کے کینواس پر نقش کیا تھا اور وہ زندگی کی اس رنگینی اور حسن کے سدا بہار گلشن میں گویا ٹہلتے ٹہلتے گنگنا رہا ہو۔ فیضؔ کی نظم ''آخری خط'' موت کے اسی تصوّر کی عکاسی ہے۔ اگرچہ شاعر کی اس نظم میں رجائیت سے زیادہ قنوطیت کا عنصر حاوی نظر آتا ہے مگر یہ اُس کی ایک وقتی اور لمحاتی کیفیت ہے جسے اس کا بیشتر کلام پُر اُمید اور مثبت تصوّر حیات کے والہانہ پن سے پسِ منظر میں ڈال دیتا ہے۔ اس فن پارے میں شاعر نے بہر کیف اس بھیانک حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جو اُس وقت ایک ناگہانی اور غیر متوقّع موت بن کر اس کے سامنے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگاتی ہے جب وہ زندگی سے پیار کرتا ہو اور اس کے شب و روز کو سجانے اور سنوارنے کے لئے ہر متاع کو نثار کرنے کا خواہش مند ہو۔

نظم ''آخری خط'' یوں ہے:

وہ وقت میری جان بہت دُور نہیں ہے
جب درد سے رُک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو میری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی
شاید میری اُلفت کو بہت یاد کرو گی!
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی میری گور پر تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسین پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلوگی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسوگی!
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دلِ ناکام کا احساس نہ ہوگا

القصّہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرّت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

موت کا خالی تصوّر تو کسی بھی سخت جان یا آہنی عزم والے شخص کے دل کو بھی دہلا سکتا ہے اور شاعری میں بھی جب فیضؔ کے تصوّر حیات کو پرکھیں تو وہاں زنداں کی محکم اور پابند زندگی سے بھی وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ زنداں میں چند چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی اپنے شب و روز کو شاندار بنانے کی بات کرتا ہے۔ ایلس کے نام ایک خط میں لکھتا ہے ''جیل خانے [illegible] خیر آسودگیٔ نفس کا کچھ بدل مجھے اُس خوشبو سے ہاتھ آجات[illegible] اور جسے میں ہر رات اپنے تکیے پر چھڑک دیتا ہوں۔ پہلی بار جب یہ ہمارے برآمدے میں بکھری تو شہرِ زنداں میں ہنسی دوڑ گئی''۔(12) ایک اور مراسلے میں فیضؔ اسی طرح کے ہشاش بشاش جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''اسیری کے سب سے بُرے دن کٹ چکے ہیں اس لئے کہ اب کچھ بھی ہو، نہ قیدِ تنہائی کا سامنا باقی ہے نہ پولیس کی تکلیف دہ پوچھ پاچھ کا ڈر اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں...... تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دل نہیں دُکھتا اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ محکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دِکھائے بالآخر بہت خوب شے ہے اور بہت حسین بھی''۔(13)

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

''دریچہ''فیضؔ کی وہ دہکتی اور حدت وحرارت سے بھرپور نظم ہے جس کا تانا بانا اُس نے زندان میں تصوّراتی طور پر اُس وقت باندھا ہوگا جب وہ جیل کی کسی کھڑکی سے باہر دیکھ کر اور پہروں تک ٹکٹکی باندھ کر ہر چیز کو اپنی نظروں میں سمو لیتا ہے۔ایک طرف اسے آزاد فضاؤں میں پرندوں کے نغمے سنائی دیتے ہیں اور وہ آزادی کو زندگی کی سب سے بڑی نعمت تصوّر کرتا ہے مگر دم زدن میں یہ منظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر دور چلا جاتا ہے۔وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب کر انسانی زندگی میں پیچھے کی طرف مڑ کر جھانکتا ہے تو وہاں پر اسے ہزاروں مسیح صلیبوں پر اپنے خون چکاں چہرے لئے لٹکے نظر آتے ہیں۔انسانیت ماتم کناں ہے کہ جن عظیم انسانوں نے ایک عام آدمی کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے اپنی زندگیاں صرف کیں انہیں بعد میں دار ورسن کی آزمائش سے گزرنا پڑا:

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اِن مظلوموں میں سقراط،عیسیٰؑ ،منصور الحاج اور کئی اور جان نثارانِ عشق الٰہی تھے جن کا ذکر فیضؔ کے محسوسات میں تلاطم پیدا کرتا ہے اور وہ کہتا ہے:

گڑی ہے کتنی صلیبیں میرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لئے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قربان
کسی پہ قتلِ مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسارِ دونیم

کسی پہ بادِصبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہرو جمال
لہو میں غرق میرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

فیضؔ کی نظروں میں وہ جاں نثار بہت بڑی قدرومنزلت کا مالک تھا جس نے وطن کی آزادی اور اُس کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کی۔ اُس کی منظومات میں شہید کو بار بار خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور وہ خونِ شہیدان کو صحرا میں لالہ زار کا رنگ اور شبِ تار میں روشنی کی جلوہ آرائی تصوّر کر لیتا ہے۔

شہداء کے لئے خونِ جگر سے اپنے نغمات تحریر کرتے وقت فیضؔ ان کی کسی حد بندی کا قائل نہیں۔ یہ شہید عراق کا ہو، افغانستان کا ہو، کشمیر کا ہو یا فلسطین کا ہو اسے فیضؔ نے اپنے دل وجان سے چاہا ہے اور اس کی زندگی کے جاودان ہونے کا برملا اظہار کیا ہے:

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں
قریب آ اے مہہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

اور:

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے؟
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے ؟
رختِ دل باندھ لو! دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

شاعری دنیا میں خوبصورتی کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ یہ وہی خوبصورتی ہے جسے کیٹس نے Truth is beauty, beauty is truth کہا تھا۔ فیضؔ نے خاص طور پر اپنے قید و بند کے چار پانچ سال کے دوران اس حدیثِ حُسن کے صحیفے کو اپنے فن کی جولانیوں سے آراستہ کرنے اور اسے دنیا تک پہنچانے کا ایک عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

فیضؔ کے ایک انگریزی مترجم پروفیسر وی جی کیرنن کے بقول ''اب تک اُردو شاعری کا فنی کمال غالبؔ سے شروع ہو کر فیضؔ پر ختم ہوا ہے اور اس آغاز و اختتام کو اس دنیائے سخن کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے''۔ کیرنن بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ''فیضؔ کی بہترین شاعری وہی ہے جو اُس نے قید خانوں میں تخلیق کی ہے''۔ ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ''غالبؔ اور فیضؔ دونوں نے وہ آوازیں سن لیں جو نہیں بیرونی دنیا سے پکار رہی تھیں اور جو آواز فیضؔ کے دل و ذہن پر چھا گئی وہ کارل مارکس کی آواز تھی''۔ (14)

فیضؔ کی حیاتِ زندانی کے دورانیہ کا حال اُسی کے ایک ہم قفس اور معتمد سابق میجر محمد اسحاق نے ''زنداں نامہ'' کے دیباچہ کی شکل میں ''رودادِ قفس'' کے عنوان سے تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔

فیضؔ کی شاعری کو پڑھا جائے تو اس سے سینکڑوں اشعار خود بخود یادداشت کے خزینے میں اُتر کر مہکتے ہوئے پھولوں کی طرح ہونٹوں پر کھلتے رہتے ہیں۔ یہ کمالِ فن کا وہ معجزہ ہے جس کا بازی گر اقبالؔ نے جرمنی کے شاعر گوئٹے

کو قرار دیا تھا۔ اُردو دنیا میں قبولِ عام کا یہ رُتبہ پانے کا افتخار غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد صرف فیضؔ کو حاصل ہوا ہے۔

فیضؔ کے یہاں تخلیقی عمل میں ترتیب نظر نہیں آتی۔ وہ دماغ، قلم اور کاغذ کی ایک ایسی تکوینی دنیا میں رہتا تھا جہاں کبھی کبھی ایک فن کار اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی کئی نظمیں مکمل ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دی گئیں۔ ''مہہ وسالِ آشنائی'' میں اس نے کئی ایسی منظومات بھی شامل کر لیں جو سوویت یونین کے دورے کے اثرات سے مرتّب ہوئی تھیں اور کسی شعری مجموعہ ہی کا ایک حصہ بن سکتی تھیں۔ اگرچہ ان شعری تخلیقات میں فنی نزاکتوں اور تخلیقی برتری کی کمی ہی نظر آتی ہیں۔ فیضؔ کی دو اوّلین مطبوعات ''نقشِ فریادی'' اور ''دستِ صبا'' بہت حد تک کتابچے ہی کہلائی جا سکتی ہیں۔ اُس کی کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے شائع ہوئی اور ''کلیاتِ فیض'' کے عنوان سے ایک اور ایڈیشن میں اس کی کئی اہم شعری اور نثری تخلیقات یا تو حذف کی گئیں یا ان میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ ان تخلیقات میں اگرچہ کئی ایک فیضؔ کی زندگی میں ہی مرتب ہوئیں مگر اس نے کبھی اس ط[illegible] نہیں اپنایا جسے حسن ترتیب کہا جاتا ہے۔

فیضؔ نے نعت بھی لکھی۔ مرثیہ امام بھی لکھا اور اپنی مادری زبان پنجابی میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اس کی اُردو شاعری ہی نے اسے مرتبہ کی رفعتوں تک پہنچایا جس کا لبِ لباب اس مصرعہ میں دیکھا جا سکتا ہے:

عشق اپنے مجرموں کو پا بہ جولاں لے چلا

فیضؔ کی نثری تخلیقات میں ''مہہ وسالِ آشنائی'' اور ''صلیبیں میرے دریچے میں'' کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''میزان'' کے عنوان سے فیضؔ کے تنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہاں فیضؔ کی نثر کے حوالے سے ایک اہم مضمون کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے جو اس نے غالبؔ کی

مشہور غزل ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے'' کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے لکھا جو فروری 1974ء میں دہلی کے اردو جریدے ''آجکل'' میں شائع ہوا۔ یہ مختصر مضمون پڑھ کر فیضؔ کی شعر شناسی اور سخن فہمی کے حوالے سے اس کی نکتہ دان نظر کی وسعتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آل احمد سرور نے فیضؔ کی ملکوتی نغمگی اور اس کے الہامی آہنگ شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خوبصورت الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ''فیضؔ محض وارداتِ قلب کی گرمی اور گداز پیدا کرتے ہیں...... فیضؔ نے زندگی کی صداقتوں سے جو نغمگی حاصل کی ہے وہ جدید شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجاز سے بہتر طور پر انقلاب کے نغمے فیضؔ نے گائے ہیں۔ فیضؔ اپنا ایک الگ اسلوب رکھتے ہیں جس میں کتنے ہی اُردو اور انگریزی شعراء کی گونج سنائی دیتی ہے مگر آواز اُن کی اپنی ہے''۔(15)

فیض احمد فیض کی ذاتی زندگی کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا پیکر نور کی نقرئی چادر میں لپٹا ہوا ایک روشن مجسمہ تھا جس نے اپنے آس پاس کی فضاؤں کو اپنی صاف و شفاف کرنوں سے آلودگی سے بچایا اور وہ ذاتی طور پر بھی انسانی شرافت، اخلاقی سربلندی اور جذبہ تحمل کی ایک منفرد مثال بن گیا۔ کہتے ہیں فیضؔ نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا لفظ یا جملہ زبان پر نہیں لایا جسے غیر پارلیمانی یا عامیانہ کہا جائے۔ صرف ایک بار اُس نے پاجی کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس نے نطشے کی کتاب ''بقول زرتشت'' پڑھنے کے بعد جرمنی کے اس فلسفہ دان کے بارے میں یہ کہہ کر زبان پر لایا کہ ''اگر نطشے زندہ ہوتا تو جرمنی کے نازیوں سے یقیناً لڑتا۔ اس وجہ سے کہ نازیوں نے اُس کے فکر و خیال کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور اس کی تحریر کے خدوخال بالکل مسخ کر دیئے ہیں۔ تھا تو وہ بھی پاجی لیکن بہت حساس اور شاعرانہ قسم کا''۔(16)

فیضؔ کی سنجیدہ شخصیت اور اس سے بھی زیادہ سنجیدہ اُس کی شاعری اور درد و

عذاب میں ڈوبی ہوئی اُس پھڑکتی نبض کی ہر دھڑکن کی باتیں تو ہوئیں، اب ذرا اس تحریر کے آخری حصے میں فیضؔ کی شخصیت کے اس پہلو کی بھی بات ہو جائے جس میں طنز و مزاح کے حوالے سے اس کی ہر ضرب کاری ہر اُس شخص پر پڑتی ہے جس نے بھی فیضؔ کو اپنی بذلہ سنجی سے قائل یا مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

فیضؔ ایک خاموش پسند شاعر اور ایسی گفتار کا مالک تھا جو بعض اوقات اُس کی صحبت میں بیٹھے احباب بھی مشکل سے سن پاتے تھے۔ کیونکہ فیضؔ زبان سے نہیں بلکہ ہونٹوں سے نہایت دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ ایک بار اس کے قریب ترین دوست سید سجاد ظہیر نے تیوریاں چڑھا کر فیضؔ سے کہا: ”یہ کیا ہے کہ تم ہونٹوں سے بات کرتے ہو جو کسی کے پلے نہیں پڑتی اور اس زبان کو تم نے کہاں رکھا ہے جو اظہار و بیان کے لئے ہے جب تم نے خود کہا ہے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے، بول زباں اب تک تیری ہے

فیضؔ نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اُسی لہجے میں جواب دیا۔ "بنے بھائی! یہ صحیح ہے کہ میں ہونٹوں سے بات کرتا ہوں کیونکہ میرے ہونٹ یعنی لب آزاد ہیں لیکن میں زبان سے بات نہیں کر سکتا کیونکہ اس پر اب بھی تالے چ[illegible] ہیں“۔

فیضؔ نے قید خانے میں اپنی زندہ دلی کو برقرار رکھنے کے لئے وہاں کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے بقول ایک بار یارانِ زنداں نے ایک بہت ہی پر تکلف دعوت کا اہتمام کرنے کا ارادہ کیا اور ایک منقش دعوت نامہ دیگر احباب کو بھی بھیجا گیا جس پر یہ تحریر درج تھی: اے کلاس کی جانب سے بی کلاس والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ فلاں دن بمقام اے کلاس برلبِ آب رواں دعوت تناول فرمانے کی زحمت گوارا کریں۔

نوٹ: ازراہِ مہربانی اپنا کھانا ساتھ لائیں۔

فیضؔ کی اہلیہ ایلیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اپنے شوہر کی سگریٹ نوشی سے بے حد چڑ تھی اور وہ بار بار فیضؔ کو اس بُری عادت کے لئے ٹوکتی تھی۔ فیضؔ پر جب نسوانی قہر کی یلغار ہوتی تو وہ حسبِ عادت مسکرا کر کہتا No Problem۔ ایک بار جب ایلیس کا پیمانہ صبر لبریز ہوا تو وہ اپنی بیٹی سلیمہ کو ساتھ لے کر فیضؔ کے کمرے میں دندناتی ہوئی داخل ہوئی جہاں فیضؔ آنکھوں میں ایک معصوم چمک لیے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ایلس نے غصے سے پاؤں زمین پر پٹخ کر فیضؔ سے کہا ،دیکھو فیضؔ اگر تم نے سگریٹ نوشی اب بھی ترک نہیں کی تو میں تم سے طلاق لوں گی۔ فیضؔ نے اسی عالم طمانیت میں جواب دیا: No Problem (17)

ایک بار فیضؔ احمد فیض سے کسی کامریڈ نے مضطرب ہو کر پوچھا ''فیض صاحب! آخر انقلاب کب آئے گا؟'' فیض نے جواب دیا'' بھئی آجائے گا اور پھر ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے''۔(18)

فیضؔ ہندوستان آیا تھا کہ ایک دوست نے اُس سے پوچھا'' آپ کے ملک میں آپ پر بہت پابندیاں ہیں۔ یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ آپ کو تو اس ملک کی کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جاسکتا ہے''۔ فیضؔ نے جواب دیا'' ہندوستان میری محبوبہ ہے اور پاکستان میری منکوحہ۔ محبوبہ کے لئے منکوحہ کیسے چھوڑی جاسکتی ہے؟''(19)

ان چند خوشگوار باتوں کو اس مقالے میں لانے کا یہی مقصد ہے کہ مجبوری آدم کی خون آشام زندگیوں کے نقیب فیض احمد فیضؔ کی اپنی زندگی کے اس گوشے کو بھی بے نقاب کیا جائے جس میں وہ غم کی چادر اپنے جسم پر لپیٹتا ہے لیکن دوسروں میں اظہار مسرت کی زرق برق پوشاک تقسیم کرتا ہے۔

کلامِ فیضؔ میرے لئے انجیل کا درجہ رکھتا ہے جسے میں گزشتہ نصف صدی سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ عظیم شعراء کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ از بر ہوں اور ان

کے اشعار بار بار زبان پر آسکیں اور زبان بھی واہ واہ کرے۔ فیضؔ کے ہر شعر اور ہر نظم میں ہر موقعے پر نفاست، تازگی، سرخوشی، سرمستی اور جذبات خیز محسوسات کو اسی طرح دل میں جگہ ملتی ہے جس طرح ادب یا ماسوائے ادب جنسی جبلت پر حامل کوئی بھی افسانوی تخلیق قاری کو کوہِ قاف کی سیر کروا کے دیو مالاؤں کے ہیلن اور منیکا جیسے نسوانی کرداروں سے قریب تر کر دیتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں یہ قربت زندگی اور اس کے تلخ و شریں حقائق کے ساتھ مستحکم ہو جاتی ہے اس جادوگری کے فن میں فیضؔ کا کوئی ثانی نہیں۔ بقولِ ظفر اقبال "ہمارے یہاں شاعر کے قاری کی سوئی فیضؔ پر آکر رُک گئی ہے"۔(20)

فیضؔ کا فیضان معلوم نہیں کہاں تک اُردو دنیا کے جنونِ شعر کی حرارت سے پر ماحول میں مشک آمیز نغمے اور حیات بخش سنگیت کے جلوے دکھاتا رہے گا۔

ایک کٹر ترقی پسند یا یوں کہیں کہ ایک دہری ہونے کے باوجود فیضؔ کے یہاں اس کے سارے کلام میں مذہب یا دین کے ساتھ کسی قسم کا اختلافی نکتہ نظر نہیں آتا جیسا کہ وہ خود "ادبِ لطیف" کے فیض نمبر میں کہتا ہے۔ "ہماری تو ساری کی ساری تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی اور میری شاعری کا میرے مذہبی عقائد سے کوئی تضاد نہیں"۔(21)

اس ضمن میں اُن کی فارسی نعت کے یہ دو اشعار پیش ہیں:

آں جا قصیدہ خوانی لذاتِ سیم و زر
ایں جا فقط حدیثِ نشاطِ لقائے تو
خواجہ بہ تخت بندۂ تشویشِ ملک و مال
بر خاک رشکِ خسروِ دوراں گدائے تو

اسی طرح شاعر کے "مرثیہ امام" کا یہ بند دیکھیں کہ بے ساختہ انیسؔ و دبیرؔ کی یاد آجاتی ہے:

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیر
پھر نعرہ زناں محوِ وفا ہو گئے شبیر
قربان رہ صدق و صفا ہو گئے شبیر
خیموں میں تھا کہرام جدا ہو گئے شبیر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

میری دانست میں فیض احمد فیضؔ کو 1947ء کے بعد ہندوستان میں وہ پذیرائی نصیب نہ ہو سکی جس کا وہ حق دار تھا۔ اسی طرح پاکستان میں بھی بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں کی نظروں میں، جو وہاں کی سیاسی بساط پر حاوی ہیں، اخیر تک وہ ایک اشتراکی اور دہریہ شاعر تھا۔ اسے وہاں کے فوجی آمرانہ دور میں فرضی مقدمات میں ملوث کیا گیا تھا۔ اس پسِ منظر میں فیضؔ کے معدودے چند مدّاح ہی اُس کا ذکر کرتے رہے۔

اب جب کہ 2011ء کو فیض احمد فیضؔ کی صدی کے طور پر منایا گیا ہے۔ اُن کے تئیں خراجِ عقیدت کا سلسلہ جاری ہے اور اُس کے فن کے بحر بیکراں میں عاشقانِ فیضؔ غوطہ زن ہو رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند عمل ہے کیونکہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد اگر چہ برِ صغیر نے حیاتِ جاودانی کے مالک کسی شاعر کو جنم دیا تو وہ فیضؔ ہے۔

فیض احمد فیضؔ حال کا ترجمان اور مستقبل کی بشارت کا شاعر ہے۔ وہ اُمید اور سرخوشی کا منادی ہے اور جب بھی اُس پر گفتگو کی جائے تو بادِ صبا کو نئی خوشبو عطا کرنے والے اس کے معطر اور شاداب نفس کی تحسین مین بلبل شیراز کا یہ شعر صادق آتا ہے:

نفس بادِ صبا مشک فشاں خواہد شُد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شُد

اخیر پر میں اپنی اس تحریر کو اپنا ہی ایک اُردو شعر پڑھ کر اختتام پر لاتا ہوں ۔

پھولوں سے مہکتا ہوا یہ تذکرہ فیضؔ
شاید میرے صحرا کو بھی گلزار بنا دے

☆ ☆ ☆

حوالہ جات

(1) صلیبیں میرے دریچے میں، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی 1974،ص 116
(2) کلیات فیض، نسخہ ہائے وفا، فرید بک ڈیپو، دہلی،ص 31
(3) صلیبیں میرے دریچے میں، ص 153
(4) کلیاتِ فیضؔ، پیش لفظ ''سروادیٔ سینا''
(5) مہہ وسال آشنائی، دارالاشاعت ترقی، ماسکو، 1979ء ص 64-63
(6) سہ ماہی اثبات، اثبات پبلی کیشنز، تھانے ممبئی، شمارہ 9، ص 112
(7) فیض احمد فیضؔ، لائف اینڈ پویٹری ، دی ڈان کراچی ، 17 فروری 2011ء
(8) پنچ کولہ ہریانہ سے 11 جون 2011ء کو ٹیلی فون پر گفتگو کا خلاصہ
(9) شیرازہ ، شمیم احمد شمیم نمبر: ایڈیٹر اشرف ٹاک ، کلچرل اکادمی سری نگر، ص 370
(10) گل دستہ، جے کے آفسیٹ پریس دہلی، 1988ء، ص 33
(11) ہماری زبان، انجمن ترقی اردوئے دہلی۔ 5 مارچ 2011ء
(12) صلیبیں میرے دریچے میں۔ ص 45
(13) ایضاً، ص:26

(14) پوئمز بائی فیض، ترجمہ وی جی کیرنن، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی، 1971ء ص5

(15) زنداں نامہ۔ص11-9-8

(16) صلیبیں میرے دریچے میں ص96

(17) یہ واقعہ فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے جنوری 2011ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے سہ روزہ بین الاقوامی فیض سمینار میں سنایا۔اس سمینار میں کشمیر کی نمائندگی میں نے کی تھی۔(خیالؔ)

(18) خوش کلامیاں قلم کاروں کی۔ نارنگ ساقی ۔ ایم آر پبلی کیشنز دہلی، 2007ء ص:111

(19) سہ ماہی اثبات، ص110

(20) ایضاً، ص127

(21) ایضاً، ص 123

☆☆☆

کشمیری زبان میں تحقیقی ادب

کشمیری شاعری کا چھ یا سات سو سال کے طویل عرصے پر پھیلا ہوا سرمایہ اگرچہ مکمل شکل وصورت میں ہم تک نہیں پہنچ پاسکا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ ہی اس زبان میں تحقیقی ادب کا حال پوچھا جائے تو اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔

تحقیقی ادب کی اس کم یابی کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج تک کشمیری محقق اس امر کا حتمی طور پر دستاویزی ثبوت کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ لل [illegible] عارفہ اور شیخ نورالدین نورانی کے کلام میں کتنی تخلیقات ایک دوسر [illegible] خلط ملط ہوگئی ہیں۔ لل اور شیخ العالم کی حیات اور شاعری پر جو تحقیقی کام [illegible] وہ بھی انہی سُنی سنائی باتوں یا حکایات پر مبنی ہے جو ان دونوں کے عقیدت مندوں نے ایک دوسرے کی زبانی سن کر محفوظ کرلی ہیں اور جو آج بھی تحقیق طلب ہیں۔

کشمیر یونیورسٹی میں آج سے چند سال قبل جو شیخ العالم چیر قائم کی گئی ہے وہاں لوگ آتے گئے اور لاکھوں روپے اپنی جیبوں میں ڈال کر چل دئے۔ حضرت شیخ کے نام نامی پر قائم شدہ اس نیم مردہ ادارے کی طرف سے آج تک کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوسکا ہے اور اب یہ ادارہ عامیانہ قسم کے مشاعرے

منعقد کرنے اور بے سود مناظروں کا اہتمام کرنے تک ہی اپنے آپ کو محدود کر کے موت کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ اس نیم جان ادارے میں نئی روح ڈالنے کے لئے اس کی سربراہی کے لئے ایک ایسے ماہر لسانیات اور محقق کی ضرورت ہے جو کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ کلاسیکی زبانوں سنسکرت، فارسی اور عربی سے بھی کما حقہ آگاہی رکھتا ہو۔ یہ دانشور ایسا باوقار، شاندار اور بے لاگ محبّ شیخ ہونا چاہیئے جو حضرت کی چھوڑی ہوئی وراثت کے لئے ایک ادبی سوداگر ثابت نہ ہو۔

تحقیق کا صبر آزما کام اس امر کا متقاضی ہے کہ اُن قدیم ادبی اور ثقافتی خزانوں کو کھنگالا جائے جن کی چابیاں زمانے کی دست برد سے کھوگئی ہیں اور اُن کے دروازے ہم پر واکرنے کے تمام راستے مسدود ہوگئے ہیں۔ تحقیق کار کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے یا قدیم نسخے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لئے بے پناہ صبر اور استقامت کا مالک ہو جس کی بدولت وہ کسی بھی غیر مصدقہ تخلیق کو تاریخی اعتبار سے حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی توثیق یا تصیح کر سکے۔

ہم عصر ادب کے بارے میں تلاش غیر ضروری بن جاتی ہے کیونکہ اس کا خالق اگر بقید حیات ہو تو ان گتھیوں کو وہ خود ہی آسانی کے ساتھ سلجھا سکتا ہے۔ تحقیق کا براہِ راست تعلق اُن فن پاروں یا مسوّدوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کی صحت کے بارے میں شکوک وشبہات برابر موجود ہوں۔

کشمیری زبان میں جو تحقیقی شعبے میں کم وبیش کام ہوا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے اور اس صنفِ ادب میں امین کامل۔ موتی لال ساقی، محمد یوسف ٹینگ، ناجی منوّر اور غلام نبی خیالؔ وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔

امین کامل کا کشمیری تحقیق کے میدان میں خاصا رول رہا ہے۔ کاملؔ اس سلسلے میں اپنی طرف سے ہر ثابت کردہ دلیل کو بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کرتا رہا

اور اس حقیقت بیانی میں اُس نے کشمیر کی ثقافتی اور ادبی دنیا میں کئی دشمن بھی پیدا کر لئے۔

کاملؔ نے جب کشمیری زبان کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون کی کلیات کو اشاعت کے لیے مرتب کر لیا تو اس نے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا کہ ارنہِ مال نام کی ایک اور شاعرہ کا کشمیر میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس انکشاف سے ارنہِ مال کے ہم مذہب کشمیری ہندوؤں نے ایک طوفانِ بے ہنگم کھڑا کیا لیکن یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جو اس بحث بحثی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اُن میں سے کسی نے بھی ایک ایسی تاریخی دلیل پیش نہیں کی جس سے ارنہ مال کا موجود ہونا ثابت ہو جاتا۔ کاملؔ کی طرف سے ارنہِ مال کو ایک فرضی شاعرہ قرار دینے کا دعویٰ آج بھی ایک مدلّل جواب کا محتاج ہے۔

کاملؔ نے کشمیری مثنوی پر بھی قابلِ تعریف کام کیا۔ اس نے کلچرل اکادمی کے جریدے شیرازہ کا مثنوی نمبر اور جنگ نامہ نمبر مرتب کر کے ہماری شاعری کے اس بیش بہا خزانے کو تنقیدی اور تحقیقی طور پر مالا مال کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ کلچرل اکادمی ہی کے اردو رسالہ شیرازہ کے موسیقی نمبر میں کامل کا ایک دلچسپ مقالہ بھی شامل ہے۔ جو مضمون نگار کی کشمیری موسیقی سے وابستگی اور آگاہی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں کامل دعوی کرتا ہے کہ یہ کشمیر کی صوفیانہ موسیقی پر گذشتہ پانچ سو سال کے عرصے میں پہلی بار قلم بند کیا گیا ہے۔ کامل نے کشمیر کی کلاسیکی موسیقی پر بھی تین جلدوں پر مبنی ایک ضخیم تحقیقی کارنامہ انجام دیا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ بھی تحقیق کے ساتھ شغف رکھتا ہے اور اس نے چند تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اگرچہ ایک طرف ہم عصر ادب اور ادیبوں کے بارے میں اُس کے تنقیدی نکتہ نظر سے شدید اختلاف کیا جاسکتا ہے وہاں

دوسری جانب تحقیق کے حوالے سے اس کا قلمی کام زیادہ وزن دار ہے۔ رسول میر اور مہجور پر ٹینگ کا تحقیقی کام اس زمرے کی قابلِ ذکر مثالیں ہیں۔

ناجی منور شہر کے شور شرابے سے دور سالہا سال سے کشمیری ادب پر اپنا تحقیقی کام کرتا آیا ہے۔ اگرچہ ناجی کی عمر کی وجہ سے اس کام میں اب تساہل اور بے قاعدگی پیدا ہوئی ہے لیکن تحقیق کے لحاظ سے اس کے کئی فن پارے کشمیری زبان میں ایک قابلِ ستائش اضافہ ہیں۔

مرحوم موتی لال ساقی بھی اسی کاروان کا ایک رہرو تھا جس نے اپنے تحقیق کے شوق وذوق سے ہمارے ادبی جادوں پر اپنے قلم کے نقوش ثبت کیے۔

اکادمی میں ملازمت کے دوران مجھے یہ کام سپرد کیا گیا کہ میں لچھمن کول بلبل کے غیر مطبوعہ سام نامہ کو مرتب کروں جو اکادمی کے شعبۂ مخطوطات میں ایک قلمی مسوّدے کی شکل میں موجود تھا۔

مقامی طور پر ادبی اور ثقافتی حلقوں میں یہ عام تاثر پایا جاتا تھا کہ یہ سام نامہ بلبلؔ نے شاہنامۂ فردوسی سے اخذ کیا ہے لیکن دو سال کی مسلسل عرق ریزی اور تحقیقی جستجو اور تلاش کے بعد میں نے یہ ثابت کرلیا کہ سام نامہ شاہنامہ سے نہیں بلکہ ایک اور مشہور فارسی شاعر خواجو کرمانی سے ترجمہ کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے۔ خواجہ نے یہ دیو مالائی داستان اپنی مثنوی ہمائی وہمایوں نامہ میں منظوم کی ہے۔ یہ ایک ایسا تحقیقی انکشاف تھا جس سے کئی اور محققوں کا دعویٰ خود بخود غلط ثابت ہوا۔

آج سے چند سال قبل جموں کے ایک اخبار کشمیر ٹائمز میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں رابندر ناتھ ٹیگور کے دورۂ کشمیر کے بارے میں چند دلچسپ باتیں درج کی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ٹیگور سری نگر میں رام منشی باغ کے علاقے میں

دریائے جہلم میں ایک ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر تھے جہاں انہوں نے کشمیر پر چند نظمیں لکھیں جن میں بلاکا اور مانسی شامل ہیں۔اس مضمون میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ دریائے جہلم ہی کے کنارے زینہ کدل کے علاقے میں پنڈت آنند کول بامزئی کے گھر پر ایک محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی جس میں کشمیری شاعر غلام محمد مہجور نے ٹیگور کے ساتھ ملاقات کی اور پھر ایس پی کالج میں ٹیگور کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جہاں انہوں نے اپنی وہ شہرہ آفاق نظم سنائی جو اُن کے نوبیل انعام یافتہ شعری مجموعہ گیتانجلی میں شامل ہے اور جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

Where the mind is without fear
Where the head is held high

میں نے بہت کوشش کی کہ میں ٹیگور کے اس دورے کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم کروں اور یہ بھی پتہ لگالوں کہ اس مہاکوی نے کشمیر کے بارے میں اور کیا کیا قلم بند کیا جو اُس وقت شخصی راج کے پنجے تلے کراہ رہا تھا۔اس ضمن میں شانتی نکیتن کے اہل کاروں کے ساتھ میری متواتر خط وکتابت بے سود ہی ثابت ہوئی اور ٹیگور پر یہ مضمون لکھنے والے ایم کے تکو نے بھی میرے مراسلوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت آج بھی ایک سوالیہ نشان بن کر ہمیں اشارے کر رہی ہے۔

کشمیری زبان میں ایمانداری اور بے لاگ اظہارِ خیال پر مبنی تنقید کی جس طرح کمی پائی جاتی ہے اتنی ہی کم مائیگی ہمیں تحقیق کے شعبے میں بھی نظر آرہی ہے۔

فارسی اور اردو زبانوں سے جو کم وبیش ایک سو مثنویات کشمیری میں منتقل کی گئی ہیں اُن میں رزمیئے اور رومانوی مثنویاں بھی شامل ہیں۔ان پر تنقیدی

اور تجزیاتی لحاظ سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن تحقیق کی بنا پر ان کے تقابلی مطالعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔

اس کوشش سے یہ بات واضح تو ہو سکتی تھی کہ اصل اور ترجمہ میں کیا فرق ہے۔ مترجمین نے اپنی صوابدید کے مطابق ان میں کہاں کہاں تحریف اور تبدیلی کی ہے؟ وہاب پرے نے فردوسی کا ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہنامہ صرف تئیس ہزار اشعار میں سمو کر کشمیری میں منتقل کیا ہے۔ کیا اس سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے کہ ہم کشمیری میں شاہنامہ کی موجودگی پر اپنا سر فخر سے اونچا کریں؟ ہمارے خیال میں یہ کاوش فردوسی کی روح کو زخمی کرنے سے مترادف ہے۔ ان سبھی امور کی طرف کشمیری تحقیق کاروں کو توجہ دینا چاہیئے۔

ہمارے اکثر صوفی شاعر جن کی شاعری ہمارے ادبی سرمایہ کا سب سے زیادہ معنی خیز اور قابل توجہ جزو ہے، اس تحقیق کے آج بھی طلب گار ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی شاعری کا صحیح تجزیہ کرنے کے برعکس اُن کی نام نہاد کرامات اور فرضی کارناموں کو اُچھالا گیا۔ اس کا یہ منفی نتیجہ نکلا کہ ان بے نظیر سخن وروں کو ولیوں اور بزرگانِ دین کا مرتبہ بخش کر اُن کی درگاہیں اور آستانے کشمیر کے طول وعرض میں تعمیر کیے گئے۔ ان عمارات کے بوجھ تلے اُن کی شاعرانہ شخصیت دب کے رہ گئی اور اُن کے عقیدت مندوں کی نظروں میں اس شاعری نے ایک ثانوی حیثیت حاصل کر لی۔

ہماری تحقیقی دنیا میں، جو ایک انتہائی خوبصورت اور پرکشش دنیا ہے، ہمارے لاتعداد شاعر اس بات کے خواہاں ہیں کہ اُن کا کلام اور اُن کے ادبی کارنامے سائنسی طرز پر تحقیق کی کسوٹی پر پرکھے جائیں اور اُن کی قیمت متعین کی جائے۔

☆☆☆

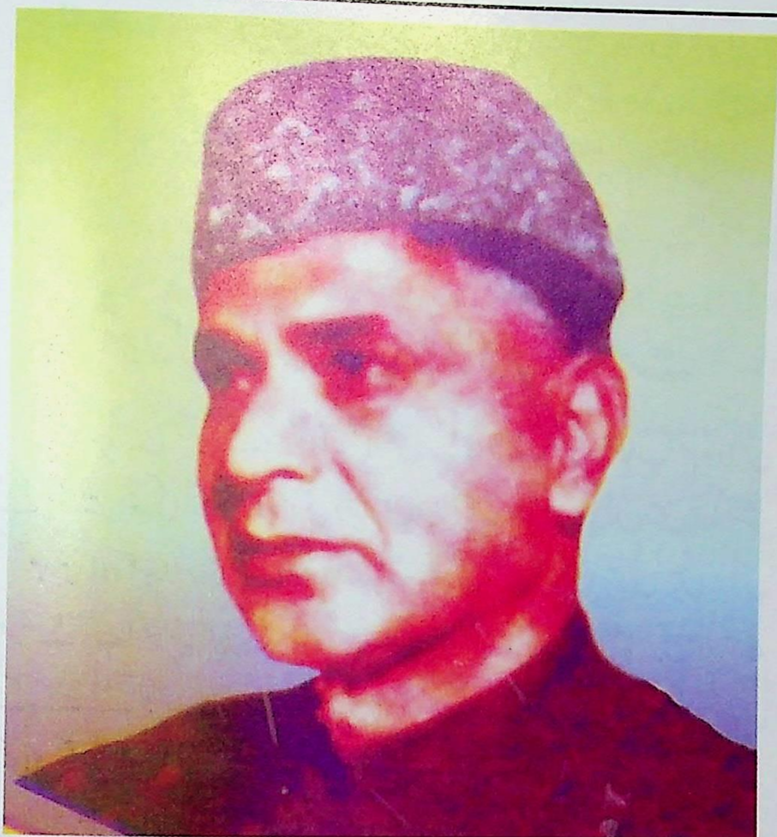
شورش کاشمیری کا زورِ خطابت

سرزمینِ کشمیر کے ساتھ آبائی تعلق رکھنے والے جن اصحاب علم و دانش نے برصغیر ہند کی ثقافتی اور ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا اُن میں آغا حشر کشمیری اور عبدالکریم ڈار المعروف آغا شورش کشمیری بھی شامل ہیں۔ اس حوالے سے اگرچہ کشمیر کے عظیم المرتبت فرزند علامہ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفے کے نئے نئے گوشوں کو روشن کرنے کا سلسلہ برابر جاری ہے مگر آغا حشر اور شورشؔ کو اس ضمن میں غالباً درخورِ اعتنا تصور نہیں کیا گیا۔

حکومتِ ہند کی قومی کونسل برائے فروغ اردو نے تو آغ... ڈراموں کو نہایت حسنِ ترتیب کے ساتھ سات جلدوں میں شا... شورش جیسے شورش بیان اور آتش بار قلم کار کے بارے میں اُن کے آبائی وطن کشمیر میں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

زورِ خطابت اور شعلہ بیانی میں شورش کا مقابلہ صرف مولانا ظفر علی خان اور مولانا عطا اللہ شاہ بخاری کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جن سے وہ بذاتِ خود متاثر بھی تھے۔

ریاست جموں و کشمیر میں شخصی حکومت کی عوام کُش کارروائیوں کے نتیجے میں جن فرزندانِ کشمیر کے آباواجداد نے یہاں سے نقلِ مکانی کیا اُن میں اقبالؔ، ظفر علی خان اور محمد دین فوق نے تحریک حُریت کشمیر کی حمایت کو اپنا سیاسی



عبدالکریم ڈار شورش کشمیری

شعار بنالیا۔ بعد میں اس کارواں میں عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور شورش کاشمیری بھی باعمل مجاہدوں کی طرح شامل ہو گئے۔

آغا شورش کشمیری کی پیدائش 14 اگست 1917ء کو ہوئی اور وہ نام ہی کے کشمیری نہیں ہیں بلکہ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی ہر گام پر محکوم کشمیریوں کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کرتے رہے اور قلمے اور سخنے وہ اُن کی حمایت آخر دم تک کرتے رہے۔ ایک چرب دست اور تر دماغ کشمیری قوم کی بدحالی پر وہ برابر نظریں لگائے بیٹھے تھے۔ تحریک آزادئ کشمیر کے ابتدائی ایام کا حال وہ یوں بیان کرتے ہیں۔ ''کشمیر کے چناروں میں احتجاج کے شعلے

اندر ہی اندر شعلوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ آخر آفتاب نکل آیا۔ بظاہر سیاسی کھیل بڑے پُر اسرار ہوتے ہیں۔ اکثر تحریکیں اپنی طبعی ثقافتوں سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کی عنان مختلف الطبع لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ بعض تو واقعی عوام کے لئے آگے بڑھتے اور اُن دنوں کی اندھیری راتوں میں روشنی کا مینار بن جاتے ہیں لیکن کئی مصلحتوں کی شہہ پر آتے اور غرضوں کی راہ سے اُبھرتے ہیں۔ انہیں تحریک سے زیادہ اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ قوم کے نام پر اپنے وجود کی نمائش کے لئے اٹھتے ہیں۔ ان کا نصب العین قومی سے کہیں بڑھ کر حزبی ہوتا ہے۔ تحریک کشمیر کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ حالات آخری منزل پر پہنچ چکے تھے۔ شیخ عبداللہ اس وقت نوجوان تھے وہ کشمیری مسلمانوں کے عام داخلی اضطراب کا مظہر ہو گئے۔ اُن کے ساتھ بعض اور بھی تھے۔ اُن کی عمریں بھی اُن سے زیادہ تھیں لیکن شیخ عبداللہ کا نمایاں ہونا اُن کا مقدر بن چکا تھا"۔

1947ء میں برصغیر کی تقسیم نے ہندوستان اور پاکستان کے عام انسانوں پر جو قہر ڈھایا اُس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ تہہ تیغ کیئے گئے جن کے قتلِ عام میں کسی مذہب یا اخلاقی اقدار کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس انسان کشی میں وہ لوگ بھی وحشیوں کی طرح شامل ہوئے جو اپنے آپ کو مذہب اور دھرم اور شرافت کے علمبردار کہلاتے تھے۔ شورش نے ان الفاظ میں اس تقسیم کے چند واقعات کو جس طرح قلم بند کیا ہے اُن کی شدتِ تاثیر سے انسانی جذبات متلاطم ہو جاتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں۔ "لوگوں کو مفت کی دولت اور لوٹ کی غنیمت کا چسکہ پڑ گیا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں نے ہاتھ رنگے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ قالین افسروں کی کوٹھیوں میں چلے گئے۔ بڑے بڑے بنگلوں کا سامان اُن کے بنگلوں میں پہنچ گیا۔ لڑکیاں تبرک کی طرح تقسیم ہو گئیں۔ بزازی کی

بڑی بڑی دوکانوں کے تالے تڑواکر قیمتی کپڑوں کو بیگمات نے اُڑالیا۔ کئی افسروں نے لوٹ کے اس مال سے اپنے بچوں کی شادیاں کیں۔ فرنیچر کی دوکان کا مال بعض سرکاری بنگلوں کی رونق ہوگیا۔ بعض مالدار علاقوں کے تھانیدار نے دولت سے ہاتھ رنگے۔ ان کے پاس منوں سونا جمع ہوگیا۔ کئی مجاہد کافرلڑکیوں پر مدتوں مشق کرتے رہے۔ وہ طائفے بنا کر دوکانوں اور مکانوں کو لوٹتے، رات شام کے جھروکوں سے جھانکتی تو بالا خانوں میں چلے جاتے اور اس روپے سے دادِ عیش لیتے۔ بعض سیاسی ٹارزن اپنی بیویوں کو چھوڑ کر ان بازاری امرتیوں کے ہوگئے۔ ان لوگوں کا چسکہ کیونکر ختم ہوسکتا تھا۔ ایک دفعہ خون منہ کو لگ جائے تو عمر بھر یہی ذائقہ لگا رہتا ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ''اُس بازار'' کی مخلوق نے شب خون مارنے شروع کیے۔ کئی لڑکیاں اور اکثر عورتیں جو مشرقی پنجاب کے درندوں سے بچ کر آئی تھیں۔ کلمہ گویوں کے ہتھے چڑھ گئیں۔ ہمدردی کے نام پر بازاریوں نے گل کھلائے۔ نائکہ عورتیں امداد کے لیے آتیں اور بیداد لئے جاتیں والٹن ٹریننگ کیمپ میں اس طرح سینکڑوں حادثے ہوگئے۔ کمسن بچیوں کا ایک غول تھا جن کے والدین راستہ میں کٹ گئے یا جنہیں ستلج اور بیاس کے پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جنہیں ٹرینوں سے اُتار کر قتل کردیا گیا۔ اُن کی اولادیں سرمۂ مفت نظر کے طور پر بک گئیں۔ میں نے ''اُس بازار میں'' (تاریک فحاشی) ان لڑکیوں کے انٹرویو دیئے ہیں۔ نیلم کی کہانی ایک ایسی ہی دُکھیا لڑکی، اس کی مجبور بہنوں اور اندھے باپ کی کہانی ہے۔ پٹیالہ سے مہاجر ہوکر نکلے، لاہور پہنچ کر پناہ گزین کہلائے۔ اس بازار میں فروختنی ہوگئے۔ مشہور موسیقار اور پلے بیک سنگر نسیم بیگم ایک ایسی ہی لڑکی ہے جس کو اس کی موجودہ ماں نے چند روپیوں میں اُس کے بدنصیب ماں باپ سے خریدا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی۔ اس نے

امرتسر کی مشہور ڈیرہ دارنیوں شمشاد، امتیاز، ممتاز اور شہناز کے ہاں پرورش پائی۔ تاناری ری سیکھی۔ آج وہ ایک نامور مغنیہ ہے۔ لیکن بدیوں کے اس طوفان سے متعاقب نیکیوں کا ایک ریلا بھی چلا آرہا تھا۔ انسان مرانہیں انسان زندہ تھا اور محسوس کررہا تھا کہ ہم آگ اور خون کے جس دریا کو عبور کررہے ہیں وہ ہمارے حوصلوں کو توڑ نہیں سکتا۔ نیکیاں قدرت کا عطیہ ہیں۔ ہم ان سے بدعہدی نہیں کرسکتے۔ ہم اس آگ کو گلزار بناسکتے ہیں۔ ہم اس دریا کو پار کرسکتے ہیں۔ ہمارے ارادے، ہماری کشتیاں اور ہمارے بازو اور ہمارے چپو"۔

آغا شورش نے کم وبیش دو درجن کتابیں تصنیف کیں جن میں اُس بازار میں۔ شب جائے کہ من بُدم۔ بوئے گل، نالۂ دل دودِ چراغ محفل۔ پس دیوارِ زنداں۔ تحریک ختم نبوت۔ موت سے واپسی، فنِ خطابت، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، تمغۂ خدمت، ابوالکلام آزاد، اقبال اور قادیانیت اقبال مجرم، ظفر علی خان، میاں منشی الدین، نورتن، حمید نظامی، فیضانِ اقبال اور اُن کے مجموعہ ہائے کلام گفتنی ناگفتنی۔ چہ قلندرانہ گفتم اور الجہاد والجہاد شامل ہیں۔ شورش نے زندگی بھر مزاحمتی ادب تخلیق کیا اور اُس وقت کے پاکستانی فوجی آمروں نے انہیں قید خانے میں ڈال دیا۔ اس طرح سے شورش نے پاکستان کے وجود سے پہلے اور اس کے قیام کے بعد بھی پوری ایک دہائی قید و بند میں گذاری۔ ایّام اسیری کا حال شورش نے اپنی تین مطبوعات میں نہایت اثر انگیز انداز میں قلم کیا ہے۔ پسِ دیوارِ زنداں کا تشہیری خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے۔ "یہ انہی دنوں کی کہانی ہے جب برطانوی سامراج کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ انقلاب کہنے سے کلائیو اور اُس کے جانشینوں کی ہڈیاں ان کی قبروں میں چٹخنے لگی تھیں۔ راست باز زبانوں کے لئے اندھا قانون اور بے خوف انسانوں کے لئے کوڑھی انصاف تھا۔ کاسہ لیسانِ سرحدی اپنے سینوں پر تمغۂ ہائے وفاداری

لٹکائے پھرتے تھے۔ فدایانِ حریت کے لیے حلقہ ہائے زنجیر تھے یا دُرّہ ہائے تعزیر۔ طلبگارانِ آزادی کی بے سروسامانی پر فرزندانِ سلطنت کے وحشیانہ قہقہے گونجتے تھے۔ رضا کاروں کے بدن کا گوشت روئی کے گالوں کی طرح اُڑتا تھا اور پیکرانِ عفت کے چہروں پر طمانچوں کی مہریں ثبت تھیں۔ یہ انہی دنوں کی کہانی ہے۔''

شورش ایک سرفروش مجاہد آزادی بھی تھے اور ایک بے باک فرزند وطن بھی، لیکن انہیں حسبِ دستورحق گوئی کی پاداش میں بے انتہا مصائب سے دو چار ہونا پڑا اور کئی بار تو وہ متنازعہ فیہ تخلیقات کے مخمصے میں بھی پھنس گئے۔ ایک ایسے ہی معاملے میں شورش کو فراڈ اور فریب کار کہا گیا۔ ایک بار انہوں نے 1946ء میں مشہور ہفت روزہ ''چٹان'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مبینہ طور پر ایک فرضی انٹرویو شائع کیا جس پر یہ اعتراض ہوا کہ یہ انٹرویو کبھی نہیں لیا گیا بلکہ شورش نے مولانا کی ایک کتاب کے برمحل اقتباسات نقل کر کے اُسے ایک گفت وشنید کی شکل میں شائع کیا۔ بہرحال یہ بات چند دنوں تک پنجاب کے صحافتی اور سیاسی طبقوں میں موضوعِ بحث رہی اور بعد میں خود ہی ختم ہو گئی۔

میں نے اس مختصر سے مقالے میں کوشش کی ہے کہ شورؔش پر اپنے تبصراتی اور تجزیاتی اظہار خیال کے برعکس ان کی جذبات خیز اور حققیت پسندانہ نگارشات ہی کو دوہرانے کو ترجیح دوں تاکہ قاری میری رائے کے بجائے اس یکتائے زمانہ فرزندِ کشمیر کے خیالات سے بہرہ ور ہو سکے البتہ جہاں پر مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میں بھی وہاں پر اپنی بات جوڑوں تو میں نے یہ فریضہ بھی اختصار کے ساتھ سرانجام دیا ہے۔

☆☆☆

چودھری خوشی محمد ناظر

''جوگی کا شاعر''

چودھری خوشی محمد ناظر کا پیدائشی تعلق اگرچہ لائل پور (پاکستان) کے ساتھ ہے لیکن اُن کی زندگی کا ایک حصہ کشمیر میں گزرا جہاں وہ گورنر اور وزیر کے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے اور وادئ کشمیر کے ساتھ ساتھ کوہستانی سرحدی صوبہ لداخ بھی ان کی حد اختیار میں آ گیا۔

اپنی تعلیمی اور ادبی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں نا[illegible] ہیں کہ ''میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے زمانے میں اوقاتِ مدرسہ کے بعد اپنے گاؤں کے مکتب میں بھی تعلیم پاتا رہا اور اس ابتدائی دور میں چند فارسی غزلیں بھی کہیں۔ مڈل کے درجے میں شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی زندہ و جاوید ''آبِ حیات'' اور بعض اردو کے دیوان میری نظر سے گذرے جس سے اُردو غزل گوئی کی تحریک ہوئی۔

دوسرا دور یعنی قومی شاعری علی گڑھ کالج میں شروع ہوئی۔ اُس وقت یونین کلب اور علی گڑھ کالج کی مجلسوں میں غزل کا داخلہ ممنوع تھا کیونکہ سرسیّد مرحوم عاشقانہ غزل سرائی طلباء کے لئے تضیع اوقات کا درجہ سمجھتے تھے مگر بورڈنگ کی فضا میں غزل گونجتی رہتی تھی بلکہ باورچی خانے سے بھی ہر صبح یہ آواز



چودھری خوشی محمد ناظر

سنائی دیتی تھی:

یار کی کوئی خبر لاتا نہیں
دم لبوں پر ہے نکل جاتا نہیں

اُدھر مولانا حسرتؔ موہانی کے کمرے میں اساتذہ سلف کی روحیں مخفی مشاعرہ کرتی رہتی تھیں۔

سرسید نیچرل شاعری کے حامی تھے اور مسٹر آرنلڈ آنجہانی نیچرل شاعری میں ترغیب و تربیت میں خاصی دلچسپی لیتے تھے اور دو سال متواتر انعامی نظام کا اعلان فرماتے۔ یہ دونوں انعام میں نے حاصل کئے اور یہ دونوں نظمیں ''اخوت'' اور ''چہار موسم'' انہی دنوں علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئیں۔ یہ انعام حاصل کرنے کے بعد میں کالج یونین کلب اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھتا رہا۔

تیسرا دور کشمیر جنت نظیر کے قیام سے شروع ہوا اور میری بعض شگفتہ اور مقبول نظمیں اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس زمانے میں ہم نے چند ادب دوست احباب کی ایک لمیٹڈ کمپنی یا انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام انجمن مفرح القلوب تھا۔ 1901ء سے 1906ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی۔ اس کے بعد میں لداخ چلا گیا اور بندوبست اور مال کے انتظامی کام کی وجہ سے شعر گوئی کی فرصت نہ ملی۔

انجمن مفرع القلوب میں بیرون کشمیر کے جو احباب شامل تھے ان میں سر شیخ عبدالقادر، جسٹس شاہ دین ہمایوں، خوشی محمد ناظر اور علامہ اقبال شامل تھے۔ 1921ء میں جب اقبال کشمیر آئے تو جسٹس ہمایوں نے اپنی ایک نظم ''شالامار باغِ کشمیر'' میں اپنے ان قریبی دوستوں کا بھی ذکر کیا:

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو
اور عظمتِ گزشتہ کی اک یادگار ہو

کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں رازِ دروں کے پیچ
تم اک کلید قفل درِ روزگار ہو
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں
کس سر بسر بمہر کے تم راز دار ہو
فوارے کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال
کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو
اور تم بتاؤ پانی کی لہروں کہ کس لئے
مضطر ہو پیچ وتاب میں ہو بے قرار ہو
کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمہیں
دلدادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو
ہاں اے مسافر ایسے سوالوں سے فائدہ
زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو
ناظرؔ بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

آخری شعر میں خوشی محمد ناظر، علامہ اقبالؔ اور شیخ عبدالقادر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مختصر سی مجلس یاران میں ناظرؔ کو اقبالؔ کے فلسفہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا :

فلسفے کی وادیوں میں کر تلاش اقبال کو
ناظر گم گشتہ کو قدرت کے نظاروں میں دیکھ

1938ء میں جب اقبال انتقال کر گئے تو ناظر نے بیالیس اشعار کا مرثیہ لکھا جس کا آخری شعر اس طرح ہے :

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

ناظر اگرچہ مولانا الطاف حسین حالی کے تلامذہ میں شمار ہوتے تھے لیکن اس سے زیادہ قربت انہیں علامہ اقبال کے ساتھ حاصل تھی۔

علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ناظر رام پور میں کچھ عرصہ تک ملازمت کرتے رہے اور اس کے بعد 1925ء میں کشمیر میں وزارت کے عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہوئے۔ اکتوبر 1944ء میں کشمیر میں ہی 72 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا جہاں وہ جھیل ڈل کے کنارے خود تعمیر کردہ اُسی کوٹھی کے صحن میں مدفون ہوئے جو انہوں نے ڈل کا خوبصورت نظارہ شب وروز اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کی غرض سے تعمیر کروائی تھی۔ اس مکان میں بعد میں ریاست کے ایک سابق وزیراعلیٰ غلام محمد صادق آخر دم تک قیام پذیر رہے۔ ایک اور بیان کے مطابق ناظر کو سری نگر میں کوہِ سلیمان کے دامن میں دفن کیا گیا۔ یہ بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کوہ کے ایک زیریں حصے میں کئی فارسی شعراء دفن کیے گئے تھے اور اسی بناء پر اسے مزارِ شہداء کا نام دیا گیا تھا۔

کشمیر کے ایک بزرگ شاعر مرحوم محمد امین داراب نے ناظر کی تاریخ وفات رقم کرنے کی غرض سے یہ مرثیہ لکھا:

دریغا کہ شد روزِ بزمِ ادب
ہمہ تیرہ از مرگِ ناظر چو شب
بہ باغِ ادب بلبل نغمہ سنج
کہ بودش بدل از سخن گنج گنج
گہہ حکمرانی ہمہ عدل وداد
دمِ نغمہ سنجی بہ فن اوستاد

بہ عہدش ز رشوت نشانی نماند
ز بیداد جز داستانی نماند
بہ دل خواستے دائم از حق پرست
رسیدن بہ فریادِ ہر زیردست
وفاتش بدل داد رنجیدگی
کہ با او شدہ دفن سنجیدگی
کشادم پئے عہد تاریخ شست
گزیدہ دو تاریخ آمد بدست
یکے ہجری آں خوش تمیز عزیز
دگر عیسوی شاعر خوش تمیز

سید سلیمان ندوی نے ناظر کے انتقال کی خبر سن کر اپنے غم واندوہ کا اظہار 'معارف کی دسمبر 1944ء کی اشاعت میں یوں کیا: ''کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر 1944ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضہ فالج وفات پائی''۔

خوشی محمد ناظر کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے چند درباریوں کی سازش کے نتیجے میں گورنری کے عہدے سے برخاست کیا گیا تھا۔ جب مہاراجہ نے اس کی نظم ''جوگی'' کے بارے میں سنا تو اس نظم کی فرمائش کی۔ مہاراجہ کو یہ نظم اس قدر پسند آئی کہ اس نے ناظر کو اپنے منصب پر بحال کرنے کا حکم جاری کیا۔ ناظر کے اپنے الفاظ میں ''مہاراجہ پرتاپ سنگھ بہادر سرگباشی درویش منش رئیس تھے۔ انہوں نے بعض اعیانِ دربار سے میری نظم جوگی کی تعریف سن کر اس نظم کے پڑھنے کے لئے اصرار فرمایا اور جوگی جی کے بچپن سن کر اس قدر مسرور ہوئے کہ ایک خاص صوفی منش مغنی یہ نظم سنانے کے لئے ملازم رکھا گیا''۔ اس

کے بعد ساری ریاست جموں وکشمیر میں ناظر کو 'جوگی کا شاعر'' کہا جانے لگا۔

1912ء میں گورنر ناظر کو خان صاحب اور اس کے بعد خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ 1917ء میں خان بہادر کا خطاب ملنے پر اُس وقت سری نگر کے مشہور نیڈوز ہوٹل میں ناظر کے بہی خواہوں اور احباب کی طرف سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں کشمیر کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار، شاعر اور دانشور شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر چند سخن وروں نے ناظر کی مدح میں قصیدے بھی پڑھے جن میں پنڈت گوپی کشن مدن کا یہ قطعہ بھی شامل تھا:

خوشی سے لبریز کیوں نہ ہوں ہم
نہ شادمانی سے دل ہو کیوں پُر
ملا گورنر کو ہے ہمارے
خطاب واعزازِ خاں بہادر
ہمارے منصف مزاج حاکم
ہیں اہل کشمیر جن کے شیدا
دلوں کو تسخیر کر رہے ہیں
یہ کامیابی کا اُن کی ہے گُر
ز بحرِ تاریخ غوطہ زن شد
مدن چو در قلزم معانی
بگفت ہاتف کہ کن مزین
خوشی محمد بہ خاں بہادر

خوشی محمد ناظر جتنی دیر کشمیر میں رہے وہ اس خطہ ارضی کی فطری رعنائیوں اور قدرتی مناظر کے مدح خوان رہے۔ جھیل ڈل پر انہوں نے یہ خوبصورت نظم لکھی:

اللہ اللہ ہے کیا حُسنِ چمن پانی میں
سبزہ و لالہ و گل سرو و سمن پانی میں
تودۂ سیم ہے اس ڈل کے خزانے میں نہاں
برفِ کہسار ہے کیا عکس فگن پانی میں
ہیں شکارے میں سیہ چشم بتانِ کشمیر
یا کہ اُترے ہیں غزالانِ ختن پانی میں
لبِ ڈل آپ بھی کاشانہ بنالیں ناظؔر
موسم گل میں رہے لطف سخن پانی میں

مغل شہنشاہ جہانگیر سے منسوب ایک مشہور شعر کی تضمین ناظؔر نے ایک دل نشین پیرائے میں اس غزل نما نظم میں کی ہے:

اُدھر اک وارثِ اورنگ اکبر
جلوسِ خسروی فرما رہا تھا
شہِ جم جاہ نورالدین جہاں گیر
شکوہِ بزم جم دکھلا رہا تھا
اُدھر نور جہاں کا جلوۂ حسن
درو دیوار کو چمکا رہا تھا
اُدھر محو نوا سرمست مطرب
سرودِ آسمانی گا رہا تھا
یہ نقشہ دیکھ کر بزم شہی کا
سروشِ غیب یہ فرما رہا تھا
”اگر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است“

ناظرؔ نے حسن کشمیر اور اس کے رنگا رنگ موسموں کی اپنے کلام میں دل کھول کر ستائش کی ہے۔ وادیٔ کشمیر میں جاڑوں کے دوران سردی سے کپکپاتے ہوئے جسم گرم رکھنے کی مقامی محسن ''کانگڑی'' پر غالباً ان کی کہی ہوئی نظم کسی شاعر کی تحریر کردہ واحد نظم ہے۔

کانگڑی کی تشکیل ایک ایسے مٹی کے گول برتن سے ہوتی ہے جسے کمہار پیشہ لوگ کچی مٹی سے بنا کر اسے بھٹی میں تاپ کر مضبوطی بخشتے ہیں۔ پھر شاخساز پیشہ ور اس برتن کے ارد گرد بید کے درخت کی پتلی ٹہنیوں کا ایک جال سا بُن کر اسے نئی شکل وصورت بخشتے ہیں۔ اس کا اوپری حصہ دائیں اور بائیں دو دستوں کی شکل میں بُنا جاتا ہے جسے اہل کشمیر دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے لمبے چغے یعنی پھرن کے نیچے رکھ کر موسم سرما میں اس میں ڈالے ہوئے انگاروں سے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ کانگڑی کو زیادہ دیدہ زیب اور قیمتی بنانے کے لئے جب اس کی تیلیوں کے اندر مختلف رنگوں والے ابرق کے ٹکڑے سجائے جاتے ہیں تو کشمیری لوگ اسے دلہن کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔

اس مقالے میں کانگڑی کے علاوہ خوشی محمد ناظر کی دو اور شہرہ آفاق نظمیں جوگی اور فردوسِ زمین کو من وعن پوری طرح شائع کیا جاتا ہے تاکہ محققین اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں ناظر کی اس نایاب شاعری اور بیش بہا منظومات سے استفادہ کر سکیں۔

کانگڑی:

اے مری آرام جاں اے میری دلبر کانگڑی
مہر انور کانگڑی ماہِ منور کانگڑی
وادیٔ کشمیر پر ہے وادیٔ ایمن کو رشک
دیکھ کر جلوہ ترا اے طورِ منظر کانگڑی

نغمۂ فردوس

حصۂ اوّل

یعنی

مجموعۂ کلام

خان بہادر چودھری خوشی محمدؐ صاحب ناظر بی۔ اے
سابق گورنر و منسٹر ریاستِ جموں و کشمیر

مُرتّبۂ

مولوی محمدؐ عبدُاللہ صاحب کامل ایم۔ اے
پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پُور

۱۹۳۷ء

قوتِ بازو جواں کو اور عصا ہے پیر کو
بچۂ کوشُر کو ہے پستانِ مادر کانگڑی
بطن مادر میں رہی پہلو میں اکثر کانگڑی
بعد مُردن نور گستر تھی لحد پر کانگڑی
خلد میں کشمیر والوں کا رہے گا جی اُچاٹ
گر نہ اس جنت میں پہنچی حور پیکر کانگڑی
آستیں میں کانگڑی ہے زیرِ داماں کانگڑی
کانگڑی زیرِ عبا ہے زیرِ چادر کانگڑی
خانہ آبادی زمستاں میں اسی کے دم سے ہے
شوہرِ بانو ہے اور بانوئے شوہر کانگڑی
ہانجی اور ہانجن میں باہم گر کبھی چھڑ جائے جنگ
روکتی ہے ہم تلو کا حملہ اکثر کانگڑی
داغ دیتی ہے دلوں پر اپنے دیوانوں کے یہ
شب کو جب پہلو بدلتی ہے مچل کر کانگڑی
اس کا دامن گیر ہے کشمیر کا میر و وزیر
ہے نشاطِ مفلس و عیش تونگر کانگڑی
تختۂ صندل کو دیتی ہے یہ رنگِ آبنوس
سنگِ موسیٰ سے بدل دیتی ہے مرمر کانگڑی
آتش رُخ سے وہ گرماتی ہے اہل بزم کو
گاہ ساقی کانگڑی ہے گاہ ساغر کانگڑی
عاشقِ دل سوختہ کا ہے مزارِ گنبدی
یا نگارِ شعلہ رو کا حجلۂ زر کانگڑی

لن ترانی دیکھ کر فصل زمستان میں تری
چھپ گیا خورشید خاور مثل شپر کانگڑی

تن بدن میں اُن کے فوراً رشک سے لگ جائے آگ
قاف کی پریاں جو دیکھیں تیرے شہپر کانگڑی

باغ میں حیراں ہے نرگس چشم فتاں سے تری
رشک سنبل ہے تری زلفِ معنبر کانگڑی

بن سنور کر جا رہی ہے سیر گلشن کو مگر
چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں ماتھے پہ جھومر کانگڑی

ناف میں تیری نہاں ہے نافۂ آہوے چین
ہے رگ و ریشہ میں تیرے عود و عنبر کانگڑی

ابر و باراں میں فزوں ہے کانگڑی کی آب و تاب
برف کے دریا میں ہے ہر سُو شناور کانگڑی

ہے اندھیرے غار میں اک راہب روشن ضمیر
یا عبا کی ظلمتوں میں نور گستر کانگڑی

اس کے سینے میں نہاں ہے جلوۂ نورِ ازل
معبد زرتشت ہے معبود آذر کانگڑی

ابر کے پردے میں گردش کر رہا ہے آفتاب
یا پھرن کے پھیر میں کھاتی ہے چکر کانگڑی

مدرسہ میں ہے نواسنجِ گلستاں بوستان
خانقہ میں بحر عرفان کی شناور کانگڑی

عرش سے اس پر اُترتے ہیں مضامین بلند
رات کو رکھے بغل میں گر سخن ور کانگڑی

واعظوں کو بھی ہدایت میں یہی ہے رہنما
لیڈروں کو بھی سیاست میں ہے رہبر کانگڑی
خطۂ کشمیر میں تو شاد ہو آباد ہو
لال رکھے تجھ کو دائم رب اکبر کانگڑی
منتظر مدت سے ناظرؔ بھی ہے اس دن کے لئے
جب گورنر کانگڑی ہو اور منسٹر کانگڑی
حال پر اس کے رہے سرکار کا الطاف خاص
تیری بندی دل سے ہے اے شاہِ کشور کانگڑی
شکر احساں سے ترے غافل تھے اہل کاشمر
اس لئے ناظرؔ بنا تیرا ثنا گر کانگڑی

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ناظر کا کلام اب تقریباً ناپید ہے۔ ''نغمہ فردوس'' کے نام سے ان کی منظومات کو ان کے ایک فرمانبردار حبیب اور ''اولادِ معنی'' مولوی محمد عبداللہ کاملؔ نے مرتب کر کے 1937ء میں منظر عام پر لایا تھا۔ یہ کتاب بھی اب کسی کتب خانے میں خال ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

خطہ کشمیر کے ساتھ ناظر کے بے پناہ عشق کا اظہار ''فردوسِ زمیں'' جیسی اس بہترین نظم میں ان دل نشیں اشعار میں کیا گیا ہے:

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا
مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
مگر عالم میں اے گلزارِ کشمیر
کوئی خلد بریں تجھ سا نہ دیکھا
ہیں حسن و عشق کے رمنے ترے باغ
گل و بلبل میں یاں یارانہ دیکھا

چمن زاروں میں آبِ جو کا منظر
وہ موجِ سیم کا لہرانا دیکھا
وہ اونچی وادیوں میں جلوۂ گل
کہ باغ وراغ میں اصلانہ دیکھا
وہ کوہِ برف پر تنویرِ خورشید
پھر ایسا آتشیں دریانہ دیکھا
وہ گلزاروں میں ہر سُو جعدِ سنبل
حریفِ گیسوئے جانانہ دیکھا
الگ بزمِ چمن سے سونے والا
لبِ جو سبزۂ بیگانہ دیکھا
ہے ہر سرو سخن لیلٰی کا محمل
مگر مجنوں نے یہ صحرا نہ دیکھا
افق پر وہ ضیا پاشی سحر کی
کہیں یہ نور کا تڑکا نہ دیکھا
سفیدوں کے وہ پرچم وادیوں میں
وہ میداں مخیم شاہانہ دیکھا
وہ ہر سُو سیم گوں تالاب دیکھے
کہ ایسا کوئی مہہ سیمانہ دیکھا
کنول کے پھول پر جس دم نظر کی
مئے گلرنگ کا پیمانہ دیکھا
گرے پتوں پہ جب پانی کے قطرے
تو ہر اک گوہرِ یک دانہ دیکھا

شفق کی جلوہ ریزی بادلوں میں
کہ موسیٰ نے بھی یہ سینا نہ دیکھا
وہ جاں پرور تھا کیف زعفران زار
کہ دہقان بے پئے مستانہ دیکھا
وہ دھانی کھیت میں شفاف پانی
زمینداروں کا آب ودانہ دیکھا
چھتوں پر لالہ وگل کا سماں تھا
تو پائیں باغ صحن خانہ دیکھا
وہ ہر جانب تماشائے لبِ بام
وہ ہر سو کوچۂ جانانہ دیکھا
تھا صحن بوستاں بزمِ حریفاں
کہیں شیشہ کہیں پیمانہ دیکھا
کہیں تھی گرم مشتاقوں کی محفل
ادھر شمع اُدھر پروانہ دیکھا
سیہ چشموں کی اک ترچھی نظر سے
غزالِ دشت کو دیوانہ دیکھا
اسی کیف تماشا میں سرِ شام
وہ شالامار کا مئے خانہ دیکھا
سماں پھر چاندنی کا اس چمن میں
سکوتِ شب میں خاموشانہ دیکھا
وہ دیکھا خواب میں رنگیں مرقع
کہ بیداری میں پھر ایسا نہ دیکھا

☆

دھندلکا آسماں پہ چھا رہا تھا
زمیں پہ ابر سا لہرا رہا تھا
اُٹھا تھا جھوم کے وہ وادیوں سے
خراماں گھاٹیوں کو آ رہا تھا
شمیم روح پرور سے گلستاں
نسیم صبح کو مہکا رہا تھا
چناروں کے قدِ بالا سے طوبیٰ
ریاضِ خلد میں شرما رہا تھا
تھا فوّارے کا ہر سو رقصِ پیہم
تو آبِ جو اُچھلتا جا رہا تھا
یہ فوارہ تھا یا سیال گلبن
روپہلی پھول سے برسا رہا تھا
یہ سیمیں سلسلہ آبِ رواں کا
چمن میں چاندنی چھٹکا رہا تھا
مقابل باغ کے تالاب ڈل کا
پری کو آئینہ دکھلا رہا تھا
وہ عالم نور کا تھا بزمِ گل پر
کہ شعلہ طُور کا شرما رہا تھا
چمن میں موجزن تھا جلوۂ گل
کہ سیل رنگ اُمڈا آ رہا تھا
تھے طائر نغمہ خواں شاخ و شجر پر
کہ سرتاپا گلستاں گا رہا تھا

ترنم سا ہوا میں بس رہا تھا
تجمل سا فضا پر چھا رہا تھا
صدائے کوس و طبل شہریاری
کہستاں ہر طرف دو ہرا رہا تھا
ادھر اک وارثِ اورنگ اکبر
جلوسِ خسروی فرما رہا تھا
شہہِ جم جاہ نورالدین جہانگیر
شکوہِ بزمِ جم دکھلا رہا تھا
ادھر نورِ جہاں کا جلوۂ حسن
درو دیوار کو چمکا رہا تھا
فروغ عارفین مہرالنساء سے
جمالِ یوسفی گہنا رہا تھا
وہ حسن و عشق کا مغلی مرقع
زمانہ کو دکھایا جا رہا تھا
ادھر محو نوا سرمست مطرب
سرودِ آسمانی گا رہا تھا
وہ تار چنگ و بربط کی تڑپ سے
رگِ جاں میں لہو دوڑا رہا تھا
وہ تھی دربار کی شان آشکارا
کہ بندوں کو خدا یاد آ رہا تھا
اگر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

دراصل خوشی محمد ناظر کی مکمل پہچان بحیثیت ایک کامیاب اور پُر اثر نظم گو کی حیثیت سے اُس وقت ہوئی جب انہوں نے ''جوگی'' نظم لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے ہر خاص و عام کی زبان سے سنی جانے لگی۔

اس نظم میں ایک مردِ میدان اور ایک سادھو کے درمیان ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ شاعر، جوگی کو کشمیر کے پہاڑوں میں بے مزہ زندگی گزارنے کا سلسلہ ترک کر کے واپس شہر میں آنے اور زندگی کے عمل میں بھرپور حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے لیکن جوگی دنیاوی زندگی کے اُن مکروہ اور انسان دشمن پہلوؤں کی نقاب کشائی کے لئے اپنی خلوت ہی کی جلوت سمجھتا ہے جنہوں نے زمانے کی ساری نیکیوں اور روحانی اقدار کو پامال کر کے رکھا ہے۔ وہ شاعر سے کہتا ہے کہ وہ اُس دنیا میں واپس نہیں لوٹ سکتا جہاں فتنہ وفساد اور انسانی نفرت کا دور دورہ ہو۔ وہ شاعر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بھی اس بے رحم دنیا کی بے رحمیوں سے کنارہ کش ہو کر جوگی کے ساتھ ہم نشین ہو اور اس خلوت میں یادِ خدا کے ذکرِ حمیدہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی سکون اور طمانیت کے ساتھ گزارے۔ یہ سدابہار نظم یوں ہے:

''جوگی''

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعہ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار ہوئے ہر سرو وسمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے مستانہ وہ تانیں اُڑانے لگے

اشجار بھی وجد میں آنے لگے گلزار بھی بزمِ سرور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ نشاط سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب وسمور ہوا
تھا دل کش منظر باغِ جہاں اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جانکلا ناظر دیوانہ
چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاونی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کُہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
اک مست قلندر جوگی نے پربت پر ڈیرا ڈالا تھا
تھی راکھ جٹائیں جوگی کی اور انگ بھبھوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کے ہم نے سلام کیا
تیکھے چتون سے جوگی نے تب ناظرؔ سے یہ کلام کیا
کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو؟
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں اُن کو پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص وہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے

ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ساجن کی
ہم جوت لگاتے ہیں من کی تم اس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو؟
یوں ڈانٹ ڈپٹ کر جوگی نے جب ہم سے یہ ارشاد کیا
سر اُس کے جھکا کر چرنوں پر جوگی کو ہم نے جواب دیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی یوں آنکھ نہ ہم سے چُرا جوگی
ہم آئے ہیں ترے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں جنگل میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وَجہُ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر جگہ ہے اور ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے گلیوں میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

پھر جوگی جی بیدار ہوئے اس چھیڑ نے اتنا کام کیا
پھر عشق کے اس متوالے نے یہ وحدت کا اک جام دیا
ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا

ہے شہروں میں غل وشور بہت اور کام کرودھ کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورِ نفسانی جنگل میں ہے جلوۂ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا
جب پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں
سب بن کے برچھ جھک جاتے ہیں تھم جاتے ہیں دریا بابا
ہے حرص وہوا کا دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں یہ راہ بھلا بابا
پرماتما کی وہ چاہ نہیں اور روح کو دل میں راہ نہیں
ہر بات میں اپنے مطلب کی تم گھڑ لیتے ہو خدا بابا!
تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہرنام کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص وہوا بابا
دھن ودولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

جب سے مستانہ جوگی کا مشہور جہاں افسانہ ہوا
اُس روز سے بندۂ ناظرؔ بھی پھر بزم میں نغمہ سرا نہ ہوا

کبھی منصب وجاہ کی چاٹ رہی کبھی پیٹ کی پوجا پاٹ رہی
لیکن یہ دل کا کنول نہ کھلا اور غنچۂ خاطر وا نہ ہوا
کہیں لاگ رہی کہیں بیت رہی کبھی ہار رہی کبھی جیت رہی
اس کلجگ کی یہی ریت رہی کوئی بند سے غم کی رہا نہ ہوا
یوں تیس برس جب تیر ہوئے ہم کارِ جہاں سے سیر ہوئے
تھا عہدِ شباب سراب نظر وہ چشمۂ آبِ بقا نہ ہوا
پھر شہر سے جی اُکتانے لگا پھر شوق مہار اُٹھانے لگا
پھر جوگی جی کے درشن کو ناظر اک روز روانہ ہوا
کچھ روز میں ناظر جا پہنچا پھر ہوش رُبا نظاروں میں
پنجاب کے گرد و غباروں سے کشمیر کے باغ بہاروں میں
پھر بن باسی بیراگی کا ہر سمت سراغ لگانے لگا
بنہال کے بھیانک غاروں میں پنچال کی کالی دھاروں میں
اپنا تو زمانہ بیت گیا سرکاروں میں درباروں میں
پر جوگی میرا شیر رہا پربت کے سونے غاروں میں
وہ دن کو ٹہلتا پھرتا تھا ان قدرت کے گلزاروں میں
اور رات کو محوِ تماشا تھا انبر کے چمکتے تاروں میں
برفاب کا تھا اک تال یہاں یا چاندی کا تھا تھال یہاں
الماس جڑا تھا زمرد میں یہ تال نہ تھا کہساروں میں
تالاب کے ایک کنارے پر یہ بن کا راجہ بیٹھا تھا
تھی فوج کھڑی دیوداروں کی ہر سمت بلند حصاروں میں
یہاں سبزہ و گل کا نظارہ تھا اور منظر پیارا پیارا تھا
پھولوں کا تخت اُتارا تھا پریوں نے ان کہساروں میں

یاں بادِ سحر جب آتی تھی بھیروں کا ٹھاٹھ جماتی تھی
تالاب رباب بجاتا تھا لہروں کے تڑپتے تاروں میں
کیا مست الست نوائیں تھیں ان قدرت کے نرماروں میں
ملہار کا روپ تھا چشموں میں سارنگ کا رنگ فواروں میں
جب جوگی جوشِ وحدت میں ہر نام کی ضرب لگاتا تھا
اک گونج سی چکر کھاتی تھی کہساروں کی دیواروں میں
اس عشق وہوا کی مستی سے جب جوگی کچھ ہوشیار ہوا
اُس خاک نشیں کی خدمت میں یوں ناظر عرض گزار ہوا
کل رشک چمن تھی خاکِ وطن ہے آج وہ دشتِ بلا جوگی
وہ رشتۂ الفت ٹوٹ گیا کوئی تسمہ لگا نہ رہا جوگی
برباد بہت سے گھرانے ہوئے آباد ہیں بندی خانے ہوئے
شہروں میں ہے شور بپا جوگی گاؤں میں ہے آہ وبکا جوگی
وہ جوشِ جنوں کے زور ہوئے انسان بھی ڈنگر ڈھور ہوئے
بچوں کا ہے قتل روا جوگی بوڑھوں کا ہے خون بہا جوگی
یہ مسجد میں اور مندر میں ہر روز تنازع کیسا ہے؟
پرمیشور ہے جو ہندو کا مسلم کا وہی ہے خدا جوگی
کاشی کا وہ چاہنے والا ہے یہ مکّے کا متوالا ہے
چھاتی سے تو بھارت ماتا کی دونوں نے ہے دودھ پیا جوگی
ہے دیش میں ایسی پھوٹ پڑی اک قہر کی بجلی ٹوٹ پڑی
روٹھے متروں کو منا جوگی بچھڑے بیروں کو ملا جوگی
کوئی گرتا ہے کوئی چلتا ہے گرتوں کو کوئی کچلتا ہے
سب کو اک چال چلا جوگی اور ایک ڈگر پر لا جوگی

وہ میکدہ ہی باقی نہ رہا وہ خم نہ رہا ساقی نہ رہا
پھر عشق کا جام پلا جوگی یہ لاگ کی آگ بجھا جوگی
پربت کے نہ سوکھے روکھوں کو یہ پریم کے گیت سنا جوگی
یہ مست ترانہ وحدت کا چل دیس کی دھن میں گا جوگی
بھگتوں کے قدم جب آتے ہیں کلجگ کے کلیش مٹاتے ہیں
تھم جاتا ہے سیل بلا جوگی رُک جاتا ہے تیرِ قضا جوگی
ناظر نے جو یہ افسانۂ غم رودادِ وطن کا یاد کیا
جوگی نے ٹھنڈی سانس بھری اور ناظرؔ سے ارشاد کیا
بابا ہم جوگی بن باسی جنگل کے رہنے والے ہیں
اس بن میں ڈیرے ڈالے ہیں جب تک یہ بن ہریالے ہیں
اس کام کرودھ کے دھارے سے ہم ناؤ بچا کر چلتے ہیں
جاتے یاں منہ میں مگرمچھ کے دریا کے نہانے والے ہیں
ہے دیس میں شور پکار بہت اور جھوٹ کا ہے پرچار بہت
واں راہ دکھانے والے بھی بے راہ چلانے والے ہیں
کچھ لالچ لُوبھ کے بندے ہیں کچھ مکر و فریب کے پھندے ہیں
مورکھ کو پھنسانے والے ہیں یہ سب مکڑی کے جالے ہیں
جو دیس میں آگ لگاتے ہیں پھر اس پر تیل گراتے ہیں
یہ سب دوزخ کا ایندھن ہیں اور نرک کے سب یہ نوالے ہیں
بھارت کے پیارے پُوتوں کا جو خون بہانے والے ہیں
کل چھاؤں میں جس کی بیٹھیں گے وہی پیڑ گرانے والے ہیں
جو خون خرابا کرتے ہیں آپس میں کٹ کٹ مرتے ہیں
یہ بیر بہادر بھارت کو غیروں سے چھڑانے والے ہیں؟

جو دھرم کی جڑ کو کھودیں گے بھارت کی ناؤ ڈبو دیں گے
یہ دیس کو ڈسنے والے ہیں جو سانپ بغل میں پالے ہیں
جو جیو کی رکھشا کرتے ہیں اور خوفِ خدا سے ڈرتے ہیں
بھگوان کو بھانے والے ہیں ایشور کو رجھانے والے ہیں
دُنیا کا ہے سرجن ہار وہی معبود وہی مختار وہی
یہ کعبہ کلیسا بت خانہ سب ڈول اُسی نے ڈالے ہیں
وہ سب کا پالن ہارا ہے یہ کنبہ اسی کا سارا ہے
یہ پیلے ہیں یہ کالے ہیں سب پیار سے اس نے پالے ہیں
کوئی ہندی ہو کہ حجازی ہو کوئی تُرکی ہو یا تازی ہو
جب نیر پیا اک ماتا کا سب ایک گھرانے والے ہیں
سب ایک ہی گت پر ناچیں گے سب ایک ہی راگ الاپیں گے
کل شیام کنہیا پھر بَن میں مُرلی کو بجانے والے ہیں
آکاش کے نیلے گنبد سے یہ گونج سنائی دیتی ہے
اپنوں کے مٹانے والوں کو کل غیر مٹانے والے ہیں
یہ پریم سندیسا جوگی کا پہنچادو اُن مہاپُرشوں کو
سودے میں جو بھارت ماتا کے تن من کے لگانے والے ہیں
پرماتما کے وہ پیارے ہیں اور دیس کے چاند ستارے ہیں
اندھیر نگر میں وحدت کے جو جوت جگانے والے ہیں
ناظرؔ یہیں تم آبیٹھو اور بن میں دھونی رما بیٹھو
شہروں میں گرو پھر چیلوں کو کوئی ناچ نچانے والے ہیں

ناظرؔ کی اس یادگار نظم کی خصوصیات یہ ہے کہ اس کے ہر شعر میں دیا ہوا پیغام روحانیت ہمالہ کے ایک شفاف چشمے کی طرح نظر آتا ہے جس میں انسان

عکس الٰہی دیکھ کر نفسیاتی اور فکری طور پر سرشار ہو جاتا ہے۔ اس تخلیق میں جو منفرد اسلوب استعمال کیا گیا ہے وہ شاعر کے اندازِ کلام کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور جوگی کے مخصوص لہجے کو بھی اپنی مخصوص تلمیحات، ترکیبوں اور اشاروں سے حیات بخش بنا دیتا ہے۔

نظم میں اُن جٹادھاری جوگیوں اور ننگ دھڑنگ سادھوؤں کی خلوت گاہیں نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں جو بنوں میں زندگی گزار کرِ خالق کائنات کا اپنے ہی دل میں دیدار کرتے ہیں اور شہروں کے بے ہنگم شور و غوغا اور مسجدوں اور مندروں میں انہیں ذاتِ باری کی تلاش بے سود لگتی ہے۔

نظم جوگی تصوف کے اُس فلسفہ کی بھی عکاسی کرتی ہے جس کی رو سے ہر ذی ہوش انسان بنی آدم کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد جان کر اُس کے احترام کو آدمیت کا ماحصل سمجھتا ہے۔ یہ فلسفہ ہمارے یہاں لل عارفہ اور شیخ نور الدین سے پہلے ہی دنیائے مشرق میں سینکڑوں صوفی شاعروں، اولیاء اللہ اور وحدت الوجود کے پرستاروں نے چارسُو ایک مکمل اور پاکیزہ طرزِ حیات کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ نظم آج کے معاشرے کے لئے برمحل اور برحق ہے۔ اس میں بھی اس کی افادیت کا راز پوشیدہ ہے۔

خوشی محمد ناظر سرزمین کشمیر سے دلی الفت رکھنے والے ایک ایسے سخن گو کا نام ہے جو کشمیری ثقافت اور ادبیات کے حوالہ سے اب تک اہل کشمیر کے دلوں میں مسند نشین ہے۔

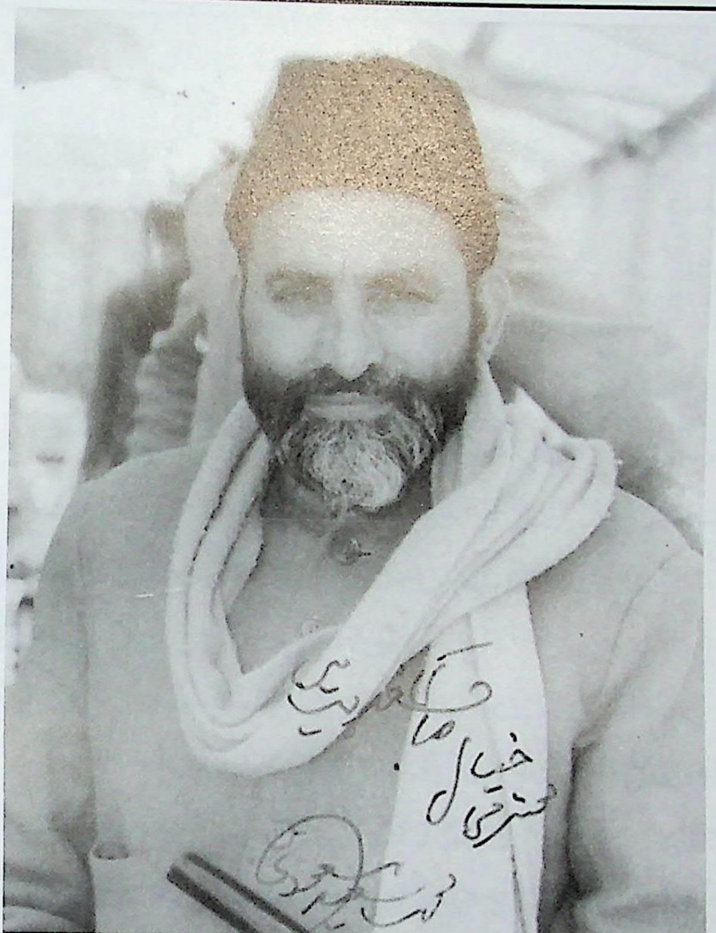
☆☆☆

مُفکرِ کشمیر: مولانا محمد سعید مسعودی

مولانا محمد سعید مسعودی کے ساتھ میری خوش نصیبی کا ماحصل اُن کے تئیں میرے تعلقات کی خوبصورت تصویر اس روز ایک سیاہ عکس میں تبدیل ہو کے رہ گئی جب اس پیر بزرگ کو نامعلوم قاتلوں کے بے رحم ہاتھوں نے اُس وقت قتل کیا جب وہ پہلے ہی بستر مرگ پر صاحب فراش تھے اور اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں یادِ خدا کرتے ہوئے گذار رہے تھے۔

1958ء میں مجھے ایک سیاسی مقدمے میں ملوث کر کے پسِ زنداں ڈال دیا گیا اور سری نگر کے سنٹرل جیل میں ہی مولانا کے ساتھ میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب انہیں بھی تقریباً ایک سو سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ نام نہاد حضرت بل قتل کیس میں ماخوذ کر کے گرفتار کیا گیا تھا۔

جیل کے روز و شب گذارنے کے عمل میں ہم قیدیوں کا یہ معمول بن گیا تھا کہ ہم روز صبح کو جیل خانے کے وسیع احاطے میں جمع ہو کر کشمیر کے سیاسی حالات اور دیگر امور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور گفت وشنید کا یہ سلسلہ دوپہر تک جاری رہتا تھا۔ ان محفلوں میں جہاں مرزا غلام قادر بیگ اپنے گھسے پٹے اور پھیکے لطیفوں سے دوسروں کے برعکس خود ہی محظوظ ہوتے تھے وہاں مولانا انتہائی سنجیدگی کے عالم میں مختلف امور پر اپنی مفکرانہ رائے کا اظہار کرتے تھے اور ان کے قول و فعل کے ساتھ بحث و تکرار کی گنجائش بہت کم باقی رہتی تھی۔



مولانا محمد سعید مسعودی

مولانا کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں شعروشاعری کے ساتھ شغف رکھتا ہوں تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کا بیڑا اٹھایا۔

نظر بندی سے پہلے میں نے ریڈیو کشمیر سری نگر کی لائبریری میں عمر خیام کا آغا شاعر قزلباش کا کیا ہوا اردو ترجمہ پڑھا تھا۔ اگرچہ یہ ترجمہ فنی اور شعری اعتبار سے اتنا اثر انگیز اور دل نشین نہیں تھا لیکن خیام کے فلسفۂ حیات نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا اور اسی وقت میرے دل میں یہ خواہش شدت سے جاگ

اٹھی تھی کہ عمر خیام کی رباعیات کا کشمیری میں بھی ترجمہ کیا جانا چاہیئے۔

جب میں نے جیل میں مولانا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ کیا میں نے فارسی پڑھی ہے؟ جب میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ کہنے لگے ”خیالؔ صاحب! کسی بھی ادبی فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہو تو اصل سے کیا جانا چاہیئے ورنہ ترجمہ کے خدو خال پھیکے رہ جاتے ہیں“ ساتھ ہی یہ کہہ کر میرا دامن گویا خوشیوں کی سوغات سے بھر دیا کہ وہ خود مجھے فارسی پڑھائیں گے۔

اس طرح سے سینٹرل جیل میں مولانا صاحب کی وساطت سے فارسی کی مطبوعات گلستان، بوستان، پیامِ مشرق اور دیوان حافظ آنے لگیں۔ یہ کتابیں دہلی سے مس مردولا سارا بھائی بھیجا کرتی تھیں جنہیں اُس وقت کے علیحدگی پسند سیاست دان بہن جی کہہ کر پکارتے تھے اور جن کا گھر نئی دہلی کے راجدوت مارگ میں مفت خور کشمیری سیاست کاروں کے لئے قیام و طعام کا ایک مستقل مرکز بن چکا تھا۔

اسی دوران مجھے دیوان حافظ کے مطالعہ کا بھی موقع نصیب ہوا۔ یہ دیکھ کر میرا ذہن بار بار ایک بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے مضطرب رہا کہ فارسی کے اس بلبلِ شیراز نے اپنے دیوان کا مطلعِ اوّل عربی زبان کے مصرع سے کیوں منتخب کر لیا تھا۔ دیوانِ حافظ کا اولین شعر یوں ہے:

الا یا ایہا السّاقی ادر کاساً وناولہا
کہ عشق آساں بود اوّل ولے اُفتاد مُشکلہا

میں نے اسی عالم تجسس میں ایک دن مولانا سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا ”آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ مصرعۂ اول حافظ کا نہیں بلکہ یزید بن معاویہ کا ہے جو عربی زبان کا ایک پختہ مشق شاعر بھی تھا۔ یزید کا اصل

شعر یوں ہے:

انا المسموم ما عندی بتر یاقٍ ولاراقی
ادرکاساً و ناوِلہا اَلا یا ایہاّ السّاقی

اس کے معنی یوں ہیں کہ "مجھے زہر دیا گیا ہے اور میرے پاس تریاق بھی نہیں ہے۔ اب یہی ایک راستہ بچا ہے میرے ساقی! کہ تو جام بھر لے اور اسے گردش میں لا"۔

مولانا نے اس بارے میں مزید فرمایا کہ جب حافظؔ کے نقادوں نے اس سے سوال کیا کہ آپ کو کیا ضرورت پڑی کہ ایک شیعہ ہو کر اور اس مسلک کے پیروکار ہو کر بھی قاتل اہلِ بیت یزید کے شعر کو اپنے دیوان کا سرنامہ بنایا تو حافظؔ نے جواباً ان سے کہا "کیا آپ میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جو ایک کتّے کو گلے میں موتیوں کی مالا لٹکائے ہوئے دیکھے اور اس سے یہ بیش بہا چیز چھیننے سے اجتناب کرے؟"

کسی اور بذلہ سنج شاعر نے بھی حافظؔ کی حمایت میں اس سوال کا جواب اس طرح دیا:

خواجہ حافظ را شبے دیدم بہ خواب
گفتمش اے عقل ودانش بے مثال
از چہ بر خود نسبتی شعرِ یزید؟
باوجودِ ایں ہمہ نقل و کمال
گفت واقف نیست در ایں مسئلہ؟
مالِ کافر ہست برمومن حلال

یہاں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ کیا حافظ شیعہ تھا یا سُنّی؟ حافظ کا نام شمس الدین محمد تھا اور شبلی نعمانی نے اس کے والد کا نام مولوی بہاوالدین بتایا ہے جو

عام طور پر سُنّی مسلک کے لوگوں کا نام ہوتا ہے۔ شیعہ فرقہ کے پرستاروں کے اسماء کے ساتھ بالعموم جعفری، حیدری، نقوی، ہاشمی، عباسی، کاظمی، حُسینی، رضوی، فاطمی، انصاری، عابدی، جلالی، صفوی اور موسوی جیسے سرنامے جڑے ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی غالباً حافظ کے اتباع میں یزید کے اس شعر کا یوں استفادہ کیا ہے

دل گیتی انا المسموم انا المسموم فریادش

خرد نالاں کہ ماعندی بتریاق ولاراقی

دیوان حافظ کے اس دلچسپ آغاز سے کس طرح مولانا مسعودی کو آگاہی حاصل تھی یہ انہی جیسے سخن فہم اصحابِ دانش وبینش کا خاصہ ہوسکتا ہے۔

تقریباً دو سال تک مولانا کی شاگردی میں مجھے فارسی زبان سے واقفیت حاصل ہوئی اور اس تدریسی عمل کو مرحوم حسام الدین بانڈے نے مکمل کرلیا جو فارسی زبان وادب پر خاصا عبور رکھتے تھے۔

اس دوران جب میں نے مولانا صاحب کے سامنے خیام کی رباعیات کو کشمیری میں منتقل کرنے کی خواہش کا اعادہ کیا تو انہوں نے مس مردولا سارا بھائی کو خط لکھ کر سید سلیمان ندوی کی شہرہ آفاق تصنیف 'خیام' دہلی سے منگوائی اور مجھے عنایت کر کے فرمایا۔ "لیجئے اب آپ کا مقصد پورا ہوا چاہتا ہے۔ اب آپ قلم تھامئے اور خیّام کو خیال کا جامہ پہنایئے"

خیام کے ترجمے کا یہ سلسلہ مسلسل اور غیر مسلسل طور پر سال دو سال تک جاری رہا۔ میں نے رُباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ بھی مکمل کرلیا اور ایک زنداں نامہ "زنجورہ ہندساز" (سازِ زنجیر) کے نام سے ایک شعری مجموعہ کی شکل میں تخلیق کیا جو بعد میں 1963ء میں اشاعت پذیر ہوا اور جسے میں نے

''خلوص اور احترام کے ساتھ'' مولانا صاحب کی نذر کیا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ جیل میں ہمارے روزہ مرّہ میں یہ مسلسل عمل شامل تھا کہ ہم قیدی ہر روز ناشتے کے بعد مل کر صحن میں ایک مخصوص جگہ پر جمع ہو کر تبادلہ خیال کرتے اور سری نگر ریڈیو کی خبروں کو ''جھوٹ کا پلندہ'' قرار دے کر ایک ذہنی آسودگی حاصل کرتے۔ ان غیر رسمی محفلوں میں محاذ رائے شماری کے جانے پہچانے اراکین صوفی محمد اکبر، مرزا غلام قادر بیگ ذیلدار، غلام محی الدین شاہ، حسام الدین بانڈے، علی محمد نایک، مرزا غلام قادر بیگ، مرزا محمد یعقوب بیگ، محمد خلیل جوہر، پیر مقبول ویلہ گالی، پیر یوسف شاہ مانکی شریف، غلام قادر شیر گاندربلی اور کشمیر پولیٹکل کانفرنس کے غلام رسول قرہ۔ عبدالحمید قرہ، محمد امین نحوی، شیخ غلام محمد اور مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

مولانا صاحب کے علمی تبحر کا یہ عالم تھا کہ وہ کشمیری، فارسی، اردو اور عربی کے علاوہ پشتو زبان سے بھی پوری طرح واقف تھے لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وہ انگریزی زبان پر بھی ناقابلِ یقین اور حیران کُن عبور رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ ہمارے مقدمے کی کارروائی کے حوالے سے جو جیل ہی کے احاطے میں کئے جانے کا اعلان ہو چکا تھا، سرکار کی طرف سے غیر معمولی تاخیر کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ نظر بند قیدی اس دانستہ تغافل سے تنگ آچکے تھے تو ہمارے زندانی احباب میں سے چند ماہرین قانون نے ایک طویل عرضی سرکار کے نام اس غرض سے تحریر کی کہ مقدمہ کی کارروائی میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ اس عرضی کا مسودہ اس وقت کے ماہر وکلاء علی محمد نایک، مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی، غلام محی الدین شاہ، عبدالحمید قرہ، محمد امین نحوی اور مرزا یعقوب بیگ سبھی نے محنت شاقہ سے تیار کیا اور بعد میں یہ طے پایا کہ

اس کا مسودہ مولانا کو بھی دکھایا جائے شاید وہ کوئی مفید مشورہ دے سکیں۔ مولانا اس وقت جولاہی خانہ نام کی ایک عقب والی بارک میں پنڈت کشیپ بندھو کے ساتھ نظر بند تھے۔ عرضی میں ایک جگہ یہ لکھا گیا تھا کہ **Speedy trial** شروع کی جائے۔ مولانا نے اس اپیل کو بغور پڑھنے کے بعد فرمایا ”میرے دوستو! **Speed** کا تعلق رفتار سے ہے یعنی اگر کوئی عمل شروع کیا جائے تو وہ رفتار بھی پکڑ سکتا ہے لیکن ہمارا مقدمہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے لہٰذا میری ناچیز رائے میں یہاں پر speedy کی بجائے **immediate** لکھا جائے یعنی مقدمہ کی کارروائی فوری طور پر شروع کی جائے۔ نصف درجن تجربہ کار وکیلوں کی تحریر کردہ اس درخواست کا مفہوم کس طرح مولانا کے تجویز کردہ صرف ایک لفظ نے بدل ڈالا اُس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اسی طرح دہلی سے مس سارا بھائی نے مولانا صاحب کے مطالعے کی خاطر دنیا کے ممتاز فلسفی لارڈ برٹرینڈ رسل کی مشہور تصنیف **The History Of Western Philosophy** بھیج دی تو ہمارے انگریزی دان احباب نے مولانا سے درخواست کی کہ پہلے انہی کو یہ کتاب پڑھنے کا موقع د
مولانا حبِ دستور راضی ہوئے اور ایک صاحب کے ہاتھ میں یہ تص
کہا ”ٹھیک ہے، آپ ہی پہلے پڑھ کر اسے ذہن نشین کریں۔ میں انتظار کروں گا“

کوئی دو ہفتے بعد مولانا پھر ہمارے پاس تشریف لائے اور کتاب کے مطالعہ کے شوقین حضرات سے اس کا لب لباب بیان کرنے کو کہا لیکن حیرت ہے کہ وہ اس تاریخ ساز کتاب کے موضوع پر دو لفظ بھی بولنے سے قاصر رہے۔ اس کے بعد مولانا نے تقریباً نصف گھنٹے تک رسل کے فلسفہ اور اس کا تجزیہ اس انداز میں کر کے اس پر سیر حاصل روشنی ڈالی کہ سبھی حیرت میں پڑ گئے۔ کیونکہ

مولانا نے انگریزی میں کوئی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ یہ تھے مولانا مسعودی۔ عالمِ بے بدل اور فاضلِ بے مثال۔

مولانا کی گفتگو سے عام طور پر یہ واضح ہو جاتا تھا کہ وہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے متاثر تھے البتہ ایک بار انہوں نے واضح طور پر انکشاف کیا کہ مولانا مودودی نے انہیں ذرّہ بھر بھی متاثر نہیں کیا ہے۔ فضلائے ہند میں مولانا کی نظروں میں اعلیٰ ترین مرتبہ مولانا آزاد ہی کو حاصل تھا اور انہوں نے بالخصوص جیل میں تحریر کردہ مولانا آزاد کی غبارِ خاطر کو بار بار پڑھ کے اسے کم و بیش زبانی یاد کر لیا تھا۔ کئی مواقع پر انہوں نے مولانا آزاد کی بے مثال یادداشت کا تذکرہ کرتے ہوئے امام الہند کو ہندوستان کی شان اور روحِ ہند کا ایمان قرار دیا۔

جیل سے رہائی کے بعد مولانا ہی کی سفارش پر مجھے محاذ رائے شماری کے ترجمان ہفت روزہ ''محاذ'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس اخبار کی مجلس مشاورت میں مولانا کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ۔ مرزا محمد افضل بیگ اور غلام رسول کوچک شامل تھے۔ مولانا نے اس بات کے پیشِ نظر اس مجلس کی کسی بھی نشست میں کبھی شمولیت نہیں کی کیونکہ وہ مرزا افضل بیگ کے ساتھ فکری اور سیاسی اختلافات رکھتے تھے۔ مولانا نے اس اخبار کے لئے کوئی مضمون بھی نہیں لکھا جب کہ شیخ محمد عبداللہ۔ بیگ صاحب، کوچک صاحب اور صدرالدین مجاہد وغیرہ اس کے صفحات پر اپنے بیانات، انٹرویو اور تصاویر دیکھنے کے لئے ہر لمحہ بے چین نظر آتے تھے۔

جب میں نے ایک بار مولانا سے یہ درخواست کی کہ میں ''محاذ'' کیلئے اُن کا ایک خصوصی انٹرویو لینا چاہتا ہوں تو انہوں نے یہ کہہ کر معذرت ظاہر کر لی کہ ''انٹرویو تو بڑے لوگوں کا لیا جاتا ہے۔ ستو کھانے والے ایک گوجر کا انٹرویو

بھلا کیا معنی رکھتا ہے؟''

مولانا محمد سعید مسعودی سری نگر سے چالیس کلو میٹر شمال میں گاندربل کے قصبے میں ایک معمولی سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میں وقتاً فوقتاً اُن کے پاس جایا کرتا تھا اور ان کی علمی صلاحیتوں سے خوشہ چینی کرنے کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ دورانِ گفتگو مولانا گھوم پھر کر ادب، ثقافت اور تاریخ کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لیتے اور اُن کی نرم گفتار میں مولانا شبلی نعمانی۔ سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق اور علامہ اقبال کے سوا حافظ، سعدی، رومی اور اردو فارسی اور عربی کی برگزیدہ شخصیات کا ذکر بار بار ہوتا اور یہ صحبت کبھی صبح سے لے کر شام تک جاری رہتی۔

اسی دوران ''محاذ'' بھی اپنی اشاعت کے صرف ایک سال کے اندر ہی سرکار کی طرف پابندی عائد کیے جانے کے بعد بند ہو چکا تھا اور میں پھر ایک بار ادبی اور صحافتی دنیا میں آوارہ گردی کرتے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر اڑتا رہا۔

دن گذرنے کے ساتھ ساتھ شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مولانا مسعودی کے اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو رہی تھی اور اس دوری کو اور بھی کشادہ کرنے میں مرزا افضل بیگ کا ہاتھ صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دوران ایک ایسا حیران کن اور افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ اصحابِ فہم و فراست شیخ عبداللہ جیسے تجربہ کار سیاست دان کی کم فہمی اور ذہنی کم مائیگی پر واویلا کرتے رہے۔ 1977ء میں شیخ عبداللہ نے مولانا کے آبائی قصبے گاندربل میں ایک عوامی جلسے کا انعقاد کیا جس میں انہوں نے مولانا پر تابڑ توڑ حملے کر کے انہیں ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں کا زرخرید ایجنٹ قرار دیا۔ جب اس جلسے میں موجود مولانا اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی خاطر سٹیج کی طرف بڑھنے

لگے تو انہیں دھکے دے دے کر دور پھینکا گیا اور وہ مضروب بھی ہوئے۔ مولانا کی تذلیل اور انہیں جسمانی تکلیف پہنچانے کے اس کارِ ثواب میں مولانا ہی کا ایک احسان مند شمیم احمد شمیم پیش پیش تھا جس کے لئے مولانا نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود پارلیمانی انتخاب میں اس کی کامیابی کے لئے رات دن ایک کر کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ ایک شمیم نواز مہم چلائی تھی اور یہ وہی مولانا تھے جنہوں نے 1977ء میں جنتا پارٹی کی آغوش سب کے پہلے اسی شمیم کے لیے وا کی اور اسے شوپیان کے حلقے سے اسمبلی کا انتخاب لڑنے کے لئے نامزد کیا۔

حیرت ہے کہ پورے ساٹھ سال تک مولانا کو اپنا رہبر فکر اور مفکرِ کشمیر بنا کر رکھنے کے بعد عبداللہ کو دم زدن میں اس بوڑھے سیاست دان میں بھارتی سرکار کا ایجنٹ دکھائی دینے لگا:

تفو برتو اے چرخِ گردوں تفو

1977ء میں جب مرکز میں جنتا پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو مولانا نے شیخ عبداللہ کے خلاف ایک ہاری جانے والی جنگ کا بگل بجا دیا اور انہوں نے کشمیر میں بھی جنتا پارٹی کی بنیاد ڈالی۔

مولانا نے پارٹی کی قیادت سنبھالتے ہی مجھے بھی بُلا وا بھیجا اور اصرار کرنے لگے کہ میں بھی اس تنظیم میں شامل ہو کر انتخاب لڑوں اور سرگرم سیاست کے میدان میں اُتروں۔ چونکہ سیاست سے مجھے اب گِھن سی آرہی تھی اور یہ سلسلہ مجھے ایک گندے جوہڑ کی طرح نظر آرہا تھا جس میں اگر ایک کنکر بھی پھینکا جائے تو وہاں سے اڑتے ہوئے چھینٹے ہر لباس کو گندہ کر دیں گے۔

میں نے مولانا سے معذرت کرتے ہوئے کہا ''قبلہ میں تو کسی سیاسی

جماعت کا رکن بننا نہیں چاہتا ہوں البتہ اگر آپ کا حکم ہو تو میں پارٹی کے دفتر میں بالواسطہ آپ کے لیے کوئی قلمی کام کر سکتا ہوں اور ایسا کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو گی''

''آپ سیاست میں نظریئے کے حامی ہیں یا مخالف ؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ ''میں غیر جانب دار ہی رہنا چاہتا ہوں''

یہ سُن کر مولانا کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے یہ لطیفہ سنا کر میری خبر لی۔ کہنے لگے کہ ''ایک بار ایک افغان سیاست دان نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ تم کس طرح کی سیاست سے وابستہ ہو'' اُس دوست نے جواب دیا ''میں کسی بھی سیاسی تنظیم کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں کیونکہ میں ہمیشہ غیر جانبدار ہی رہنا چاہتا ہوں''

''اچھا۔ غیر جانب دار؟'' افغان نے کہا اور اس جملے کو یوں مکمل کر لیا۔

''غیر جانب دار را درزبانِ مامخنث مے گویند''

یہ طنزیہ تیر مجھ پر چلانے کے باجود مولانا مجھے جنتا پارٹی میں شامل ہونے پر آمادہ نہ کر سکے البتہ انہوں نے مجھے جنتا دفتر میں کام کرنے کی پیش کش کی جس میں جماعت کے پریس نوٹ وغیرہ تیار کرنا شامل تھا اور اس کام کے عوض انہوں نے میرے لئے پونے چار سو روپے کا مشاہرہ مقرر کر لیا۔

جنتا کی لہریں اپنے ہی پانیوں میں غرقاب ہونے کے بعد یہ کام بھی مجھ سے چھوٹ گیا اور بقول کسے جب جھیل خشک ہو جاتی ہے تو مچھلیاں کھانے والے پرندے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔

1977ء کے انتخابات میں جنتا پارٹی ریاست میں ایک ذلت آمیز شکست سے دو چار ہوئی اور اس کے دو یا تین امیدوار ہی میدانِ کارزار سے کامران ہو کے لوٹے۔ طُرّہ یہ کہ انتخابی میدان میں بیساکھیوں کے

سہارے کو دکران جنتائی جانبازوں نے نتائج کا انتظار کیے بغیر ریاست کا وزیر اعلیٰ بننے کا اپنا اپنا حق سرِ عام جتلانا شروع کیا تھا۔ ان دعویداروں میں محی الدین قرّہ، عبدالغنی لون، مولوی افتخار انصاری اور شمیم احمد شمیم بھی شامل تھے۔ مولانا نے کسی بھی طرح مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ بعد میں ان بھیڑوں کے گلے کا کیا انجام ہوا جنہیں مرار جی ڈیسائی، چندر شیکھر اور چرن سنگھ نے شیخ عبداللہ نامی ایک گرجتے شیر کے جنگل میں بے دست و پا چھوڑ دیا تھا، وہ سب پر ظاہر ہے۔

انتخابی عمل کے دوران شیخ عبداللہ تو بظاہر سخت بیمار ہوئے تھے حتیٰ کہ ان کے عقیدت مندوں کے بقول انہیں برف کی سلوں پر رکھا گیا تھا اور ان کے پیروکاروں نے بیس ہزار بھیڑوں کو ان کی صحت یابی کے لئے ذبح کیا تھا لیکن جب وہ بسترِ علالت سے اٹھے تو اس طرح گھن گرج کے ساتھ اُٹھے کہ جنتا پارٹی کے اہلِ کار سیلابی پانی سے بھاگنے والے چوہوں کی طرح اپنے اپنے بلوں میں گھسنے کی کوشش کرتے نظر آئے۔

شیخ سرکار نے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ مولانا آزاد روڈ پر واقع جنتا پارٹی کے صدر دفتر فاریسٹ لاج پر تالہ چڑھایا گیا اور شکست خوردہ جنتائی ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرح دُم دبا کر بھاگ گئے۔

مولانا مسعودی کی کُل متاع ایک چادر اور تھوڑا سا بستر کا سامان تھا جسے اُن کے عمر بھر کے معتمد غلام محی الدین صوفی نے لپیٹ کر اور خود بس میں سوار ہو کر گاندربل میں مولانا کی رہائش گاہ تک پہنچایا۔ اس کے بعد مولانا نے ایک مسلسل ذہنی عذاب اور جذباتی بے چینی کا جو مختصر سا عرصہ دیکھا وہ تاریخِ کشمیر کا ایک باب بن چکا ہے۔

میری نظروں میں مولانا محمد سعید مسعودی ایک صاحبِ نظر، نابغہ روزگار، استادِ سخن اور بحرالعلوم تھے۔ اگرچہ اسے بدقسمتی ہی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے اپنے سیاسی یا ثقافتی تجربات کو قلم بند نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو آج ہمارے پاس ہم عصر تاریخ کشمیر کے کئی ایسے گوشے منور ہوئے ہوتے جن پر ہمیشہ شک اور یقین کی گرد جمی رہے گی۔ غالباً انہوں نے اپنے قلم کو اس بنا پر حق گوئی سے دور ہی رکھا کہ ان کے سیاسی حلیف یا حریف دونوں اُن کی حقیقت بیانی سے خفا ہو جاتے اور پھر مولانا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

مولانا مسعودی کشمیر کے عظیم فرزند تھے جنہوں نے اپنی پچاسی سالہ زندگی میں ہر گام پر اپنے ضمیر کے تقاضوں کا ساتھ دیا اور آخر دم وہ برابر اپنے ان عقائد اور محسوسات کا تحفظ کرتے رہے جن پر انہیں یقین محکم تھا۔

دراصل کشمیریوں نے مولانا کی قدر نہیں کی۔ کئی تنگ نظر انہیں ''سوت گجرُ''، یعنی ستّو کھانے والا غیر کشمیری گوجر سمجھتے رہے حالانکہ وہ مسکرا کر خود ہی کشمیری ہی میں کہتے تھے ''میرے مہربان جب مجھے سوت گجرُ کہتے ہیں تو مجھے اس لئے خوشی ہوتی ہے کہ وہ مجھے اپنے ہی قبیل کا ایک فرد تو سمجھ لیتے ہیں''

مزید برآں یہ کہ جب شیخ عبداللہ نے اُن پر الزامات کی بوچھار کر دی اور اپنی صفوں سے دھتکار کر کے باہر کر دیا۔ تو شیخ نواز لوگوں نے بھی مولانا سے بددل ہو کر انہیں فراموش کر دیا۔

اس کے برعکس جموں کی طرف سے مولانا کی بھرپور پذیرائی ہوئی۔ 1989ء میں لالہ ملک راج صراف ٹرسٹ کی طرف سے انہیں اعزاز سے نوازا گیا۔ مولانا کے نام توصیفی سند میں کہا گیا تھا کہ ''مولانا مسعودی ایک

سرکردہ مجاہد آزادی ہیں جنہوں نے پارلیمانی رکن کی حیثیت میں بھی ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ ایک ممتاز صحافی بھی ہیں جو کشمیر کی تحریک میں اس کے اوائل سے ہی اہلِ کشمیر کے شعور کی آبیاری کرتے رہے ہیں'' اُس سال یہ اعزاز پانے والی دیگر شخصیات میں مرزا عارف بیگ، محمد سعید ملک، اوا ین کول صحافی، غلام نبی خیالؔ اور معراج الدین فوٹو گرافر شامل تھے۔

بالآخر صرف ایک سال بعد کشمیر کا یہ ممتاز دانشور، پختہ ذہن اور دور رس سیاست دان، تجربہ کار صحافی اور بے لاگ اور سیدھا سادھا فرزندِ کشمیر اس وقت بندوق بردار قاتلوں کی گولیوں کا شکار ہوا جب وہ بذات خود قریب المرگ تھے۔ مولانا کوان کے ہمسایوں، عقیدت مندوں اور محبوں نے گاندربل ہی میں اُن کے قبرستان میں دفن کیا اور آج اُن کی خستہ حال قبر اس یکتائے زمانہ شخصیت کی کہانی بزبان حالِ کہہ رہی ہے:

برمزارِ ماغر بیاں نے چراغے نے گلے
نَے پرِ پروانہ سوزدنَے صدائے بلبلے



علّامہ اقبالؔ کا سفرِ کشمیر

علّامہ اقبال خاکِ کشمیر سے اُٹھے تھے اور زندگی کے اُس مرحلے پر جب وہ جوانی کے جوبن پر تھے، انہیں کشمیر کا دورہ کرنے کی خواہش بار بار ستاتی رہی۔ یہ چاہت اس طرح اُن کے دل میں کروٹیں لینے لگی کہ کم وبیش ہر اُس مراسلے میں جو انہوں نے اپنے احباب کو کشمیر کے حوالے سے لکھے وہ اس بات کا بار بار ذکر چھیڑتے کہ وہ کشمیر جاتا چاہتے ہیں۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں اقبالؔ جیسے عمر بھر کے عاشق محمدی کے دل میں زیارت مکہ و مدینہ کا شوق بھی تازہ دم ہوگیا لیکن علالت نے چونکہ انہیں بستر استراحت کے ساتھ ملحق کر رکھا تھا لہٰذا زیارت خانہ کعبہ اور روضہ رسول کی تمنا کو انہوں نے اپنے تصورات ہی کی دنیا میں پورا کرلیا۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل حضورِ حق اور حضور رسالت کے عنوان سے ان کا وہ کلام اسی ذہنی اور فکری اپج کا عکاس ہے جس کی تکمیل میں اقبالؔ نے اپنے دل و دماغ کے سارے دریچے کھول کر ان میں عظمت رسول کی خوشبوؤں کو بسایا ہے:

به این پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرودِ عاشقانہ
چوں آں طائر کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ



بہ منزل کوش مانند مہہ نو
دریں نیلے فضا ہر دم فزوں شو
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو



شرم از اظہار می آید مرا
شفقت تو جرات افزاید مرا
مست شان رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم درحجاز

ان آخری دنوں میں پھر کشمیر آنے کا اُن کا ارمان بھی پورا نہ ہوسکا، نہ ہی زیارت حرمین اُن کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔

اقبالؔ جب اڑتیس سال کے ہوئے تو انہیں کشمیر آنے کی خواہش ہوئی جو اُن کا وطن مالوف تھا۔ چنانچہ لاہور سے 5 مئی 1915ء کو مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کے نام ایک خط میں لکھا ''یہاں کرّہ نار کے اندر بیٹھے ہیں۔ اس موسم میں خدالاہور کی تپش سے بچائے۔ امسال کشمیر کا قصد ہے'' (1)

اسی سال 16 جولائی کو اسی مہاراجہ کے نام ایک اور مراسلے میں اس خواہش کی تجدید کی ''گرمی کے موسم میں کشمیر کی ہوا اور آپ کے ہمرکاب ہوں تو اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہوسکتی ہے۔ خدا نے چاہا تو کبھی یہ موقعہ بھی آئے گا'' (2) بالآخر یہ مراد جون 1921ء میں بر آئی جب وہ اپنے ایک خاص دوست اور جموں و کشمیر ریزیڈنسی کے میر منشی خان صاحب منشی سراج الدین کی درخواست پر ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں سری نگر آئے۔

شیخ محمد بخش اور شیخ کریم بخش کشمیر کے نامور رئیس تھے۔ لیکن بعد میں ان

کی حالت دگر گوں ہوگئی۔ اوران پر مقدمہ دائر ہوا۔ پنجاب نیشنل بنک سری نگر نے ان کے خلاف عدالت سے فیصلہ صادر کرواتے ہوئے ان کی ہزاروں کی جائیداد کو نیلام کروادیا۔

منشی سراج الدین شیخ محمد بخش کے داماد تھے اور منشی صاحب ہی کی التجا پر اقبالؔ اس مقدمہ کے سلسلے میں پہلی بار کشمیر آئے۔

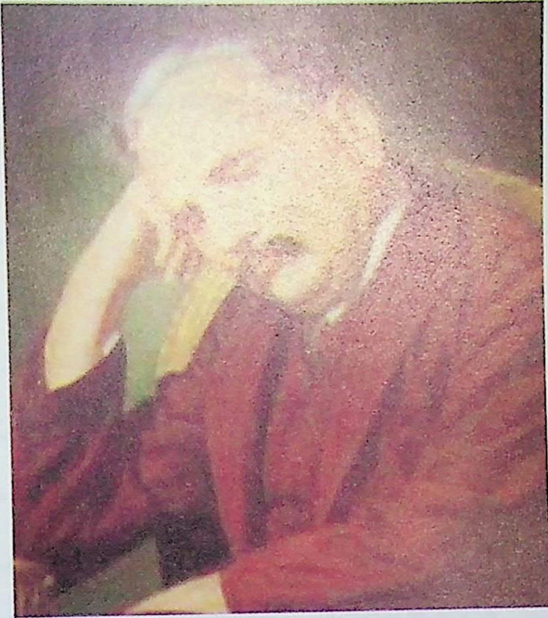
جون 1921ء کے بعد آپ اگست کے مہینہ میں بھی کشمیر آئے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ہی کو 11 اکتوبر 1921ء کو لکھتے ہیں ''امسال اگست میں ایک مقدمہ کے لئے کشمیر جانے کا اتفاق ہوا'' (3)

اس سے قبل جون میں وارد کشمیر ہونے کی ایک اور مراسلے میں خود تصدیق کرلی ہے جو 12 جولائی 1921ء کو مولانا غلام قادر گرامی کے نام لکھا ''میں کشمیر سے بیمار واپس لوٹا، ٹانگ میں درد ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دقت ہے'' (4)۔

اگست 1921ء میں اقبالؔ ایک کشمیری باشندہ رحمان راہ کے مقدمہ کی پیروی کی خاطر دوسری بار کشمیر آئے جو قتل کے الزام میں ملوث تھا۔ اقبالؔ کے دونوں موکلوں یعنی شیخ محمد بخش اور رحمان راہ کو سزائیں ہوئیں اس طرح سے اگرچہ ان کا یہ ''قانونی'' دورہ ناکام ہی رہا مگر ان کے عقیدت مند چشم براہ ہوکر ان کی میزبانی کا فخر حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے تگ و دو کرتے رہے۔ اقبالؔ کے اس قیام کشمیر کو مرزا کمال الدین شیدا، خواجہ عبدالصمد ککرو، غلام محی الدین قرہ اور غلام نبی وانی سوگامی کے دولت کدوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے دو ہفتوں کے قیام کے دوران ان سبھی حضرات کی مہمان نوازی کا لطف لیا ہو۔

محی الدین قرہ کے بقول اقبال ان کے عم بزرگوار اور غلام محمد صادق کے



والد خواجہ عبدالغفار فارغ کے مہمان بن کر ان کے گھر واقع بٹہ مالو سری نگر میں مقیم رہے کیونکہ ان کے فارغ صاحب کے ساتھ جو خود بھی ایک فاضل اور شاعر تھے دوستانہ مراسم تھے'' (5)

لیکن جاوید اقبال کہتے ہیں کہ '' آپ تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں ٹھہرے اور ہاؤس بوٹ میں قیام کیا'' (6)

اس سلسلے میں جموں وکشمیر کے ایک ڈراما نویس محمد عمر نے اقبال کی ڈل جھیل کی سیر کا شاعرانہ حال یوں بیان کیا ہے (7):

'' اگست 1921ء کا وہ تاریخی مہینہ ہے جب حضرت اقبال آخری بار اپنے وطن مالوف کشمیر میں تشریف لائے اور اس سرزمین کا درد بھرے دل سے مطالعہ کیا۔ جس کے تاثرات ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس کے پہلو میں آپ نے فضائے کشمیر کے متعلق جہانگیر کے زاویہ نگاہ کو نظر انداز نہ کیا۔ ان کے مشاہدہ کا حاصل یہ تھا کہ مناظر فطرت کی فراوانی اور آب وہوا کی شادابی

کی رو سے جس نے کہا خوب کہا کہ زمین پر اگر فردوس ہے تو یہی خطہ کشمیر ہے۔

ان ناقابل فراموش دنوں میں ایک دن جناب مولوی احمد دین مرحوم وکیل لاہور، منشی نورالٰہی مرحوم (میرے ازلی شریک کار) اور خاکسار نے بڑی جدوجہد کے بعد حضرت والا کو جھیل ڈل کی سیر پر مجبور کیا۔ جنہیں آنحضرت کا شرف قرب حاصل ہے ان پر مخفی نہیں کہ آپ کو کسی جگہ تشریف ارزانی فرمانے پر آمادہ کرنا کس قدر مشکل مہم تھی۔ موٹر کے ذریعہ نشاط باغ جا کر ڈل کی بہار دیکھنا آپ نے مصنوعی (خلاف فطرت) قرار دیا مگر ہم تینوں آنحضرت کے ساتھ شکارے میں بیٹھ کر ڈل کی طرف روانہ ہوئے۔ شالیمار، نسیم اور نشاط باغ کو پسند کیا اور زہد شکن کا خطاب عطا کیا۔

کیا جامع توصیف ہے۔ واپس ہوئے تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ آفتاب آخری منزل پر پہنچ رہا تھا۔ شفق پھول برسا رہی تھی اور یہ منظر سالم کا سالم ڈل کے شفاف پانی میں تیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک صحیفہ قدرت کے اس سنہری ورق کا خاموشی سے مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحر فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو در شہوار نکال لائے۔ جناب کا ارادہ انہیں ایک نظم میں منسلک کرنے کا تھا۔ مگر طبیعت کا رجحان کسی اور طرف ہو گیا اور یہ دو اشعار میرے پاس پڑے رہے:

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام
دہد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید ز تن تا غبار سفر
زند غوطہ در آب ڈل آفتاب (8)

جگن ناتھ آزاد کے بقول اقبال کے دل میں کشمیر آنے کی جو خواہش تھی

وہ انہوں نے محمد دین فوق کے نام ایک خط میں 8 جون 1917ء کو ظاہر کی اور ان کی یہ خواہش چار برس بعد پوری ہوئی۔(9) یہ غلط ہے۔ دراصل اقبال 1915ء ہی میں اس خواہش کا اظہار کر چکے تھے جس کا ثبوت ان کے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کردہ 5 مئی اور 5 جولائی کے مراسلوں سے ملتا ہے۔ اس طرح سے اپنے وطن عزیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا ان کا خواب چار برس نہیں بلکہ پورے چھ سال بعد شرمندہ تعبیر ہوا۔

جگن ناتھ آزاد اقبال کے دوبار کشمیر آنے کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ انہوں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ "قراین وشواہد اور دستیاب شدہ تحریریں اس امر کی تصدیق نہیں کرتیں کہ اقبال جون 1921ء سے پہلے یا بعد میں کشمیر تشریف لائے ہوں" (10) حالانکہ آزاد نے اپنے مضمون "اقبال کا سفر کشمیر" میں کشمیر میں اقبال کے ایک ہم سفر اور مصاحب محمد عمر (نور الہی) کے جس چشم دید بیان کا ذکر کیا ہے اس میں محمد عمر واضح طور پر کہتے ہیں کہ "جب حضرت اقبال اگست 1921ء میں "آخری" بار اپنے وطن مالوف کشمیر میں تشریف لائے" اگر اقبال کا کشمیر کا سفر ایک ہی بار تمام ہوا ہوتو محمد عمر "آخری" بار نہیں لکھتے۔

اقبال کم از کم دوبار کشمیر آئے اس کی تصدیق بجائے خود اُن ہی کے اُن دو مراسلوں سے ہوتی ہے جو انہوں نے وادی سے واپسی کے بعد بالترتیب مولانا گرامی اور مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھے۔ مولانا کو 12 جولائی 1921ء کو لکھتے ہیں "میں کشمیر سے بیمار واپس لوٹا" اور مہاراجہ کو 11 اکتوبر کو اسی سال ایک خط میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "امسال اگست میں ایک مقدمہ کے لئے کشمیر جانے کا اتفاق ہوا" (11) تحقیقات کی دنیا میں اپنی سطحی کوشش کے نتیجہ میں آزاد یہ بات بھی واضح تاریخوں کی روشنی میں ذہن نشین کرنے میں ناکام رہے۔

1931ء میں جب انقلاب کشمیر کا نیا باب کشمیریوں کے خون سے رقم ہوا تو اقبال پھر ایک بار کشمیر جانے کے لیے بے چین نظر آنے لگے لیکن چونکہ وہ کشمیر کمیٹی سے وابستہ تھے اور اہل کشمیر کی صعوبتوں اور غلامی کے خلاف آواز اٹھانے میں انہوں نے انتھک محنت سے سارے کشمیر کو پنجاب بھر میں ایک قابل توجہ مسئلہ کی صورت میں اجاگر کیا تھا لہٰذا مہاراجہ ہری سنگھ نے ان پر کشمیر میں وارد ہونے پر پابندی عائد کر دی۔

1932ء کے بعد خاص طور پر کشمیر کے حالات سیاسی سطح پر روز بروز بگڑتے گئے اور عوام الناس ڈوگرہ شاہی کے شخصی راج کی انسان کش پالیسیوں کے خلاف صف بستہ ہونے لگے۔ مسلمانان کشمیر کی غیر سیاسی شکایات کے ازالہ کی خاطر حکومت کشمیر نے گلانسی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا تھا مگر خود سرکار نے 1933ء تک اس کی سفارشات پر کوئی عمل نہیں کیا۔ اسی دوران وادی اور وادی سے باہر کئی کشمیری سیاسی رہنماؤں کو گرفتار بھی کیا گیا جس کے ردعمل میں سارے کشمیر میں احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

جون 1933ء میں اقبال از سرنو آل انڈیا مسلم کشمیر کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ اپنے ایک اور ساتھی ملک برکت علی کے ساتھ ایجی ٹیشن میں ایک نئی روح ڈالنے کی خاطر پھر کشمیر آنا چاہتے تھے لیکن حکومت کشمیر نے حکومت پنجاب سے درخواست کی کہ وہ اقبال یا کشمیر کمیٹی کے دیگر ممبروں کو کشمیر آنے سے باز رکھے۔ اس پر پنجاب سرکار کے ایک افسر سی گاربیٹ نے اقبال کی خدمت میں 11 جولائی کو یہ خط لکھا۔

''مائی ڈیئر سر محمد۔ گورنران کونسل کو پوری طرح علم نہیں ہے کہ آیا اب آپ آل انڈیا کشمیر کانفرنس کے صدر ہیں اور ان کو یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ بہر صورت کشمیر جانے کا قصد کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں ہز ہائی

نیس مہاراجہ کشمیر کی حکومت کا مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں حکومت پنجاب سے درخواست کی گئی ہے کہ آپ کو بحیثیت صدر کانفرنس مطلع کر دیں کہ حکومت کشمیر کی خواہش ہے کہ اس وقت تک کانفرنس کا کوئی رکن ہز ہائی نیس کی حکومت کی اجازت کے بغیر کشمیر نہ جائے نیز یہ کہ اگر کانفرنس یا اس کے ممبران نے مقامی مسلمانوں کی جانب سے معاملات میں دخل اندازی کرنے یا گفت وشنید کرنے کی کوشش کی تو وہاں کے حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے جو خوش قسمتی سے فی الحال قابو میں ہیں:

آپ کا مخلص

سی سی گاربیٹ

پنجاب سول سکریٹریٹ، شملہ۔

لاہور میں ان دونوں آل انڈیا کشمیر کمیٹی ٹمپل روڈ پر واقع تھی وہاں سے اقبالؔ نے 13 جولائی 1933ء کو جواباً یہ مراسلہ تحریر کیا ''آپ کے نیم سرکاری خط کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ ذاتی ذرائع سے حاصل کردہ معلومات نیز پنجاب پریس میں شائع شدہ خبروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں حالات ہرگز اطمینان بخش نہیں ہیں۔ ہجرت کی تحریک پہلے سے چل رہی ہے اور سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ کافی وحشت ناک صورت حال ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ بقیہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نقص امن کا باعث ہو۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ گورنر صاحب کو یہ یقین دہانی کرا دیں کہ کشمیر کمیٹی کو محض یہ تردد ہے کہ کسی طرح کشمیر میں حالات معمول پر رہیں۔ اس وقت نہ میں اور نہ ہی کمیٹی کا کوئی رکن کشمیر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ بہر کیف اگر حالات اس حد تک خراب ہوئے جن سے کشمیر کے باہر رہنے

والے مسلمانوں میں نقص امن ہو جائے تو میں پیش بینی نہیں کرسکتا کہ کشمیر کمیٹی کیا اقدام کرے گی۔ دریں اثناء کمیٹی امید کرتی ہے کہ مسلمانوں کی جائز شکایتوں کے فوری تدارک کی ضرورت کو گورنمنٹ براہ کرم کشمیر گورنمنٹ کے ذہن نشین کرائے''۔(14)

اس کے بعد کشمیر سرکار نے 1937ء کے اخیر پر اقبال کو کشمیر آنے کی اگرچہ بھی اجازت دے ہی دی لیکن اس وقت موسم سرما کا ورود ہو چکا تھا اور وہ جاڑے میں کشمیر جیسی پہاڑی جگہ پر اپنی بگڑی ہوئی صحت کو مزید زک پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن کشمیر کو پھر ایک بار دیکھنے کی تڑپ ان کے دل میں برابر اس وقت تک موجود رہی جب اپریل 1938ء میں انہوں نے انتقال کیا۔



حوالہ جات

(1) کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، 1989ء، جلد اول، صفحہ 372

(2) ایضاً جلد اوّل، صفحہ 389

(3) ایضاً جلد دوم، صفحہ 281

(4) ایضاً، جلد دوم، صفحہ 261

(5) اکادمی، کلچرل اکادمی سری نگر، 5 ستمبر 1976

(6) زندہ رود، جاوید اقبال، صفحہ 424

(7) محمد عمر جموں و کشمیر کے ایک ڈراما نویس تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ نور الٰہی کا اضافہ کرتے تھے۔ جو اُن کے ایک جگری دوست کا نام تھا۔ محمد عمر جموں میں اسسٹنٹ کمشنر تھے اور نور الٰہی ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ یک جان و دو قالب کی مثال تھے اور اسی لیے ہمیشہ محمد عمر نور

الٰہی کے مقبول نام سے جانے جاتے تھے۔

(8) رسالہ ہزار داستان لاہور، اکتوبر 1922

(9) اقبال کا سفر کشمیر، ماہنامہ آجکل نئی دہلی، اگست 1976

(10) ایضاً

(11) کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، صفحہ 281-261

(12) گاربیٹ (1972-1881)۔ 1929 میں پنجاب سرکار کا چیف سکریٹری مقرر رہوا۔

(13) کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم، صفحہ 1048

(14) ایضاً صفحہ۔ 364



اُردو اور جنوب ایشیائی ہم آہنگی

جنوبی ایشیا کی یک جہتی اور اتحاد میں اردو کا حصہ بیش بہا رہا ہے اردو اور اس کی دین کو بہت حد تک اگرچہ ہندوستان اور پاکستان تک ہی محدود رکھا جا سکتا ہے لیکن پڑوسی ممالک جیسے بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا، افغانستان کے علاوہ جنوب مشرق کی ریاستوں میمنار، ملائشیا، انڈونیشیا اور فلپائن کے کئی علاقوں میں بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں ہند یا ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے ہمارے دور کے جنوب مشرقی ایشیا پر محیط تھا۔ آج یہ خطہ کئی ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ جی ڈی گاڈرے کے بقول:

"اس میں ایک جغرافیائی اتحاد، یکساں آب و ہوا، مشترکہ لسانی ساخت اور ایک مشترکہ نسلی اشتراک شامل ہیں۔ اگرچہ اسلام، عیسائیت، بدھ مت، ہندو دھرم، یہودی عقیدہ اور زرتشتی مذہب کے پیش نظر ان تمام عقیدوں کے لیے الگ الگ طریقۂ عبادت مخصوص ہے لیکن یہ سبھی لوگ مذہبی اقدار کا احترام یکساں طور پر کرتے ہیں جو اُن کی نظروں میں مغربی تہذیب کے مبلغوں کے اس نظریہ کی نفی کرتے ہیں کہ دینی عقیدت سے زیادہ اہم مادہ پرستی ہے (1)

گاڈرے کے اس عندیہ سے اگر اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں کہ جنوبی ایشیا میں زندگی ایک ہی محور کے اردگرد گھومتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اردو زبان ہی ہے جس نے کسی اور لسانی، سماجی یا مذہبی رابطہ سے زیادہ خطے کے ثقافتی رشتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ کر رکھا ہے۔

ہند میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ، جو بنیادی طور پر فارسی، عربی یا ئڑکی بولنے والے تھے، بقول محمد عمر:

''یہ ایک فطری امر تھا کہ اس طرح سے ایک ایسی زبان وجود میں آئے جو حکمران اور عوام کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بن کر دونوں کیلئے ایک دوسرے کی بات ذہن نشین کرنے میں ممد اور مددگار ثابت ہو سکے۔ اس زبان کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بھی ترسیل کا ایک نیا وسیلہ پیدا ہوا۔ اس طرح سے ایک ایسی نئی زبان کا وجود عمل میں آیا جسے پہلے پہل ہندوی کہا گیا اور بعد میں اس کی شناخت ریختہ کے طور پر ہوئی اور بالآخر یہ زبان اردو کے نام سے مشہور ہوئی'' (2)

حضرت امیر خسرو نے اُن زبانوں کا تذکرہ کیا ہے جو اس وقت اپنے متعلقہ خطوں میں رائج تھیں جب مسلمانوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ ان زبانوں میں سندھی، لاہوری، کشمیری، ڈوگری، گجراتی، بنگالی، اَودھی، دہلوی اور سنسکرت کا ذکر کیا گیا ہے (3)

سر تیج بہادر کے الفاظ میں:

''اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے اُن کے آباؤ اجداد نے ایک مشترکہ اور مقدس میراث کے طور انہیں

پیش کی ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا‘‘(4)

آٹھویں صدی عیسوی میں جب عرب فاتح ہندوستانی برصغیر میں محمد بن قاسم کی قیادت میں داخل ہوئے تو مقامی اور آس پاس کے علاقوں میں اُن کے میل ملاپ سے ایک ایسی زبان نے جنم لیا جس میں کئی بولیاں اور بڑی زبانیں مثلاً عربی، فارسی اور ترکی شامل تھیں۔ اور یہ زبانیں خطے کے الگ الگ علاقوں میں بولی جانے لگیں۔ ساتھ ہی اردو زبان نے اپنی مقبولیت اور شہرت کی منزل پانے کی غرض سے سالہا سال تک ایک طویل سفر کیا جس کے نتیجے میں اس قبولِ عام نے سارے برِ صغیر میں وہ درجہ اور مرتبہ حاصل کیا جو اس خطے میں بولی جانے والی سینکڑوں زبانوں میں کسی ایک کو آج حاصل نہیں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ہے کہ:

’’صدیوں پر پھیلی ہوئی ہماری مشترکہ تواریخ نے ہماری زندگی کو اپنے سرمایہ سے مالا مال کیا ہے۔ ہماری زبان۔ ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری سماجی زندگی، ہماری عادتیں، ہمارے لباس، ہمارے رواج اور رسوم اور روزمرہ زندگی کے لاتعداد حقائق میں مشکل سے ایسے پہلو ہوں گے جو ہماری اس حیات مشترکہ سے اثر پذیر نہ ہوئے ہوں۔ یہ سب کچھ ہماری متحد قومیت کا بیش بہا خزانہ ہے اور ہم اسے اس زبان میں واپس لوٹنے کی غرض سے دھتکار نہیں سکتے جبکہ اس نوع کی ایک منفرد زندگی کا وجود باقی نہیں تھا(5)

مولانا آزاد کے بیان کردہ اس ’’سرمایۂ خیال‘‘ کی آبیاری اردو کے وہ علمائے دانش و بینش مسلسل طور پر کرتے رہے جن میں محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خان، سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، حکیم اجمل

خان، مولانا حسرت موہانی، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، محمد علی جوہر، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پھر امیر خسرو سے لے کر منشی پریم چند تک کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ جنوب ایشیائی تمدن کو لاکھوں اردو دانوں کے تخیل فکر اور طرزِ معاشرت کی دولت نے متمول بنا دیا اور اردو نے اس خطے میں لوگوں کو فکری طور پر ایک دوسرے کے قریب لانے میں جو حصہ ادا کیا وہ دوسری کوئی بولی یا زبان نہیں کر سکی۔

ڈاکٹر تارا چند نے ادب کی روح کا اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ ''ادب زندگی کا آئینہ ہے جو معاشرے کے تبدیل ہونے والے پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح ادب بھی خواہشات، جذبات، امید، خوف اور انسانی تصور کی روشنیوں اور تاریکیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

تاہم ادب دیگر فنون سے مختلف ہے کیونکہ اس میں حسنِ تخلیق کی صلاحیت ہے۔ اگرچہ اسے بدتر، غیر موافق اور مخالف صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے'' (6)

جنوبی ایشیا میں اُردو ادب نے انسانی ذہن کی خاصیت اور ابدی حسن کو فروغ دینے میں اپنی قوّت اور اثر انگیزی کا بھرپور مظاہرہ کیا جو ذہن انسانیت کے اُن اقدار سے سرشار ہیں جو ایک متمول ثقافتی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اردو زبان میں وقتاً فوقتاً زندگی اور کائنات کے اُن گوشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جن کا تعلق انسانی زندگی، دیگر حیاتیات، تہذیب وثقافت، ماحولیات، رسوم ورواج اور معاشرتی نظام کے رنگا رنگ پہلوؤں کے ساتھ ہے۔ ان گوشوں کے منوّر ہونے سے ہندوستان اور پاکستان ایک منفرد ثقافتی تصویر پیش کرتے رہے ہیں۔ ان میں روایتی تیوہار، شادیاں اور میلے، مذہبی عقائد اور رسوم، چھٹّیوں کے دن، موسموں کے دیدہ زیب رنگ، قدرتی

نظاروں کا سر تا پا حسن، جنگلی حیاتیات کی مختلف اصناف، ماحولیاتی تنوع، آثار قدیمہ کے مقامات وغیرہ شامل ہیں جن کی عکاسی برِصغیر میں اردو ہی کی رفاقت سے ایک شاندار اور جاندار طریقے سے کی گئی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندو پاک نے فکر وعمل کے اس اشتراک اور یگانگت کے باوجود اپنی مخصوص زندگی کے روایتی پہلوؤں کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔

ہندوستانی فلمستان اور پاکستانی ٹیلی ویژن کے ڈراموں، غزلوں، نعتوں، قوالیوں اور لوک گیتوں کے صدا بند کیسیٹ کثرت کے ساتھ بازار میں آنے کی بدولت جنوب ایشیائی ثقافتی دنیا کو بھی اس خطے میں یک سوئی اور ہم خیالی کا ورثہ مسلسل طور پر ملتا رہا ہے۔ ہندوستان میں تیار ہونے والی فلمیں، جو دراصل اردو زبان میں بنائی جاتی ہیں لیکن بدقسمتی سے اُن پر ہندی کی مہر لگ جاتی ہے، عوام کے دلوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی ایک اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔ اس سب سے زیادہ طاقت ور ذریعۂ ترسیل نے برِصغیر کے عوام کے دلوں کو نہ صرف بار بار ایک ہی زیر و بم کے ساتھ دھڑکنا سکھایا ہے بلکہ ہمسائیگی میں موجود کئی ریاستوں کو بھی اس کا فیض حاصل ہوتا رہا ہے۔

البتہ یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہندوستان کے چند انتہا پسند اور بنیاد پرست ہندوؤں نے غلط طریقے سے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اسے ملک کی قومی زبان بننے کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دیں جن کی بعید از حقیقت ضد کی وجہ سے بالآخر ایک ایسی زبان یعنی ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا گیا جس سے ملک کا ایک بہت بڑا حصہ خاص کر جنوبی اور شمال مشرقی بھارت اور کشمیر سرے سے ہی ناآشنا تھے۔ گاڈرے نے اس پس منظر میں اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ:

"اردو ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی مادری زبان نہیں تھی

مدراس میں وہ تامل، کیرالا میں ملیالم، بمبئی میں مراٹھی، احمد آباد میں گجراتی، ڈھاکہ اور کلکتہ میں بنگالی، لاہور اور امرتسر میں پنجابی۔ کراچی میں سندھی، سری نگر میں کشمیری اور پشاور میں پشتو زبانیں بولتے تھے۔ اردو ایک مخلوط زبان تھی لیکن اتر پردیش کے ہندی متعصبوں نے تقسیم ہند کے بعد اپنی بالادستی قائم کرلی اور ہندوستانی کے برعکس ہندی کو آئین ہند کے ذریعہ قومی زبان بنایا گیا حالانکہ مہاتما گاندھی نے بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس کے بعد ہندی زیادہ سے زیادہ سنسکرت آمیز اور ایک عام آدمی کے فہم سے دور ہی رہی۔ اردو ایک کھڑی بولی تھی جسے عام طور پر عوام کی زبان کہا جاسکتا ہے۔ یہ سنسکرت برہمن یا فارسی دانشوروں کی زبان نہیں تھی۔ اس طرح یہ زبان سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل کرلیتی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ تامل لوگ سنسکرت آمیز ہندی کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ وہ خوشی کے ساتھ سادہ اردو کو اپناتے اگر انہیں یہ زبان تامل رسم الخط میں لکھنے کی اجازت ملتی۔ اردو اب ہندوستان میں ایک طرح سے تھرتھرا رہی ہے کیونکہ اسے ہندو اور مسلمانوں دونوں نے بہت حد تک الگ تھلگ کرکے رکھا ہے جبکہ یہ پہلے ہندو مسلم یک جہتی کے نتیجے میں پھل پھول رہی تھی‘‘(7)

ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے دوران اردو کو برطانوی نوآبادکاروں کے ہاتھوں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ایک آزاد ہندوستان میں بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا گیا گویا یہ کسی خاص فرقے کا ورثہ

تھی جو اسے قومی سطح پر فروغ دینا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی تصنیف ''صحافت: پاکستان و ہند میں'' لکھتے ہیں:

''1857ء میں ایک ناکام بغاوت کے بعد برطانوی حکمران اپنی حدود کو پار کر کے ہند میں اردو صحافت کا گلا گھونٹنے کے لئے آہنی ہاتھوں سے کام لینے لگے اور اس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہ تحریک کی آگ کو ہوا دے رہی ہے۔ مسلمانوں کو اردو اخبارات سے اُن کے کلیدی عہدوں سے الگ کرنے کے ساتھ کئی اور اخبار منظرِ عام پر آ گئے لیکن اُن میں سے صرف ایک کا مدیر ایک مسلمان کو بنایا گیا'' (8)

آج کل اردو کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے تاریک مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہندوستانی دانشور سلمان خورشید کی یہ رائے ہے کہ اردو ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپناتے اور بولتے رہے لیکن تقسیم کے بعد اور وقت گذرنے کے ساتھ اور انتظامیہ کی غلط پالیسیوں کے نتیجے میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا تنزّل احساسات سے عاری سیاست کی وجہ سے ہوا ہے۔ آزادی کے بعد اردو کو تمام تعلیمی اداروں میں شمالی ہندوستان میں دوسرے درجے پر رکھا گیا اور یہی وہ خطہ ہے جہاں اردو پیدا ہوئی۔ جہاں یہ مالا مال ہوئی اور جہاں اس نے ایک شاندار تاریخ رقم کی''

اردو کو علمی سطح پر بھی جس حالت سے گذرنا پڑ رہا ہے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے خورشید کہتے ہیں۔ ''شمالی ہندوستان کے پرانے تمدن کو اس وقت پہلے ہی ایک دھچکا لگا تھا جب تعلیم یافتہ اہل علم اور اور متوسط طبقے کے مسلمان پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ ہندوستان میں اردو بولنے والے ہم عصر

لوگ عموماً نچلے طبقے کے مسلمان ہیں جو اکثر و بیشتر دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ یہ تعلیم ہم زمان اوصاف پانے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ اسے اپنی ثقافتی میراث کا ایک حصہ تصور کر کے اسے روزگار کا ذریعہ اور مذہب کا جزو سمجھ کر اپناتے ہیں۔

اس بیان میں سلمان خورشید نے اس موضوع پر یوں بحث کی ہے کہ:

''اردو کی درد بھری داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یونیورسٹیوں کے شعبۂ ہائے اردو کا بھی حال کچھ بہتر نہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ عام قسم کے مقابلوں کی پیداوار ہیں۔ ان کی سندات سے قطع نظر اُن میں وقت سے ہم آہنگ صلاحیتوں اور فن کا زبردست فقدان ہے۔ دانش گاہوں میں اردو کے طلباء محض اختیاری مضمون کی صورت میں اردو پڑھتے ہیں۔ یہ عام طور پر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ دوسرے مضامین میں امتحانات میں ناکام ہو کر اردو جیسی سیدھی اور سہل زبان کا سہارا لیتے ہیں۔ اس قبیل کے طالب علم پہلے ماسٹرس کی ڈگری لیتے ہیں اور بعد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مرحلے سے بھی گذرتے ہیں۔ اس طرح سے عامیانہ پن کا یہ ناقص طبقہ اردو زبان کی پاکیزگی اور اعلیٰ ترین شبیہ کو بھی مسخ کر دیتا ہے''۔(9)

علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل شعر میں اپنے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اپنی بے مثال صلاحیتوں اور انسانی برداشت اور انسانی اقدار کی تعظیم کی وجہ سے مر نہ سکی۔ اگرچہ یونان، مصر اور رُوم اپنی شان اور آن کی بلندیوں پر پہنچ تو گئے لیکن اپنی عیاشیوں کی وجہ سے رو بہ زوال ہوئے۔ ان عظیم

ممالک کے عوام اور حکماء بدلتے حالات کے ساتھ شانہ بہ شانہ قدم ملانے میں ناکام رہے۔ وہ اپنے طریقہ کار میں بھی بے رحم بن گئے اور انہوں نے عظیم اقدار، انسانی رشتوں، اور غرباء کے تئیں اظہار ہمدردی کی عادات کو فراموش کردیا:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس لحاظ سے ایسے لاتعداد اردو ادیبوں اور قلم کاروں نے جو الگ الگ عقیدتوں اور رسم ورواج کے پیروکار تھے، ہندوستانی زندگی اور زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں میں موجود شناختی یک جہتی کے نغمے گائے۔ خود اقبال نے بھگوان رام، سوامی رام تیرتھ اور گورونانک پر اپنی اثر انگیز نظموں کے علاوہ نیا شوالہ، ترانۂ ملّی اور ترانۂ ہندی جیسی شعری تخلیقات سے سارے برِ صغیر کے عوام کو ذہنی آسودگی عطا کی۔ اقبال سے پہلے بہادر شاہ ظفر، انشاء اللہ خان انشاء، ابوالحی تاباں، میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی نے اردو کے پس منظر سے وابستہ تیوہاروں ہولی، شاہ عالم ثانی کی دیوالی اور فایز دہلوی اور منشی سری [illegible] اور پھول والوں کی سیر سے اس زبان کو سارے مذہب داروں کے [illegible] موثر ترین ذریعۂ اظہار کا رتبہ بخشا۔

اسی طرح انسانی اخوت اور شفقت کا مظاہرہ اردو ہی کے ذریعہ احمد فراز نے کیا جب اُس نے ان روشن چراغوں کا ذکر کیا جو سارے برصغیر کو امن اور مفاہمت کے نور سے منور کریں:

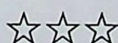
چراغ جن سے محبت کی روشنی پھیلے
چراغ جن سے دلوں کے دیار روشن ہوں

چراغ جن سے ضیاء امن و آشتی کو ملے
چراغ جن سے دلِ بے شمار روشن ہوں

اور علی سردار جعفری نے فرازؔ کی اس خواہش کو لبیک کہتے ہوئے اپنی مفرد انداز کی سخن گوئی کا یہ رنگ پیش کیا:

زمینِ پاک ہمارا جگر کا ٹکڑا ہے
ہمیں عزیز ہے دلی و لکھنؤ کی طرح
تمہارے لہجے میں میری نوا کا لہجہ ہے
تمہارا دل ہے حسیں میری آرزو کی طرح (10)

یہاں پر اس اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی رو سے آج بھی ہمارے دلوں میں اردو کے اُن کشمیری قافلہ سالاروں کے نام ثبت ہیں جن کے بغیر ہندوستان اور پاکستان کے رشتے غالباً خوشگوار اور امید افزا نہیں ہوتے جتنے وہ کئی اختلافات کے باجود خاص کر ثقافتی، تہذیبی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جلوہ افروز ہیں۔ اردو کے ان محسنوں میں اقبال، مولانا انور شاہ کشمیری، سر تیج بہادر سپرو، مومن خاں مومن، مفتی صدر الدین خان آزردہ، برج نراین چکبست، رتن ناتھ سرشار، آغا حشر کشمیری، محمد دین فوق، برج موہن دتاتریہ کیفی، خلیفہ عبدالحکیم، آنند نرائن ملا، قدرت اللہ شہاب، محمود ہاشمی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، کشمیری لال ذاکر، شورش کشمیری، رفیق خاور اور ظہیر کشمیری شامل ہیں۔



حوالہ جات:

(1) دی رول آف اسلام ان ساؤتھ ایشیا۔ جی ڈی گاڈرے۔ الفاتحہ فاؤنڈیشن۔ پونے 1990ء ص 15

(2) ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کا اثر۔ڈاکٹر محمد عمر۔پبلی کیشنز ڈویژن۔ نئی دہلی 1975ء ۔ص 428

(3) ایضاً۔ص 428

(4) ہماری قومی زبان۔انجمن ترقی اردو۔دہلی 1941ء۔ص 30

(5) انوارابوالکلام۔جشنِ بہارِ کشمیر ثقافتی کمیٹی۔سری نگر۔1959ء۔ص 53

(6) ہسٹری آف انڈیاز فریڈم سٹرگل۔ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی۔1980ء۔ ص 272

(7) دی رول آف اسلام۔ص 72-71

(8) صحافت۔پاکستان و ہند میں۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔مکتبۂ کارواں۔ لاہور۔ص۔97

(9) دی نیشن لاہور۔13 میی۔1998ء

(10) شمع میگزین۔نئی دہلی۔اپریل 1998ء

☆☆☆

لوگ عموماً نچلے طبقے کے مسلمان ہیں جو اکثر و بیشتر دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ یہ تعلیم ہم زمان اوصاف پانے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ اسے اپنی ثقافتی میراث کا ایک حصہ تصور کر کے اسے روزگار کا ذریعہ اور مذہب کا جزو سمجھ کر اپناتے ہیں۔

اس بیان میں سلمان خورشید نے اس موضوع پر یوں بحث کی ہے کہ:

> ''اردو کی درد بھری داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یونیورسٹیوں کے شعبۂ ہائے اردو کا بھی حال کچھ بہتر نہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ عام قسم کے مقابلوں کی پیداوار ہیں۔ ان کی سندات سے قطع نظر اُن میں وقت سے ہم آہنگ صلاحیتوں اور فن کا زبردست فقدان ہے۔ دانش گاہوں میں اردو کے طلباء محض اختیاری مضمون کی صورت میں اردو پڑھتے ہیں۔ یہ عام طور پر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ دوسرے مضامین میں امتحانات میں ناکام ہو کر اردو جیسی سیدھی اور سہل زبان کا سہارا لیتے ہیں۔ اس قبیل کے طالب علم پہلے ماسٹرس کی ڈگری لیتے ہیں اور بعد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے مرحلے سے بھی گذرتے ہیں۔ اس طرح سے عامیانہ پن کا یہ ناقص طبقہ اردو زبان کی پاکیزگی اور اعلیٰ ترین شبیہ کو بھی مسخ کر دیتا ہے''۔(9)

علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل شعر میں اپنے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اپنی بے مثال صلاحیتوں اور انسانی برداشت اور انسانی اقدار کی تعظیم کی وجہ سے مر نہ سکی۔ اگرچہ یونان، مصر اور رُوم اپنی شان اور آن کی بلندیوں پر پہنچ تو گئے لیکن اپنی عیاشیوں کی وجہ سے روبہ زوال ہوئے۔ ان عظیم

ممالک کے عوام اور حکماء بدلتے حالات کے ساتھ شانہ بہ شانہ قدم ملانے میں ناکام رہے۔ وہ اپنے طریقہ کار میں بھی بے رحم بن گئے اور انہوں نے عظیم اقدار، انسانی رشتوں، اور غرباء کے تئیں اظہار ہمدردی کی عادات کو فراموش کردیا:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اس لحاظ سے ایسے لاتعداد اردو ادیبوں اور قلم کاروں نے جو الگ الگ عقیدتوں اور رسم و رواج کے پیروکار تھے، ہندوستانی زندگی اور زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں میں موجود شناختی یک جہتی کے نغمے گائے۔ خود اقبال نے بھگوان رام، سوامی رام تیرتھ اور گورونانک پر اپنی اثر انگیز نظموں کے علاوہ نیا شوالہ، ترانۂ ملّی اور ترانۂ ہندی جیسی شعری تخلیقات سے سارے برِّصغیر کے عوام کو ذہنی آسودگی عطا کی۔ اقبال سے پہلے بہادر شاہ ظفر، انشاء اللہ خان انشاء، ابوالحی تاباں، میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی نے اردو کے پس منظر سے وابستہ تیوہاروں ہولی، شاہ عالم ثانی کی دیوالی اور فایز دہلوی اور منشی سری رام کی بسنت اور پھول والوں کی سیر سے اس زبان کو سارے مذہب داروں کے لئے ایک موثر ترین ذریعۂ اظہار کا رتبہ بخشا۔

اسی طرح انسانی اخوت اور شفقت کا مظاہرہ اردو ہی کے ذریعہ احمد فراز نے کیا جب اُس نے ان روشن چراغوں کا ذکر کیا جو سارے برصغیر کو امن اور مفاہمت کے نور سے منور کریں:

چراغ جن سے محبت کی روشنی پھیلے
چراغ جن سے دلوں کے دیار روشن ہوں

چراغ جن سے ضیاء امن و آشتی کو ملے
چراغ جن سے دلِ بے شمار روشن ہوں

اور علی سردار جعفری نے فرازؔ کی اس خواہش کو لبیک کہتے ہوئے اپنی مفرد انداز کی سخن گوئی کا یہ رنگ پیش کیا:

زمینِ پاک ہمارا جگر کا ٹکڑا ہے
ہمیں عزیز ہے دلی و لکھنؤ کی طرح
تمہارے لہجے میں میری نوا کا لہجہ ہے
تمہارا دل ہے حسیں میری آرزو کی طرح (10)

یہاں پر اس اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کی رو سے آج بھی ہمارے دلوں میں اردو کے اُن کشمیری قافلہ سالاروں کے نام ثبت ہیں جن کے بغیر ہندوستان اور پاکستان کے رشتے غالباً خوشگوار اور امید افزا نہیں ہوتے جتنے وہ کئی اختلافات کے باوجود خاص کر ثقافتی، تہذیبی، ادبی اور معاشرتی زندگی میں جلوہ افروز ہیں۔ اردو کے ان محسنوں میں اقبال، مولانا انور شاہ کشمیری، سر تیج بہادر سپرو، مومن خاں مومن، مفتی صدرالدین خان آزردہ، برج نراین چکبست، رتن ناتھ سرشار، آغا حشر کشمیری، محمد دین فوق، برج موہن دتاتریہ کیفی، خلیفہ عبدالحکیم، آنند نرائن ملا، قدرت اللہ شہاب، محمود ہاشمی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، کشمیری لال ذاکر، شورش کشمیری، رفیق خاور اور ظہیر کشمیری شامل ہیں۔



حوالہ جات:

(1) دی رول آف اسلام ان ساؤتھ ایشیا۔ جی ڈی گاڈرے۔ الفاتحہ فاؤنڈیشن۔ پونے 1990ء ص 15

(2) ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کا اثر۔ڈاکٹر محمد عمر۔پبلی کیشنز ڈویژن۔
نئی دہلی 1975ء ۔ص 428

(3) ایضاً۔ص 428

(4) ہماری قومی زبان۔انجمن ترقی اردو۔دہلی 1941ء۔ص 30

(5) انوار ابوالکلام۔جشنِ بہارِ کشمیر ثقافتی کمیٹی۔سری نگر۔1959ء۔ص 53

(6) ہسٹری آف انڈیا ز فریڈم سٹرگل۔ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی۔1980ء۔
ص 272

(7) دی رول آف اسلام۔ص 72-71

(8) صحافت۔پاکستان و ہند میں۔ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔مکتبۂ کارواں۔
لاہور۔ص۔97

(9) دی نیشن لاہور۔13 مئی۔1998ء

(10) شمع میگزین۔نئی دہلی۔اپریل 1998ء

☆☆☆



اختر محی الدین اور غلام نبی خیال

اختر محی الدین: بُلبُلِ ہزار داستان

اختر محی الدین کو میں نے سری نگر میں اُس وقت 1955ء میں پہلی بار دیکھا جب وہ کلچرل کانفرنس کی ہفت روزہ میٹنگ میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔ یہ میٹنگ ہر جمعہ کو کانفرنس کے دفتر پر بعد دوپہر منعقد ہوا کرتی تھی اور کئی بار شام ڈھلنے کے بعد بھی جاری رہتی تھی۔ اس روز ایجنڈا پر اختر کو اپنا کشمیری افسانہ ''دندوزُن'' (گھرلڑائی) میٹنگ میں سنانے کا پروگرام تھا۔

اختر ان میٹنگوں میں برابر شرکت کرتا رہا اور بحث و تمحیص میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا۔ انہی نشستوں میں ادبی تنقید سے متعلق بحثا بحثی سے بہت کچھ سیکھ کر آج ہمارے کئی ادیب اور شاعر شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں جن میں دینا ناتھ نادم، سوم ناتھ زتشی، امام الدین مخمور، پریم ناتھ پریمی، غلام نبی عارض، عبدالمجید سائر، محمد عبداللہ عارج، غلام رسول سنتوش، سوم ناتھ سادھو، اکبر لداخی چمن لال چمن، موہن لال ایمہ، امر چند ولی، نند لال امبار دار ننہ، علی محمد لون، شنکر رینہ، امیش کول، علی محمد طارق، پران کشور، عبدالعزیز ہارون، نور محمد روشن، حبیب کامران، غلام نبی فراق، رحمان راہی، مظفر عازم، موتی لال ساقی، مکھن لال بیکس، ، سروانند کول پریمی، تاج بیگم رینزو، ضیا درانی، ارجن دیو مجبور، پشکر ناتھ، اوتار کشن رہبر، بنسی نردوش، دینا ناتھ ولی المست کشمیری، پیتامبر ناتھ درفانی، فارق بڈگامی، پشکر بھان، دیپک کول، خضر مغربی، ترلوکی



1957 کی ایک یادگار تصویر:

دائیں سے بائیں: غلام نبی خیالؔ، ڈاکٹر راہیؔ معصوم رضا، اکبؔر لداخی اور اخترؔ محی الدین

ناتھ کُندن۔ خضر مغربی، قیصر قلندر، امین کامل اور غلام نبی بابا وغیرہ شامل ہیں۔

اگر چہ اس کاروان کے سارے اہم اراکین کے نام یاد نہیں آتے لیکن یہاں پر اس بات کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے کہ ان محفلوں میں جن اصحاب قلم نے کبھی بھولے سے بھی شرکت نہیں کی اُن میں مرزا کمال الدین شیدا۔ شمس الدین حیرت پاندانی، فطرت گیلانی، شوریدہ کشمیری، شہہ زور کشمیری، فاضل کشمیری، مرزا عارف، احد زرگر، صمد میر، سیفی سوپوری، محی الدین حاجنی۔ تنہا انصاری، ماسٹر زندہ کول۔ غلام رسول نازکی، محی الدین نواز، سری کنٹھ توشخانی اور شمس الدین غمگین کے نام یاد آرہے ہیں۔

جب اس محفل میں تنقید کا ماحول گرم ہوتا تھا تو اختر محی الدین سگریٹ کے کش پر کش لگا کر زور زور سے اور تیوریاں چڑھا کر اپنا نقطۂ نظر منوانے کی جارہانہ کوشش کرتا تھا۔ میں نے اسے کئی پختہ مشق شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے دیکھا ہے اور اگر وہ کسی وقت اپنے غصّے پر قابو نہیں پا سکتا تھا تو اچانک میٹنگ سے اُٹھ کر چلا جاتا۔ اسی اختر محی الدین کا دوسرا روپ یہ تھا کہ وہ کبھی کبھی گھنٹوں تک چلنے والی ان میٹنگوں میں مکمل طور پر خاموش بیٹھا رہتا اور لب سی کر بیچ بیچ میں اپنے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بکھیر لیتا۔

1957ء میں جب اس کے کشمیری افسانوں کے اولین مجموعے ''ست سنگر'' (سات چوٹیاں) پر اسے ساہتیہ اکادمی کا انعام دیا گیا تو وہ بہت خوش ہوا ۔اس کے بعد وہ کئی ماہ تک ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیوں کی تفصیلات بڑھا چڑھا کر پیش کرتا مثلاً یہ کہ ساہتیہ سنسکرت کا اور اکادمی یونانی زبان کا لفظ ہے اور ان دو کلاسیکی زبانوں کے ان دو الفاظ کی ترکیب سے ہی اکادمی کا نام رکھا گیا ہے۔

اس کے کوئی دس سال بعد میں اختر کے اور قریب ہوا جب 1960ء

میں مجھے دو سال تک جیل میں نظر بند رہنے کے بعد رہائی ملتے ہی کلچرل اکادمی میں ملازمت مل گئی۔ مرزا کمال الدین شیدا اُن دنوں اکادمی کے سیکریٹری تھے اور امین کامل اور اختر محی الدین مجھ سے پہلے ہی وہاں ملازم ہو چکے تھے۔ مرزا صاحب نے جب مجھے پہلے ہی دن اپنے کمرے میں بلایا تو انہوں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا ''خیال صاحب! میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اس ادارے میں دو خطرناک کمیونسٹ اختؔر اور کاملؔ بھی کام کرتے ہیں۔ ان سے ذرا دور ہی رہنا ورنہ ان کی صحبت میں تم بھی بگڑ جاؤ گے'' سوال یہ ہے کہ کیا میں جو خود کشمیر کی ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک سرگرم رکن رہ چکا تھا۔ کسی بھی طرح کاملؔ صاحب اور اخترؔ صاحب سے دور رہتا؟

اکادمی کا قیام انہی دنوں عمل میں لایا گیا تھا اور وہاں کام بہت کم تھا۔ لہذا سبھی ملازم دن بھر گپیں ہانک کر گذارتے اور اس میں سب سے زیادہ محفل آرائی اختر محی الدین کے کمرے میں ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بھی اپنے کمرے میں داخل ہوتا تو مجھے آواز دے کر کہتا ''آؤ بیٹھو'' کرنا کیا ہے تمہیں؟ آؤ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں'' اور اس کے بعد وہ ہر واقعہ تمام تر تفصیلات کے ساتھ اسی طرح بیان کرتا جس طرح کشمیر کے روایتی داستان گو شہروں اور دیہاتوں میں گھوم گھوم کر کہانیاں سناتے ہیں۔

اکادمی کا صدر دفتر پہلے پہل پرانے سکریٹریٹ میں واقع تھا اور بعد میں یہ لال منڈی منتقل کیا گیا۔ اختر محی الدین کی محفل آرائی برابر جاری رہی۔ مرزا صاحب کے بعد علی جواد زیدی نے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ پھر صاحبزادہ حسن شاہ آگئے اور اُن کے بعد نور الدین اور پھر پروفیسر جیالال کول نے یہ عہدہ سنبھالا۔

اختر محی الدین کو اس طرح چور دروازے سے ایک کے بعد دوسرے

سیکریٹری کا وارد ہونا قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ سلسلہ اکادمی کو خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے لہذٰا وہ اپنے خیالات کے اظہار سے بار بار اس سلسلہ عمل کی زبردست تنقید کرتا تھا اسی پس منظر میں جب ہم نے ایک دن اختر سے کہا کہ وہ اکادمی کے لئے ایک نشان یعنی Emblem بنائے۔ تو اس نے فوراً کاغذ قلم لے کر ایک خستہ حال جھونپڑی پر ایک الّو کو بیٹھے ہوئے دکھایا اور پوچھنے لگا کہ اس سے زیادہ مناسب اور کیا نشان اکادمی کے لئے شایانِ شان ہو سکتا ہے۔

اختر کا یہ طنز اُن درآمدی سیکرسیٹریوں کی آمد و رفت کے خلاف ایک خاموش احتجاج تھا جو اپنے اپنے نظریہ کے مطابق ہی اکادمی کو الگ الگ راہوں پر لیتے اور سب سے زیادہ اپنے آقاؤں اور حکام وقت کی غلامی کرتے رہے۔

اس دوران میرے تحقیقی مضامین کی کتاب " گاشری منار " یعنے ''روشنی کے مینار''، کشمیری میں شائع ہوئی جسے 1975ء میں ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی دیا گیا۔ کہنا یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بھی اختؔر نے ہی تجویز کیا تھا اور میری رائے میں اس سے زیادہ موزون عنوان اس تصنیف کے لئے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کتاب میں دنیا کے گیارہ عظیم شاعروں کے حالات اور اُن کے فن پر تفصیلی مقالات درج ہیں اور ''روشنی کے مینار'' اسی کے نفسِ مضمون کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

اختر بات بات پر اس قرآنی آیت کا حوالہ دیتا تھا کہ وَقُولُو اللنّاسِ حُسناً (اور کرو لوگوں سے اچھی بات) مگر خود اس کا مزاج نوری بھی تھا اور ناری بھی جس میں ناری ہونے کے عناصر زیادہ موجود تھے۔ اسے خود آگاہی کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ کسی دوسرے کو آسانی کے ساتھ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے زمرے میں اسے اُن لوگوں سے سخت نفرت تھی جو اس

کے بقول حقیقی علم سے محروم ہی تھے جو صرف سطحی باتوں کے پل باندھتے تھے اور جو اپنے فن اور زبان کی سوداگری کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے تھے۔ ہمارے ادبی کاروان کے دو رہرو خاص طور پر مرتے دم تک اختر کی نظروں میں گر چکے تھے اور اُن کا نام سنتے ہی اس کی زبان پر ایک موٹی گالی آجاتی تھی۔ یہ دونوں اصحاب اس سلوک اور اختر کی نظروں میں اپنے مقام سے خود بھی واقف ہیں۔

کشمیر کے حکام اور اصحاب حل وعقد میں سے اختر محی الدین صرف غلام محمد صادق کا مداح تھا۔ دوسروں کے بارے میں وہ دشنام طرازی کی ساری حدیں پھلانگتا تھا۔ البتہ جو کچھ وہ کہتا تھا سچ ہی کہتا تھا۔

اختر اگر چہ تند مزاج کا ملک تھا لیکن اس کا دل سمندر کی طرح عمیق تھا۔ اور اس کا فولادی جگر مصائب کے پہاڑوں کو توڑ سکتا تھا۔ اختر کی زندگی کے آخری ایام میں اسے دو ایسے سانحوں سے گذرنا پڑا کہ خدا ایسی مصیبت سے ہر ایک کو بچائے۔ اس کے بالغ اور خوبصورت بیٹے محمد یوسف کو غیر معلوم بندوق بردار بدخواہوں نے شہید کر لیا اور اس کا داماد احمد اللہ ریشی اسی طرح سپاہیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ مگر اختر ان حادثات کا ذکر کرنے کا کسی کو موقع نہیں دیتا تھا۔ اس کا کلیجہ اندر سے چھلنی تھا مگر زبان خاموش تھی۔ اگر کوئی شخص اس واقعہ کا تذکرہ چھیڑتا تو اختر اپنا منہ دوسری طرف کر کے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو شہادت کی انگلی سے رگڑ رگڑ کر گویا بزبان حال یہ کہہ رہا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی اور اس پر ہمیں تن بہ رضا ہونا چاہئیے۔

میرے ساتھ سالہا سال کی دوستی کے دوران میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ اختر فلم دیکھنے کا شوقین ہے۔ اس لئے جب سری نگر کے ریگل سینما میں انگریزی فلم ''عمر مختار'' کی نمائش کی گئی تو میں نے اسے یہ فلم دیکھنے پر مجبور کیا کیونکہ اس

فلم میں گویا کشمیر ہی کی سیاسی ابتری اور کشمیری قوم کے استحصال کا ہو بہو نقشہ کھینچا گیا ہو۔ عمر مختار لیبیا کا ایک استاد تھا۔ اٹلی کے جابرانہ قبضے تلے اس کا ملک ہر قسم کے ظلم و ستم برداشت کرتا ہے اور عمر مختار اسی استبداد اور جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ اخیر پر اُسے پھانسی دی جاتی ہے مگر وہ غاصبوں اور جابروں کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں کرتا اور اقتدار کے لالچ میں آکر اپنی قوم کا سودا نہیں کرتا ہے۔

اخترؔ نے جب میرے ساتھ یہ فلم دیکھی تو اس دوران اس کی آنکھیں اشک بار ہوئیں اور سینما ہال سے باہر آتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا ''افسوس ہے کہ مقبول بٹ کو قتل کیا گیا ورنہ آج وہ ہمارے لئے عمر مختار ہوتا''

زندگی کے آخری دنوں میں اگرچہ اخترؔ محی الدین ایک جان لیوا بیماری کی گرفت سے وقتی طور آزاد ہوکر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور رات کو وہ سو بھی نہیں سکتا تھا مگر جہاں بھی اور جب بھی کشمیری زبان یا کشمیری ادب کی بات کرنا مقصود تھا وہاں وہ ہمیشہ پہنچ جاتا تھا۔ میری ہمراہی میں اس نے بڈگام، دلنہ بارہ مولہ، شوپیان، پلوامہ اور حاجن کے ادبی اجتماعات میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب نشاط انصاری کے انتقال کے بعد دلنہ میں ایک تعزیتی مجلس کا انعقاد ہوا تو اخترؔ نے اس میں دُکھ کا اظہار کیا اور بس میں سوار ہو کر واپس سری نگر پہنچ گیا۔ شام کو جب میں نے اس سے فون پر اس عجلت کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ اسے سری نگر میں کینسر سوسائیٹی کی میٹنگ میں شامل ہونا تھا لہٰذا وہ میری کار میں بیٹھنے کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔

اختر محی الدین جس قدر ایک ممتاز افسانہ نگار تھا اسی قدر وہ ایک منفرد انسان بھی تھا۔ جسے فطرتاً نرم مزاجی بھی حاصل ہو اور جو طبیعت کی تندی کا بھی خوگر ہو۔ اخترؔ ایک پڑھا لکھا ادیب تھا اور اس کا مطالعہ وسیع تر تھا جس میں اس

نے عالمی ادب، مذہب اور تواریخ کے خزانوں کو کھنگال کر اپنے شعور کی آگاہی کو جلا بخشی تھی اور فہم و دانش کے انمول جواہرات سے اپنے آپ کو مالا مال کیا تھا۔

کشمیری زبان میں افسانہ نگاری کا فن بیسویں صدی کے وسط کے آس پاس شروع ہوا۔ پہلے پہل جن ادیبوں نے اس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی ان میں سوم ناتھ زتشی، عزیز ہارون، دینا ناتھ نادم، نور محمد روشن، حبیب کامران، علی محمد لون، امین کامل ، اختر محی الدین، دیپک کول ،تاج بیگم رینزو، بنسی نردوش، مقبول حسین، علی محمد پروانہ اور صوفی شاہد عبداللہ شامل ہیں۔

اختر محی الدین خود پہلے اردو میں لکھتا تھا۔ جب 1954ء میں اس کے اردو افسانے ''پونڈرچ'' کو ایک بین الاقوامی مقابلے میں دوسرا انعام ملا تو اسے کلچرل کانفرنس کی صفوں میں نمایاں طور پر جانا اور پہچانا گیا۔ اُن دنوں اختر نے اردو میں کئی اور افسانے بھی لکھے جن میں بھاؤ گر رہے ہیں (کونگ پوش۔ مئی 1952ء) اور رات مرگئی (کونگ پوش جون 1954ء) گدھ (کونگ پوش اکتوبر 1955ء) اور پیوند (کونگ پوش دسمبر 1954ء) شامل ہیں۔

اختر نے جب کشمیری میں لکھنا شروع کیا تو اس کے سبھی ہم عصر اس وقت چونک گئے جب اس نے اپنے کشمیری افسانے کی ابتدا ''گھر لڑائی'' نام کے لافانی شاہکار سے کی۔ اس افسانے کے کردار آج بھی ہماری نظروں کے سامنے زندہ و جاوید صورت میں گھومتے نظر آتے ہیں۔

''دریایہ ہنٗد ییزار'' (عروسی پاجامہ) بھی اختر ہی کا ایک اور عظیم افسانہ ہے جس میں ایک عمر رسیدہ مرد کی جنسی جبلت کے زندہ ہونے کی علامت کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس طرح سے اختر نے کشمیری افسانے میں مقامیت اور ابدیت کی ایک ایسی بنیاد ڈالی جس کے اوپر دیگر افسانہ نگار بعد میں اپنی اپنی صلاحیت کے

مطابق فن کے نقش ونگار بناتے اور کشمیری ادب کو مالامال کرتے رہے۔

اختر محی الدین وانی اپریل 1928ء کو پیدا ہوا اور 22 مئی 2001ء کو رحمت حق ہوا۔ اس طرح سے اس نے زندگی کے ستّر سے اوپر ایک دو سال اور گذارے اور آج جب ہم اس کے کشمیری افسانوں کا شمار کرتے ہیں تو ان کی تعداد پچاس تک پہنچ جاتی ہے۔ اختر کا تخلیقی دور بھی لگ بھگ پچاس سال کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح سے اس نے اوسطاً ایک سال کے دوران ایک افسانہ تخلیق کیا۔

کشمیری زبان میں اخترؔ کی پہلی افسانوی کتاب ''سات چوٹیاں'' 1955ء میں شائع ہوئی جس میں اس کے سات افسانے شامل ہیں۔ اس کے بعد اس نے ''قوس قزح'' نام کا ایک اور افسانوی مجموعہ شائع کیا اور اس میں بھی شامل افسانوں کی تعداد بھی سات ہی ہے۔

''آم چھُ عجب ذات'' (انسان ایک عجیب ذات ہے) ایک طویل افسانہ ہے جسے اخترؔ نے 1959ء میں تحریر کیا اور یہ اسی سال کے اخیر پر سری نگر کے رسالہ تعمیر میں شائع ہوا۔ اس افسانہ کے بارے میں رحمان راہی نے اپنے ایک تنقیدی مضمون میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ''آدم عجیب ذات'' دراصل افسانہ ہے ہی نہیں لیکن راہیؔ کے اس خیال کی کسی اور نقاد نے تائید نہیں کی بلکہ اس کے برعکس موتی لال ساقی نے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا:

''یہ افسانہ آج بھی ہمیں دلجوئی کرتا ہے اور میری طرح اُن بے شمار لوگوں کو بھی پسند ہے جن پر اس کے ایک کردار رمضان کی طرح بیتی ہو۔ ایک واقعاتی سچائی کس طرح عظیم اور ابدی حقیقت بن جاتی ہے اخترؔ کا یہ افسانہ اسی کی وضاحت کرتا ہے اور یہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے''

ستمبر 2000ء کے مہینے میں کشمیر یونیورسٹی میں ایک سیمینار چل رہا تھا

جس میں میں نے بھی شمولیت کی۔ اس دوران اختؔر مجھ سے کہنے لگا :

”خیال! میری اب یہی تمنا ہے کہ اپنا آخری افسانوی مجموعہ چھاپ دوں۔ میرے پاس بہت سارا مواد جمع ہے۔ مگر کیا کروں میری سکت جواب دے چکی ہے اور اسے ایک نظر بارِ دگر دیکھنے کے لئے مجھے کوئی دوست نہیں ملتا۔ کون اس کے متن کی تصیح کرے۔ کون اسے پریس کو بھیجے۔ چلو مان لو کتاب چھپ بھی گئی تو بھی کیا ہوا۔ بعد میں اسے گھر میں بنڈلوں میں باندھ کر رکھنا ہوگا۔ صرف اس لئے کہ میری بیوی اس فضول سامان کو دیکھ دیکھ کر روز ناک چڑھائے“

اختؔر محی الدین کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے سبھی غیر مطبوعہ افسانے ایک ہی جلد میں یکجا کر کے منظر عام پر لائے۔ اس کی یہ خواہش جزوی طور پر اس کے مرنے کے بعد پوری ہوئی۔

اختؔر کا آخری افسانوی مجموعہ ”71979“ ہے جو اس کی وفات کے پندرہ روز بعد سری نگر میں ایک تقریب پر جاری کیا گیا۔

اختؔر کے اس مجموعہ میں پچیس افسانے ہیں اور اس کی رسم اجراء اس وقت ہوئی جب سرزمین کشمیر تشدد اور ظلم و جبر کے دور ناہنجار میں اپنے ہزاروں بیٹوں، ماؤں، بہنوں اور دوسرے انسانوں کو قتل و غارت کی نذر کر چکی تھی۔ خود اختؔر کا اپنا لختِ جگر بے لگام دہشت گردوں کی سفاکی کا شکار ہو کر شہید ہوا تھا اور اس کا داماد دوسری طرف بندوق بردار سپاہیوں کے ہاتھوں سرِ بازار قتل کیا گیا تھا۔ یہ افسانوی مجموعہ اس نے انہی دو نوجوان شہیدوں کی نذر کیا ہے اور کہا ہے کہ ”میری آنکھوں کے سامنے وہ سبھی کشمیری نوجوان آتے ہیں جو ظلم کی اس تاریکی میں بے نام جگہوں پر قتل کیے گئے“

اختؔر محی الدین کشمیر کی زندگی کی عکاس تھا اور اس کے سبھی کردار کشمیری

شہروں اور قصبوں کے رہنے والے تھے۔اسی نے کبھی اپنے افسانوں میں مغربی معاشرت کا نقال بننے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کی نظروں میں کشمیر ایک ایسی سرزمین کا درجہ رکھتا تھا جو سالہا سال تک محکومی اور غلامی کے ادوار میں بھی خوف کے عالم میں سانسیں لے لے کر سرسبز اور شاداب رہی۔اختؔر اپنے فن کو بھی اسی حقیقت کے تابع رکھتا تھا اور اسی حقیقت کا سب سے روشن پہلو یعنی زندگی اس کے فن کا محبوب موضوع تھا۔''سات چوٹیاں'' کے پیشِ لفظ میں وہ کہتا ہے۔

''فن زندگی کا پیارا اور لاڈلا بیٹا ہے۔یہ تب تک زندہ ہے جب تک یہ زندگی کی گود میں دودھ پیتا رہے گا۔اس سے جدا ہو کر اس کی موت واقع ہوگی۔چونکہ ہر فن کار زندگی کے بھرپور جسم کا ایک انگ ہے لہذا اسے زندگی کے اس لاڈلے بیٹے کو زندہ رکھنے کی خاطر اپنا فن ہمیشہ زندگی کی آغوش کے قریب رکھنا ہوگا۔عظیم فن وہ ہے جس میں زندگی کے دل کی دھڑکن ہو اور جس کے ہونٹوں پر دودھ پیتے معصوم بچے کی مسکان ہو۔جس فن میں یہ دو باتیں موجود نہ ہوں وہ مردہ، بے جان اور بے اثر ہوگا''

اختؔر کے افسانے ''71979'' کا پس منظر بھی عجیب سا ہے اور اس افسانے کے حوالے سے موت کی ازلی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔مصنف سے کوئی کہتا ہے کہ اس کا ایک دوست کینسر کی بیماری میں مبتلا ہے وہ اسی فرضی ٹیلی فون نمبر ''71979 '' پر اپنے دوست کو فون کرتا ہے اور باتوں باتوں میں فلسفۂ حیات۔نکیر و منکر کا حال اور جنت اور جہنم کے حالات ایک تیز اور تیکھے لہجے میں واضح کرتا ہے۔

اس فلسفیانہ تصویر کشی کا حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ اختؔر خود ہی اسی مہلک بیماری کی وجہ سے انتقال کر گیا لیکن اس کا ''کینسر والا'' دوست ابھی بقیدِ حیات

ہے۔خدا اسے عمر دراز عطا کرے۔ اختر کا یہ دوست کوئی اور نہیں بلکہ امین کامل ہے جس کے نام یہ افسانہ منسوب کیا گیا ہے۔

تین افسانوی مجموعوں کے علاوہ اختر کی جو اور کئی کتابیں چھپ چکی ہیں ان میں ایک ناول ''دود تہ دگ'' (درد اور ٹیس) (1957ء)، ایک اور ناول ''جہنمک پنُن پنُن نار'' (جہنم کی اپنی اپنی آگ) (2002)، ''سوویت یونین کا سفر نامہ ''سلاوامیر'' (1971ء) ، مہاتما گاندھی کی خودنوشت سوانح عمری (1976ء)، ابسن کے ڈرامے ''ژھاے'' کا ترجمہ ''بھوت'' اور ملیالم ادیب تاکزئی شیو شنکر پلائی کی ناول ''گاڈہ ہانزن'' (چیمین) کا کشمیری ترجمہ شامل ہیں جو ''مچھلی فروش عورت'' کے نام سے شائع ہوئی۔اس کے علاوہ اختر کا ایک اور ناول ''زُوتہ زولانہ'' (جسم اور زنجیریں) کا ذکر بھی ملتا ہے مگر یہ ناول ابھی تک ہماری نظروں سے نہیں گذرا ہے۔ حالانکہ ''سلاوامیر'' کے آخری صفحہ پر اختر نے خود یہ اعلان کیا تھا کہ یہ ناول زیرِ طبع ہے۔

اختر محی الدین کے کئی اور افسانے بدقسمتی سے اُن کے مجموعوں میں شامل نہیں ہوسکے ہیں۔اس کی یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ یا تو مرحوم کے پاس ان کی کوئی نقل موجود نہیں ہوگی یا اس کے پاس وہ رسائل اور کتب دستیاب نہیں ہوں گی جن میں یہ کشمیری افسانے چھپ چکے ہیں۔ان میں سے چند افسانے یہ ہیں: داغ (کونگ پوش فروری 1956ء) کیا کہوں؟ (کونگ پوش جولائی 1956ء) شرماتا ہوں (سون ادب (1965ء) اور دیوانے کی بات (سون ادب (1979ء)۔

اختر محی الدین بلا مبالغہ کشمیر کے گلستانِ ادب کا ایک بلبل ہزار داستان تھا۔

☆☆☆

یارانِ وطن جو چلے گئے

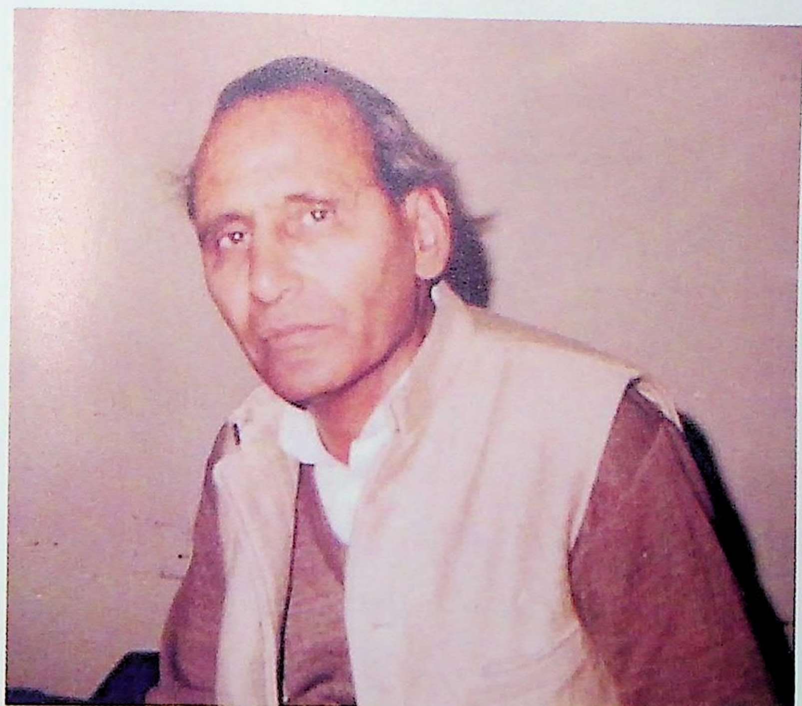
☆ طاؤس بانہالی ☆ آزر عسکری ☆ تحسین جعفری

(اس مقالاتی سلسلے میں زیرِ تذکرہ تین شاعروں کے علاوہ کے ایچ خورشید، احمد شمیم، مسعود کشفی، میر غلام احمد کشفی، عبدالصمد وانی، میر عبدالعزیز، حمید ممتاز، ناز کولگامی، میر بشیر سلطان، غلام احمد ناز کولگامی، محمد علی کنول اور جی ایم مُفتی کے علاوہ اُن کشمیری قلم کاروں اور صحافیوں پر سوانحی اور تحقیقی مضامین شامل کیے جارہے ہیں جو 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد ریاست جموں و کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر چلے گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ خیالؔ)

☆ غلام رسول طاؤس بانہالی

طاؤس بانہالی سے میرا غائبانہ رابطہ کم و بیش چالیس سال، پر محیط رہا۔ اس کے بعد جب میں 1986ء میں پہلی بار پاکستان گیا تو وہاں میرا قیام سرزمین کشمیر کے ایک مخلص اور دوست نواز صحافی اور دانشور مرحوم خواجہ عبدالصمد وانی کی قیام گاہ واقع راولپنڈی میں رہا۔

وانی صاحب کا گھر اہل دانش اور اصحابِ بینش بالخصوص اہلِ کشمیر کی آماجگاہ تھا۔ وہیں پر طاؤس صاحب سے دوبدو میری ملاقات ہوئی اور میں نے



غلام رسول طاؤس بانہالی

پہلی ہی ملاقات میں انہیں ایک بیباک، لا اُبال، مست قلندر اور ابدی مسکراہٹوں میں لپٹے ہوئے شاعر کے روپ میں دیکھا۔

راولپنڈی ہی میں انہوں نے مجھے ایک تصویر عنایت کی جس میں ان کے ساتھ مسعود کشفی بھی ہیں۔اس تصویر کی پشت پر طاؤس نے یہ شعر رقم کرتے ہوئے یہ تحفہ مجھے بخشا اور کہا کہ غالباً میرے جانے کے بعد یہ شبیہ اور یہ شعر آپ کو میری یاد دلاتے رہیں۔یہ شعر یوں ہے:

گُلستانوں آبشاروں لالہ زاروں کا خیال
دل نے تو پل پل کیا ہجرت کے ماروں کا خیال

1947ء کے بعد نومولود پاکستان اپنے وجود کے کھنڈرات سے حیاتِ نو کی جزئیات کو چُن چُن کر اپنی نئی ساخت کو تشکیل دے رہا تھا اور وہاں معاشی طور پر خاص طور دانشوروں اور قلم کاروں کے لیے روزگار کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔کیونکہ یہ ملک بہت حد تک اور سالہا سال تک سیاسی نظام کو استحکام بخشنے ہی کی طرف متوجہ رہا اور اس طرح سے وہاں کی معیشت بھی دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

وادیٔ کشمیر سے منقسم کشمیر کی سرحد کے اُس پار ہجرت کرنے کا فیصلہ خاص طور پر اُن لوگوں نے کیا جو ریاستی حکومت کی سیاست کاری سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور سرکاری عتاب کے خدشات سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

اس وقت آزاد کشمیر جسے کشمیر پر قبائلی حملے کے نتیجے میں مہاراجہ ہری سنگھ کی سلطنت سے بزورِ بازو چھین کر ریاست سے الگ کیا گیا تھا ایک ایسا پہاڑی علاقہ تھا جس کی آبادی کا اکثر حصہ پہاڑی اور گوجری قبیلے کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کشمیری مہاجرین کو یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا ہوگا کہ ریاست کے اُس پار

والے کشمیر میں کشمیری زبان بولنے والا شاذ و نادر ہی کوئی بندۂ خدا موجود تھا۔ اس نو آباد خطے میں نہ تو ترقی کی کوئی منصوبہ بندی شروع ہوئی تھی اور نہ ہی وہاں پر کشمیری مہاجروں کے لیے خاطر خواہ رہائش، روزگار اور معاشی آسودگی کی کوئی صورت موجود تھی۔

بہر حال جب یہ یارانِ وطن مظفر آباد پہنچے جو اُس علاقے کا صدر مقام تھا تو پہلے پہل انہیں بے پناہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کے لئے اُس وقت باعزت روزگار کے دروازے کھل گئے۔ جب وہاں ایک سرکاری نشریاتی ادارہ آزاد کشمیر ریڈیو کے نام سے قائم کیا گیا۔ احمد شمیم، طاؤس بانہالی، آزر عسکری، تحسین جعفری، مسعود کشفی، جی ایم مفتی، مظفر پنجابی اور کئی دوسرے کشمیری دانشور اسی ادارے کی بدولت اپنی شناخت کو برقرار رکھ سکے اگرچہ کئی اور اصحاب نے صحافت کا پیشہ اپنانا ہی مقصد حیات بنایا جن میں میر عبدالعزیز، عبدالصمد وانی اور روزنامہ آفتاب سری نگر کے مدیر ثنا اللہ بٹ مرحوم کے برادر محمد صدیق بٹ نمایاں طور پر شامل ہیں۔

طاؤس بانہالی وادیٔ کشمیر کے فلک بوس برفانی پہاڑوں میں گھرے قصبہ بانہال میں موضع کسکوٹ میں 28 نومبر 1933ء کو پیدا ہوئے ان کے والد خواجہ احمد خان اس موضع کے زمیندار تھے۔

بقول عبدالقادر سروری طاؤس کے والد بھی بڑے بدلہ سنج تھے اور قصہ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں طاؤس کے چھوٹے بھائی کو بھی شعروسخن سے لگاؤ تھا۔ (1)

طاؤس 1947ء میں پاکستان چلے گئے۔ اس سے قبل انہوں نے 1945ء میں ایک غنائیہ "وقت کا لٹیرا" لکھا تھا جس پر اربابِ حل و عقد نے

ان کی سرزنش بھی کی تھی۔ 1961ء میں وہ ریڈیو پاکستان میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور دو سال بعد انہوں نے پاکستان ہی میں اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔

اپنے یوم انتقال یعنی 20 ستمبر 2000ء تک طاؤس اپنے وطن سے دوری کا رونا روتے رہے۔ غلام احمد ناز کولگامی نے علامہ اقبال کی اسرارِ خودی کا جو منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے اور جسے اقبال اکادمی پاکستان نے 1969ء میں شائع کیا اس کے پیش نامے میں بھی طاؤس کو گھر سے دور ہونے کا کرب ستاتا ہے اور وہ مہجور، رسول میر اور آزاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر بھی گنگناتا ہے:

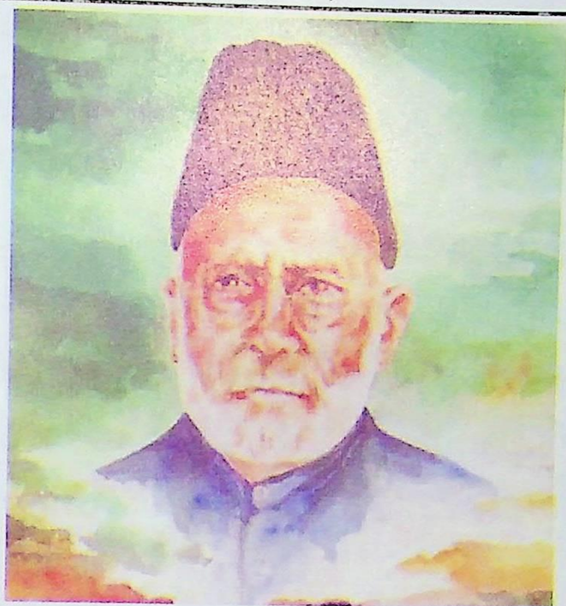
ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم ویکیم

اسی طرح تحسین جعفری کے کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' کے پیش لفظ میں بھی اس غمِ وطن کی نوحہ خوانی یوں کرتے ہیں: ''ہجرت کا سلسلہ چالیس سال گذرنے کے باوجود آج بھی جاری ہے جس کا ثمر غالباً یہی دردِ مشترک ہے جو گوجری شاعر رانا فضل حسین۔ احمد شمیم اور ان درجنوں شاعروں کو لاحق ہے جو ہجرت کا یہ دُکھ سہہ سہہ کر جی رہے ہیں۔ بقولِ غلام نبی خیال صاحب:

کأشر زبو چھم تالس لجمژ ونہ کس پر مس کوتاہ چوم
وَتہِ وَتہِ پھیرتھ بیہِ گرہِ سمہ ہوتمہ گرہِ کتہ ین کالی میتو

کشمیر سے دوری کی وجہ سے احمد شمیم دومیل کے پل پر دریا (جہلم) کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور رانا فضل حسین کو منگلا جھیل میں ویری ناگ کا حسن جلوہ بار نظر آیا۔

یہی مصیبت کے دن ہم غریب الوطنوں کے لئے سالہا سال سے اس



تحسین جعفری



آزر عسکری

طرح سے مقرر ہو کر گذرتے گئے کہ شاہد ہم بھی کسی روز اپنے گھر کو لوٹیں:

باگہِ طاوسہ ہر دہ یاوُن آم
شراونس دردہ نے کرم آباد (2)

طاوؔس کی تخلیقات میں حضرت شیخ نورالدین نورانی کے تقریباً پانچ سو اشلوکوں اور منظومات کا منظوم اردو ترجمہ اور کشمیر کی لوک کہانیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ترجمہ شیخ ''ریشی نامہ'' کے عنوان سے لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد کی طرف سے دسمبر 1980ء میں شائع ہوا۔ طاوس نے کلام شیخ العالم کے کس نسخے سے ترجمہ کا کام سرانجام دیا ہے اس سلسلے میں وہ خود بھی پرُ یقین نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہین کہ ''یہاں یہ عالم ہے کہ ہم آج تک لل عارفہ اور نندہ ریش کے ایسے کلیات بھی مرتب نہیں کر پائے جن کا متن صحیح ترین یا صحت کے قریب ہو۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ کلامِ شیخ کے ان اجزاء کی اشاعت اور تشہیر کا کچھ سامان کیا جائے جو کم از کم عام فہم اور قابلِ اعتماد ہوں''(3)

اس ترجمہ سے چند مثالیں یہاں تبرکاً پیش کی جاتی ہیں:

میں نے پڑھا توحید کا کلمہ میں نے پایا رازِ حیات
موجود اس کو وجود میں پایا ہر سو دیکھا جلوہٗ ذات



یہاں بھی میرا تُو ہی تُو اور وہاں بھی میرا تُو
میں خاکی تُو میری مٹی کو کردے گلزار
میں نے سب کچھ چھوڑ کے تیرا دامن تھام لیا
میں مٹی میں خاک، مگر چاہوں تیرا دیدار



میرا جیون مری جوانی جیسے پھول انار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست و بازو اپنے کیئے کا پھل جب پائیں گے
کیا اس وقت کروں کیا حاصل میری چیخ و پکار کا ہو



پل بھر میں شبنم کے موتی پل میں پوہ کا پالا تھا
پل میں اماوس رات اندھیری پل میں نُور کا ہالا تھا



طاؤسؔ نے کشمیر کی لوک کہانیوں کو بھی اردو میں ڈھالا ہے اور یہ ترجمہ بھی لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد کی طرف سے حسنِ اہتمام کے ساتھ 1987ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ بظاہر یہ ترجمہ طاؤسؔ نے جے ہنٹن نولز کی مشہور کتاب فوک ٹیلز آف کشمیر سے استفادہ کر کے ہی کیا ہوگا لیکن کہانیوں کے عنوانات اور اُن کی داستانوں سے طاؤس نولز سے کوسوں دور اور الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ طاؤسؔ نے کشمیر کی لوک کہانیوں کے کئی نسخے زیرِ نظر رکھ کر اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے جس کی طرف وہ خود بھی ان الفاظ میں نشان دہی کرتے ہیں'' اردو میں ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اصل کشمیری لوک کہانیوں کا لہجہ برقرار رہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے ہر علاقے اور ہر مزاج کی کہانیوں کا ایک نمائندہ انتخاب مرتب کیا جائے''(4)

طاؤس کا صرف نولز کی کہانیوں ہی کا ترجمہ نہ کرنا اس حقیقت سے بھی تقویت پاتا ہے کہ جہاں طاؤسؔ ''ہر علاقے اور ہر مزاج'' کی بات کرتے ہیں وہاں نولز کی کہانیوں کا خطۂ بیانیہ کشمیر کے دو تین اضلاع پر ہی حاوی ہے۔ مترجم کو چاہیئے

تھا کہ وہ نولز کی طرح ان وسائل اور ذرائع کا بھی حوالہ دیتے جن سے انہوں نے عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا لیکن طاؤس نے ایسا نہ کر کے قاری کے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا ہے۔ البتہ جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے اس میں شامل بیشتر کہانیاں حاتم تیلی کی کہانیوں ہی کا ترجمہ ہے۔

طاؤس کا طبع زاد نمونۂ کلام یوں ہے:

راہ و رسمِ کُہن کی بات چلی — قیس اور کوہکن کی بات چلی
اک تبسم کناں کلی چٹکی — پھر کسی گل بدن کی بات چلی
یاد آتے رہے وہ دیوانے — جب بھی دارورسن کی بات چلی
جلتی یادوں کی جگمگاہٹ ہے — ہائے کس انجمن کی بات چلی
کُنجِ غربت میں یوں رہے طاؤس — دھڑکنوں کے وطن کی بات چلی

طاؤس نے حبہ خاتون کے ایک گیت کا بھی گیت ہی کے مخصوص اسلوب میں ترجمہ کیا ہے جسے یہاں دوہرا کر محفوظ کیا جاتا ہے:

کچھ سندر الہڑ کرنیں
اُتریں گھر آنگن میں
آکاش سے پریاں اُتریں
زمزم کے پانی میں
نہلا کر پھر جا بیٹھیں
اُتریں گھر آنگن میں
رُوپک مایا کودھُن میں
بہروپی اُلجھائیں
ان لہروں سے بھی الجھیں
اتریں گھر آنگن میں

جب آنکھ کھلے جوبن میں
سسرال کے دن آئیں
خوابوں میں ڈوبی آنکھیں
اُتریں گھر آنگن میں



☆فتح محمد خاں آزرؔ عسکری

آزرؔ تبتِ خورد یعنی بلتستان میں اسکردو کے مقام پر 1912ء میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت اسکردو میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ آزر نے بلتی اور فارسی والدین سے سیکھی اور پھر کشمیر اور جموں میں زندگی گذارنے کے دوران پنجابی، کشمیری اور اردو زبانیں سیکھ لیں۔

1948ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہلے پہل فارسی میں شاعری کی لیکن بعد میں مزاحیہ انداز میں سخن گوئی کا شغف اختیار کیا" اردو شاعری کا آغاز 1932ء میں ہی کیا تھا۔ کچھ منظومات کی اصلاح استاد محترم حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے فرمائی ہے اور باقی تمام عرصہ حضرت ڈاکٹر بشیر محمد میاں قیس شیروانی مرحوم کے اخلاق کریمانہ اور روابط برادرانہ سے مستفید ہوتا رہا۔" آگے کہتے ہیں" میرا خمیر جنتِ کشمیر کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ (1976ء میں) پیسنٹھ سال گذر چکے ہیں 1948ء میں جنت سے نکالا گیا۔ آج کل مظفر آباد آزاد کشمیر میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ کہاں جاؤں گا:

تا حدِ نظر جادۂ ویرانِ عدم ہے
اس راہ میں لاہور نہ پنڈی نہ پشاور (5)

"کشتِ زعفران" آزر کا اردو مجموعۂ کلام ہے جو 1976ء میں

اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں شاعر کا سارا مزاحیہ کلام یک جا ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔

آزؔر عسکری نے ہمارے خیال میں اپنے لئے مزاحیہ شاعری کو اپنا موضوع سخن بنانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کی اس شاعری میں انہوں نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں سماج، سیاست اور زندگی کے دیگر شعبوں کی کمزور نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک قابلِ توجہ اردو شاعری کا سرمایہ پیش کیا ہے جو انہیں دیگر ممتاز پاکستانی مزاح گو شاعروں سید ضمیر جعفری اور انور مسعود کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ آزؔر نے حاجی لق لق کی مشہور نظم ''بہشت بریں'' کی جو تضمین کی ہے وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کا صرف ایک بند پیش ہے:

وہاں پر نہ ہوگی نہ پستی بلندی
نہ کام آئے گی اپنی کچھ ہوش مندی
نہ جرأت کسی کو کرے بات گندی
نہ بندی نہ بندہ نہ منصوبہ بندی
عصا ہاتھ میں لے کے ٹہلا کریں گے
بہشت بریں لے کے ہم کیا کریں گے

آزر عسکری نے صحافت کے میدان میں بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ وہ کئی سال تک ہفت روزہ کشمیر چلاتے رہے۔ ان کی غنی کشمیری پر تحقیق مبینہ طور پر ایک منفرد انداز کی محققانہ کوشش ہے اگرچہ اس کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔

آزؔر، مارچ 1983ء کو مظفر آباد میں انتقال کر گئے اور وہ وہی پر مدفون ہیں۔

صابر آفاقی نے آزؔر کی مزاحیہ شاعری پر مختصر الفاظ میں یوں اپنی رائے ظاہر کی ہے:

''آزر نے انسان اور انسان کے کاموں کو ہمیشہ غیر سنجیدہ نظر سے دیکھا ہے بلکہ تمسخر اڑایا ہے اور اسی میں اس کے فن کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو طنزیہ شاعری میں آزر کا مرتبہ وہی ہے جو فارسی میں عبید زاکانی اور اردو میں اکبرالہ آبادی کا ہے''۔(6) بقول حبیب کیفوی ''آزر جس شعری مجلس میں کلام سناتے ہیں اُس میں قہقہوں کے فوّارے پھوٹ پڑتے ہیں لیکن جب اہل فکران کے کلام پر غور کرتے ہیں تو انہیں مزاح اور طنز کے پردے میں معاشرے کے روگ اور رستے ہوئے ناسور دکھائی دیتے ہیں''(7)

حفیظ جالندھری اور قیس شیروانی کے علاوہ آزر نے جن اساتذۂ اردو کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ ''اس سلسلے میں مزید جن بزرگوں سے رابطہ رہا ہے ان میں نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی۔ تاثیر مرحوم اور سید وحید الدین بیخود دہلوی سرِ فہرست ہیں۔(8)

آزر عسکری کا ذریعۂ روزگار گھڑی سازی کا کام تھا۔ معاشی طور پر وہ کبھی آسودہ حال نہیں رہے اور عمر کے آخری ایام میں کمزور بینائی کی وجہ سے نوشت وخواند کا سلسلہ تقریباً منقطع ہوگیا۔ غریب الوطن ہو کر وہ پاکستان میں سیالکوٹ۔ لائل پور اور لاہور میں مقیم رہے۔ بالاخر انہیں مظفر آباد ہی کی مٹّی نصیب ہوئی۔

آزر کی نظم ''نذرِ فیض'' کے یہ چند اشعار دیکھیں:

سرِ رہ گذر وہ دکھا کے یُوں رُخ پرُ بہار چلے گئے
ذرا جھانکا کھڑکی سے کار کی اور بھگا کے کار چلے گئے

تیرے عشقِ ٹیڈی مزاج نے کبھی جا پہ ٹکنے نہیں دیا
کبھی زنجبار چلے گئے کبھی ہر دوار چلے گئے

شب وعدہ وہ جو نہ آسکے رہی یہ فتیگ ہی رات بھر
کبھی کوئے یار میں جا گھسے کبھی سوئے بار چلے گئے

اس مختصر سے جائزہ کے اختتام سے پہلے آزؔر کے چند منتخب اشعار ناظرین کی تفننِ طبع کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

صرف افسر ہی کا ڈر اس میں نہیں ہے کافی
ساتھ بیوی کا بھی ڈر ہو تو غزل ہوتی ہے
دردِ دل دردِ جگر مال ہیں کنڈم دونوں
دردِ سر دردِ کمر ہو تو غزل ہوتی ہے



ازل سے ہی اُلٹ تاثیر ہے ہے کشتِ محبت کی
کہ گندم اس میں گر بوئیں تو ہوتے ہیں مٹر پیدا



سوہنؔی کے گھڑے کا افسانہ تاریخ نے یوں دہرایا ہے
ساحل پہ گھڑے ہم دیکھا کیے اور یار کا بیڑا غرق ہوا
قسمت ہی کچھ ایسی لائے ہیں اب اس کا مداوا کون کرے
اخبار نے فوٹو چھاپی تو اخبار کا بیڑا غرق ہوا
اتوار کا وعدہ اُن کا تھا جانا تھا کلفٹن دونوں کو
ڈیڈی کی اچانک آمد سے اتوار کا بیڑا غرق ہوا



اگر طے ہو گیا ہوتا میرے کشمیر کا قصہ
یہ لیڈر لیڈری کو اپنی چمکانے کہاں جاتے

نظم ''میرا تیرا شہر چھوڑ کر'' سے یہ اشعار:

اس سے پہلے کہ وہ عدو کم بخت
تیرے گھر جا کے چغلیاں کھائے
اس سے پہلے کہ دیں رپٹ جا کر
تیرے میرے شریف ہمسائے
اس سے پہلے کہ تیری فرمائش
مجھ سے چوری کا جرم کروائے
اس سے پہلے کہ اپنا تھانے دار
مُرغ تھانے کا مجھ کو بنوائے
میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا

''فال نامۂ جدید'' سے یہ برجستہ اور برمحل اشعار:

بشارت ہو تجھے اے صاحبِ فال
مبارک ہر طرح تجھ کو ہے یہ سال
تری قسمت میں حج کا بھی سفر ہے
مگر اس میں ذرا سا یہ فرر ہے
کہ سونا جب وہاں سے لائے گا تُو
یہاں آتے ہی پکڑا جائے گا تُو



بخار و دردِ سر، اسہال، نزلہ، کھانسی و پیچش
مرض تو موسمی سب آگئے کیا تم نہ آؤ گے

سحر سے دوپہر تک پان والے کی دُکاں سے ہم
کوئی پچاس پتّے کھا گئے کیا تم نہ آؤ گے



خلاف توقع وہ آئیں بظاہر عنایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
مگر اس عنایت کے پردے میں اپنی حجامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
وہ ایٹم شکن اُن کی دو مست آنکھیں وہ دوجوہری بم وہ قامت کہ راکٹ
اب ایسے خطرناک پر جان دینا شہادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے



اور اخیر پر اُن کی معرکۃ الآراء نظم ''سرّ دِگراں'' سے یہ اشعار نقل کر کے تذکرۂ آزر کو اختتام پر لاتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں مجھے خوش فکر ہوں دلشاد ہوں
ہر طرح کے رنج و غم آلام سے آزاد ہوں
یہ نہیں معلوم سر سے پاؤں تک فریاد ہوں
بیوی میکے جا بسی ہے میں مظفر آباد ہوں
ساس کے پنجے میں اک جکڑا ہوا داماد ہوں



☆ سرفراز حسین خاں تحسینؔ جعفری

تحسینؔ جعفری کی ولادت پونچھ میں 1908ء میں ہوئی۔ 1949ء میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد پہلے وہاں امور کشمیر کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ رہے اور پھر ہفت روزہ ''کشمیر'' کے مدیر مقرر کیے گئے۔

تحسین کا تعلق مسلکی لحاظ سے شیعہ فرقے کے ساتھ تھا لہٰذا اُن کے یہاں کلام کا بیشتر حصہ اہل بیت کی نوحہ خوانی اور شہدائے کربلا کی مرثیہ خوانی پر

ہی مشتمل ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے نعت،منقبت، حمد اور وطن پرستی کے نغمات بھی لکھے ہیں۔ جعفری کے اردو مجموعہ ہائے شعر میں سرمایۂ نجات دل، لخت لخت اور سفینہ نجات شامل ہیں۔

جعفریؔ کی اردو یا کشمیری شعر گوئی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اسے عام قسم کی شاعری ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جعفری پر اگرچہ علامہ اقبال کا گہرا اثر تھا لیکن اقبال کی فنی نزاکتوں کی دہلیز پر جعفری بس کھڑے ہو کر رہ گئے اور اقبال کے گنجینۂ سخن سے اپنا خالی دامن بھرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تاہم منشور بانہالی کے جعفری صاحب کے بارے میں اس اظہارِ خیال کو بھی مکمل طور پر خارج از فکر نہیں کیا جا سکتا جب وہ کہتے ہیں "تحسین جعفری ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں جو زبان و بیان پر پوری دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے دور کے کچھ سرکردہ ہم عصر شعراء کی طرح اپنا ادبی سفر اردو شعر گوئی سے شروع کیا ہے۔ شعر گوئی کی یہ تحریک بنیادی طور پر آپ کو کچھ رثائی منظومات خاص کر میر انیسؔ اور مرزا دبیر کے مراثی سننے اور مطالعہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی جس نے آگے چل کر آپ کی فکری اور فنی صلاحیتوں کو بہت ہی مستحکم اور معتبر بنا دیا ہے"

تحسین مشہور اردو افسانہ نگار کرشن چندر کے ہم جماعت تھے۔ انہیں ایک اور پونچھی ادیب اور صحافی چراغ حسن حسرتؔ کی صحبت بھی حاصل رہی۔ تحسین کے شاگردوں میں سردار محمد عبدالقیوم خان۔ سردار سکندر حیات خان۔ جسٹس محمد اقبال فانی وغیرہ شامل ہیں۔ جعفری صاحب جب 1996ء میں انتقال کر گئے تو ممتاز مزاح نگار اور شاعر سید ضمیر جعفری نے کراچی کے روزنامہ جنگ میں جعفری صاحب کے بارے میں لکھا کہ "پونچھ نے تین نامور ادبی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔کرشن چندر، چراغ حسن حسرت اور تحسین جعفری"

تحسینؔ جعفری کا کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' نام کے دیوان کی شکل میں شائع ہوا ہے جسے انہوں نے اپنے ان الفاظ میں واضح کیا ہے ''کہ اس کی اشاعت کا مدُعا یہ تھا کہ میری اولادیں نسلاً بعد نسلاً یہ حقیقت ذہن نشین کریں کہ وہ سارے کشمیری الاصل ہیں خواہ ان کا قیام کہیں پر بھی ہو اور انہیں اپنے وطن کشمیر کو کسی صورت میں بھولنا نہیں''۔

نمونۂ کلام یوں ہے:

آغازِ بہاراں میں اپنا کچھ اور ہی عنواں ہوتا ہے
ہر زخمِ جگر لو دیتا ہے ہر داغ فروزاں ہوتا ہے
آنکھوں کے سُونے جھروکوں میں اشکوں کی شمعیں جلتی رہیں
ہر شب میرے کلبۂ احزاں میں اک جشنِ بہاراں ہوتا ہے
آسودۂ ساحل کیا جانے موجوں کی تلاطم خیزی کو
ہم موجۂ ساحل ہیں ہم سے اندازۂ طوفاں ہوتا ہے
آئینِ محبت میں واعظ احساسِ زیان وسُود نہیں
جاتے ہیں اس کوچے میں جہاں رُسوائی کا ساماں ہوتا ہے
کس رشکِ گلِ تر کی خوشبو انفاس میں میرے شامل ہے
ہر سانس کی آمد وشد پر جو احساسِ بہاراں ہوتا ہے
آنکھوں کے دیئے بجھنے سے لگے ہونٹوں کے کنول مُرجھا سے گئے
اب آئینہ دیکھ کے سوچتے ہیں کیوں حسن گریزاں ہوتا ہے
یہ دورِ بہار وخزاں تحسینؔ کیا جانئے کب تک ختم نہ ہو
دل خون کے آنسو روتا ہے اک غنچہ جو خنداں ہوتا ہے

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو۔ جلد 3۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سری نگر۔ 1984ء۔
(2) جموں صوبس منز کاشرہ زبان و ادبک تواریخ۔ منشور بانہالی۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ 2001ء۔ ص 188
(3) ریشی نامہ۔ لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد۔ 1980ء ص 19
(4) کشمیری لوک کہانیاں۔ 1987ء، ص 8
(5) پیش لفظ کشتِ زعفران۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن بینک روڈ، مظفر آباد۔ جولائی 1976ء۔ ص 9
(6) عکسِ کشمیر۔ گلشن بُکس سری نگر، 2011ء، ص 128
(7) کشمیر میں اردو۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ 1979ء، ص 203
(8) ایضاً۔ ص 204
(9) تحسین جعفری۔ منشور بانہالی۔ کلچرل اکادمی سری نگر۔ 2009ء۔ ص 100

☆☆☆

انگریزی اور کشمیری

ادبی لین دین کا خوش آئند عمل

دُنیا بھر میں کئی اور اسباب کے علاوہ مختلف ثقافتوں اور ادب کا مالا مال ہونا اس مسلسل عمل کا مرہون منت ہے جس کی رو سے زبانوں کا ادب ایک دوسرے کے تراجم، اتباع اور اثر پذیری سے سرمایہ دار ہوا ہے۔

اس لین دین کی برکت سے خاص طور پر مغربی ادب نے بہت بڑا استفادہ کیا ہے۔

شروع شروع میں یونانی شاعر ہومرؔ نے اپنے دو عظیم رزمیے الیاڈؔ اور اوڈیسی اپنے ہی تخیل سے تخلیق نہیں کیے بلکہ اُس کی پشت پر ایک شاندار یونانی دیومالا کا بھرپور خزانہ تھا جس کی جزئیات کو اُس نے اپنی شاہکار تخلیقات میں خام مواد کے طور پر استعمال کیا۔

قدیم یونان کے اس نابینا گوّیے نے اپنی ملکی دیومالا سے سڑکوں پر اور بازاروں میں دلچسپ کہانیاں سنی تھیں جنہیں وہ عام لوگوں کی بھیڑ والی جگہوں پر رباب بجا کر اور گا کر دوسروں کو سناتا اور اس طرح سے اس کی روزی روٹی کا بندوبست ہو جاتا۔ ہومر کے قدردانوں میں خاص طور پر یونانی عوام کا وہ طبقہ تھا

جو دیو مالا کے مافوق الفطرت کرداروں کے حیران کن کارنامے سن سن کر سر دھنتا۔

غالباً ہومر یونانِ قدیم کا وہ اولین شاعر تھا جس نے اپنے وطن عظیم کے لوک سرمائے سے اثر پذیری حاصل کر کے اپنے ادب کی برتری کا دیدہ زیب پیکر عطا کیا۔

زبانوں کے بارے میں ضروری ہے کہ وہ اور خاص کر چھوٹی زبانیں اپنے فروغ اور تشہیر کی خاطر دوسری زبانوں کے لئے بھی اپنے دروازے کھول دیں اور ان زبانوں سے وہ سارا کچھ خوشی اور رضامندی سے حاصل کریں جس کی بنا پر ان میں وسعت اور عظمت کی مطلوبہ خصوصیات پیدا ہوسکیں۔

کشمیری زبان کی لسانیت، ادبیات اور ثقافتی پس منظر پر سنسکرت، عربی، فارسی اور خاص کر ہندی کے اثرات نمایاں طور پر واضح ہیں۔ ان زبانوں کا کشمیر کی وادی میں صدیوں تک چلن رہا ہے اور سنسکرت کی اہم کتابیں مثلاً کلہن پنڈت کی راج ترنگنی، سوم دیو کی کتھا سرتِ ساگر اور کھیمیند ر، ابھینو گپت، آنند وردھن اور دیگر قلم کاروں، تاریخ دانوں اور نقادوں کی ساری تصانیف تو سنسکرت میں ہی موجود ہیں۔

مغل بادشاہوں کے دور میں کشمیر پر فارسی کا اثر غالب رہا اور مقامی شاعروں نے اس زبان کی درجنوں مثنویوں کو کشمیری میں ڈھالا۔ اس کے ساتھ مغلوں اور افغانوں کے دور میں جو فارسی شعراء ایران اور وسط ایشیا سے کشمیر آئے وہ یہاں کی سحر انگیز خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان میں سے کئی یہیں آباد ہوئے اور یہیں پر ان کے آخری دن بھی گذرے۔ مزید برآں لاتعداد فارسی شاعروں نے سرزمین کشمیر کی فطری رنگا رنگی اور قدرتی حسن کے

دل آویز نظاروں کی مدح میں ہزاروں شعری تخلیقات قلم بند کیں۔ اسی طرح اردو زبان نے بھی کشمیری زبان وادب کو کئی لحاظ سے متاثر کیا اور اثر پذیری کا یہ خوشگوار سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کشمیر میں اردو شاعری کی تخلیق اور شاعروں کی بہتات کے ساتھ وادی کے اکثر اخبارات بھی اردو زبان ہی میں شائع ہوتے ہیں۔

کوئی بھی زبان اور وہ بھی جب زیادہ بڑی اور مقبولِ عام زبان نہ ہو اگر دوسری بڑی زبانوں کے مثبت اثرات قبول نہ کرے تو اس کی ترقی اور ہمہ گیر مقبولیت ممکن نہیں۔ غالباً آج شیکسپیر کا وجود نہ ہوتا اگر اس کے سامنے لاطینی، یونانی اور قدیم اطالوی ادب کے مالا مال خزینے نہ ہوتے جن سے اس نے اپنے کئی ڈراموں کے لیے خوشہ چینی کی ہے۔ برطانوی تاریخ نے بھی شیکسپیر کو رومیو اور جولیٹ جیسا ڈراما لکھنے کی تحریک دی۔ اصل میں اسے یہ ڈراما تصنیف کرنے کی لگن اس وقت ہوئی تھی جب اس نے ایڈمنڈ سپنسر کا ڈراما بعنوانِ فیری کوینی پڑھا تھا جو 1590ء میں منظرِ عام پر آیا تھا لیکن اس کا مرکزی خیال اُس نے آرتھر بروک کی رومیو اور جولیٹ سے لیا تھا۔ یہ کہانی اس سے قبل اطالوی زبان میں بنڈیلو ماٹیو (1485-1561) نے قلم بند کی تھی۔ شیکسپیئر نے اسی طرح بائبل کی کہانیوں سے بھی استفادہ کیا جس پر ایک عیسائی پادری ورڈ سورتھ نے اپنی دلچسپ کتاب شیکسپیئر اور بائبل میں بحث کی ہے۔

کشمیری زبان میں بھی اگرچہ شیکسپیر کے سبھی ڈرامے منتقل نہیں ہو سکے ہیں لیکن دینا ناتھ نادم نے جزوی طور پر اوتھیلو اور ناجی منور نے جولیس سیزر اور کنگ لیئر کا اس زبان میں مکمل ترجمہ کرلیا ہے۔ میں نے بھی 1975ء میں ساہتیہ اکادمی انعام پانے والی ضخیم کشمیری تصنیف گاشری مُنار (روشنی کے مینار) میں پہلی بار انگریزی کے اس عدیم المثال شاعر پر ایک مبسوط اور جامع

تحقیقی اور تنقیدی مقالہ لکھا ہے۔

انگریزی زبان کے دیگر شعراء اور ادباء میں سے غلام نبی فراق نے آسکر وائلڈ، پی بی شیلے، جان کیٹس، کولرج اور ٹینی سن کی چیدہ منظومات کا کشمیری ترجمہ کیا ہے۔

کشمیری زبان اور دیگر زبانوں کے ادب کا اشتراک عمل زیر نظر لایا جائے تو اس سلسلے میں راقم کا ارسطو کی بوطیقا اور یوری پیڈیز کی میڈیا کا کشمیری ترجمہ قابل ذکر ہیں اگرچہ یہ تراجم انگریزی ہی سے کیئے گئے ہیں۔

اسی طرح کشمیری ادب کا دامن عمر خیام، سعدی شیرازی، غالب، اقبال، ٹیگور، نذرالاسلام۔ احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی کی تخلیقات کے تراجم سے بھرا ہوا ہے۔

اگر زبانیں دیگر زبانوں سے اپنے ادب اور ثقافت کو متمول بنانے کی غرض سے اُن سے استفادہ نہ کریں تو ان زبانوں کے سکڑنے اور رفتہ رفتہ ان کے ختم ہونے کے امکانات کو خارج ازامکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جب گویٹے نے جرمن زبان میں حافظ شیرازی کے دیوان کا مطالعہ کیا تو وہ اس نوائے مشرق کی مدھر لے سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ خود اپنا دیوان مغربی تخلیق کیئے بنا نہیں رہ سکا جس میں فارسی زبان ہی میں کئی تراکیب اور نظموں کے عنوانات شامل کیئے گئے ہیں۔ گویٹے کا یہ دیوان مشرقی تصوف کے امتزاج سے تخلیق کردہ ایک لاجواب شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی نظم نغمۂ محمد اس بات کی نشان دہ ہے کہ کس طرح گویٹے مشرقی دنیا کی شرافت اور شائستہ روایات کا گروی ہو چکا تھا۔ اپنی ایک اور نظم ہجرت میں گویٹے نے بلبل شیراز کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

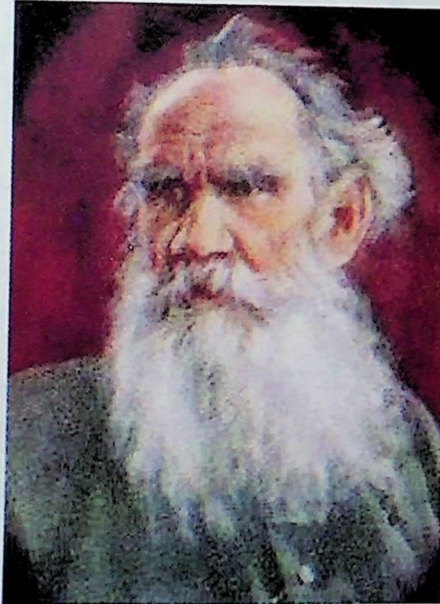
فی الحقیقت اپنی زندگی کے ساٹھ سال گذارنے کے بعد گویٹے اُس مغربی تہذیب سے اکتا گیا تھا جہاں انسانی اقدار اور اخلاقی روایات تیز رفتاری سے معدوم ہوتی جارہی تھیں اور ان کی جگہ انسانی بہیمت اور زندگی کا غیر اخلاقی عمل پروان چڑھ رہا تھا۔ اس حقیقت نے گویٹے کے حساس ذہن کو جھنجھوڑا اور اس کی نظریں مشرق کی بادِ صبا سے سرشار ہونے کے لئے اس سمت میں مرکوز ہوئیں جہاں انسانی سربلندی کی بنیادی قدریں اور اصول موجود تھے۔ اس پس منظر میں گویٹے نے بے ساختہ یہ اشعار موزون کیے:

> ''شمال اور مغرب اور جنوب ٹوٹ رہا ہے۔ تخت و تاج اچھل رہے ہیں اور حکومتیں تھرتھرا رہی ہیں۔ چلو! یہاں سے بھاگ چلو اور مشرق کی جانب کوچ کرو جہاں بااخلاق بزرگ تمہیں ضیافتیں پیش کریں گے!''

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ دیوان مغربی نے علامہ اقبال کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس نے گویٹے کے جواب میں پیام مشرق لکھی جسے اقبال کے فارسی کلام میں سب سے نمائندہ دیوان کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ایک فارسی دیوان نے ایک جرمن شعری مجموعہ کو تخلیق کیا اور یہ مجموعہ ایک اور فارسی مجموعۂ کلام کا باعث بن گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اگرچہ اقبالؔ فارسی کا بھی استاد تھا لیکن اس نے براہِ راست دیوان حافظ سے کوئی فیضان حاصل نہیں کیا اور نہ ہی یہ اُسے متاثر کر کے کسی اور تخلیق کے وجود میں آنے کا باعث بن گیا لیکن اسے گویٹے ہی کے کلام سے ایک قسم کی رغبت ملی اور اس طرح پیام مشرق جیسا ایک شاہ کار تخلیق ہوا۔ اقبال نے گویٹے کو اس شعر میں والہانہ طور پر خراجِ تحسین ادا کیا ہے:



ولیم شیکسپیر جس کے چند ڈرامے کشمیری میں منتقل کیۓ گیۓ ہیں



لیو ٹالسٹائی، جس کے مشہور روسی ناول "جنگ اور امن" کا کشمیری ترجمہ مظفر عازم نے کیا اور اسے کشمیر کلچرل اکیڈیمی نے 1974ء سے 1977ء تک تین ضخیم جلدوں میں شایع کیا

صبا بہ گلشن ویمرؔ سلامِ ما برسان
کہ چشمِ نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

کشمیر صدیوں تک بڑے مذاہب یعنی ہندو دھرم ۔ بدھ مت اور اسلام کا گہوارہ رہا ہے۔ ان مذاہب کے اثرات کو اہل کشمیر ہمیشہ فراخ دلی سے قبول کرتے رہے جس سے آخر پر کشمیریوں کے لئے ایک مخصوص طرزِ حیات کا نقشہ پیش کیا گیا جس کا عکس انسان کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو ایک خوبصورت تصویر کی شکل میں نمایاں کرتا ہے۔ ان قدروں میں قوت برداشت، ہر ایک کے لئے عزت و احترام۔ دلوں کی سرشاری اور معاشرے کا ایک سیکولر کردار شامل تھا۔

ان اقدار کو کشمیر میں ترویج و تشہیر دینے میں میر سید علی ہمدانی جیسی عظیم شخصیت کے کارنامے سب سے زیادہ نمایاں اور ہمہ گیر ہیں۔ حضرت ہمدان سے کشمیر تشریف لائے اور کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی میں اسلام کا فلسفۂ حیات پیش کر کے اہل کشمیر کو اپنی رضامندی سے اور بغیر کسی جبر و اکراہ کے مسلمان بننے کی ترغیب دی۔ جو اُس وقت ہندو راج میں ذات پات کے شکار ہو کر مختلف سماجی طبقوں میں بانٹے گئے تھے جن میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ اچھوتوں کا تھا جن کے ہاتھ سے اونچی ذات والے برہمن پانی پینا تک گناہ عظیم تصور کرتے تھے۔ میر ہمدانی کے ہمراہ اس کے سینکڑوں پیروکار اور عقیدت مند بھی کشمیر آئے اور یہاں قریہ قریہ شہر شہر جا کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ ان میں سے کئی اولیاء اللہ کشمیر ہی میں واصل بحق ہوئے جن کے مزار اور آستانے آج بھی کشمیریوں کے لیے روحانی سکون اور فکری آسودگی کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ کشمیری زبان نے، جس کا تحریری

ادب سات آٹھ سو سال سے زیادہ عرصے کا احاطہ کرتے ہوئے ہمارے پاس محفوظ ہے، بہتر طور پر اس فکری لین دین سے اپنے آپ کو تقویت بخشی ہے۔
آج ہمارے پاس عظیم کتب مثلاً لیو ٹالسٹائی کی جنگ اور امن، گورکی کی ماں، عمر خیام کی رباعیات، الف لیلہ، زین العابدین کی پیامبر، شیخ سعدی کی گلستان، ارسطو کی بوطیقا، دیوانِ غالب، ٹیگور اور ابسن کے کئی ڈرامے، یوری پیڈیز کی میڈیا اور بابا فرید، فیض، میتھو آرنلڈ، ٹی ایس ایلیٹ، ناظم حکمت، گاندھی اور سُمترا انندن پنت کی تخلیقات تراجم کی شکل میں موجود ہیں۔

میرے خیال میں کشمیری سے بڑی زبان اردو میں بھی جنگ اور امن کا ترجمہ موجود نہیں ہے جو کشمیری میں چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

کشمیری زبان اور ادب پر ہندو دیو مالا کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں جس کا اظہار کشمیری شاعروں مثلاً رسول میر، مہجور کشمیری، عبدالاحد آزاد، فاضل کشمیری، دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی اور کئی اور شاعروں نے بھی مہابھارت اور رامائن سے واقعات، تراکیب اور استعارے لے کر اپنے فن کو اور بھی خوبصورت اور معنی خیز بنانے کی کوششیں کی ہیں۔

میری اپنی دو نظمیں ''ریشمان'' اور ''وانا کھ وتھ'' (بھیانک راستہ) بھی یونانی اساطیر اور رامائن اور عہد نامہ عتیق کے پسِ منظر میں موزون ہوئی ہیں۔

☆☆☆

کشمیری میں عقیدتی ادب کے تراجم

یہاں پر عقیدتی ادب سے مُراد وہ چیدہ چیدہ حمد، منقبت، نعت، اور مراثی وغیرہ ہیں جو وقتاً فوقتاً کشمیری زبان میں منتقل کیئے گئے ہیں۔ کشمیری زبان کے مالا مال ادب میں اُس عقیدتی ادب کا بھی ایک اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے جو کسی نہ کسی طرح مذہب یا عقیدے کی ترویج و تشہیر کرتا ہو۔

یہ ادب کشمیر کے سازگار، خوشگوار اور پُر امن ماحول میں شاعروں اور ادیبوں نے سالہا سال تک ایک ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور یہ پیغمبروں، اولیاء اور اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کے تیئں والہانہ نیازمندی کا آئینہ دار ہے۔

تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے وادیٔ کشمیر اس قسم کے ادب کی تخلیق کے لئے ایک موزون ترین خطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے حکایت کے لحاظ سے کشمیر کو روحانی طور پر اپنی آماجگاہ بنانے کی خاطر ہزاروں ریشی اور فقیر لوگ یہاں بار بار آتے رہے ہیں۔

اسی پس منظر میں چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں اسلام کے اوّلین مبلغ حضرت سید میر علی ہمدانی المعروف شاہِ ہمدان کا ورود ہوا۔ جنہوں نے اس خطے کو اسلام کی تبلیغ اور تشہیر کے لیے منتخب کیا اور پھر یہیں پر اُن کے ہزاروں مرید اور پیرو کار وادیٔ کشمیر کے شہر و دیہات میں جا جا کر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔

عام طور پر کوئی بھی ادبی تخلیق یا فن پارہ ایک فن کار کے تخیل یا تجربے کا اظہار ہوتا ہے مگر عقیدتی ادب ایک ایسا مخصوص موضوع ہے جو اپنی خصوصیت اور انفرادیت کے لحاظ سے تخلیق کار کو اس کے تقدس اور تعظیم میں مقید کر کے رکھتا ہے۔ یہ موضوع خالقِ کائنات اللہ، اس کے پیغمبر اعظمؐ یا دیگر پیغمبروں یا دیگر مذاہب کے تاریخی یا حکایاتی کرداروں کا احاطہ کر لیتا ہے جن پر آسمانی صحائف نازل ہوئے ہوں۔ لل عارفہ کو غالباً سنسکرت زبان سے مکمل واقفیت نہیں تھی جو چودھویں صدی میں کشمیر کی اہم اور جانی پہچانی زبان تھی اور جسے کلہن ۔ بلہن اور جون راج کے بعد کھیمیندر، ابھینو گپت ۔ آنندوردھن اور دیگر کئی شاعروں، تاریخ دانوں، لسانی ماہروں اور تحقیق کاروں نے اپنے فن سے ایک اہم ترین کلاسیکی زبان کی صورت میں کشمیر میں قبولِ عام عطا کیا۔

لل عارفہ کی تنقیدی شاعری اگرچہ براہ راست ہندو دیو مالا کے اُن واقعات کے گرد گھومتی ہے جن سے لل کی عقیدت مندی کے جذبات کو حدت و حرارت ملی ہے مگر اس کا بھگوان شو کی مدح سرائی کرنا اور خدا کے ساتھ ایک ہونا عظیم ہندو مذہبی فلسفے کا بالواسطہ بیان ہے۔ جس کے پس منظر میں لل عشق الٰہی کے گہرے سمندر میں اس کی تہہ تک جا کر اور اس کی گہرائی کا اندازہ لگا کر خالقِ کائنات کو اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے جلوہ گر ہوتے ہوئے دیکھتی ہے۔

لل کے واکھوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسے ویدوں اور پورانوں کے عشق کی جذبات خیزی بھگوان کے ساتھ اُس عقیدت مندی کا واشگاف اظہار کرنے کی مغنیہ بناتا ہے جس کی بدولت وہ وحدانیت اور الٰہیت کو ایک عالمِ مستی کے لئے نچھاور کرنے کی ایک خوش قسمت دیالو بن گئی۔

شیخ نور الدین نورانی کے کلام کو تو کشمیری قرآن کہا جاتا ہے جو حضرت شیخ کے لئے اپنے دین کو اپنے دل میں آباد کرنے کی عقیدت کا برملا اظہار ہے۔

حضرت شیخ نے جو عقیدتی شاعری موزون کی اور جسے اس نے اشلوکوں یا مختصر نظموں کی صورت میں قلم بند کیا اس کا ماخذ بجائے خود قرآنِ پاک اور تاریخ اسلام ہے۔ اس پس منظر میں اس نے ایک مختصر نظم میں خلفائے راشدین کو اپنی رہنمائی کے قافلہ سالار بنا کے اس شعر میں شاہ ہمدان کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

نندہ ریش عرض کو رشاہِ ہمدانس
جنتس نیزیم پانس سیتی

(نندہ ریشی یعنی شیخ نورالدین نے شاہ ہمدان سے یہ التجا کی کہ وہ نندہ کو بھی اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں)

حبہ خاتون کی شاعرانہ دنیا لل عارفہ اور شیخ العالم کے روحانی اور وجدانی عالم سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ یہ دنیا عشق، رومان، شاہی عیش و عشرت اور بالآخر جدائی اور مُرغ زاروں اور جنگلوں میں ہجر کی آہ وزاری کی دنیا تھی۔ لہذا اُس کے کلام میں اُن تصورات کی آئینہ داری نظر نہیں آتی جن کی آنکھ سے اس نے خدائی نور کو دل کی نظروں سے دیکھ کر اس کی شعاعیں اپنے دامن میں بھر کر اسے دامن اہل فکر و نظر بنا لیتی۔

محمود گامی کشمیری زبان کا وہ بسیار گو شاعر تھا جس نے ہمارے سخن گوئی کے گلستان میں پھولوں کی نئی نئی اقسام کھلائیں۔ گامی کی شاعری میں پاسِ خدا اور عقیدت مندی کی سخن گوئی کا بھرپور تذکرہ اس مضمون میں ممکن نہیں ہے البتہ اگر اس کی مولانا جامیؔ کی ترجمہ کردہ مثنوی یوسف زلیخا ہی کو زیرِ بحث لائیں تو اس شہہ پارے میں اس کی عقیدت اور یقین کا بھرپور اظہار شدت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

محمود گامی نے کئی فارسی مثنویاں کشمیری میں ڈھالی ہیں جن میں لیلیٰ

مجنوں، شیرین خسرو، یوسف زلیخا وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں وہ اپنے مالک کے تیئں اپنی نیاز مندی کا اظہار ایک یا دوسرے طریقے سے کرتا ہے۔ گامی کی اسی قبیل کی دیگر تخلیقات یعنی نعت، منقبت، مناجات، ختمات اور پیروں اور خدادوست اولیا کے حضور اپنی قصیدہ خوانی اُسے اُن تمام کشمیری شاعروں میں ایک افضل مقام پر براجمان کرتی ہے جنہوں نے ہمارے عقیدتی ادب کی ہر طرح سے آبیاری کی ہے:

حمدِ بے حد نعتِ احمدؐ ہر صحیفس ابتدا
روز دماہ بوز عشقن سوز اے مردِ خدا

(ہر صحیفے کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ محمدؐ سے ہونی چاہیئے۔ اے مردِ خدا! ذرا بیٹھ اور سوزِ عشق کا حظ اٹھا)

یہاں اس بات کو دوہرانا ضروری ہے کہ روایتی طور پر تقریباً تمام فارسی مثنویات کا آغاز بادشاہ وقت کے قصیدے سے ہوتا آیا ہے لیکن اس کے برعکس کشمیری شاعروں نے یہ شروعات حمدِ خالق کائنات، نعت آنحضورؐ اور اولیائے کرام کی تعریف و تحسین سے ہی کی ہیں۔ یہ تصویر کشمیر کے معاشرتی نظام کی پاکیزگی اور اس کے شفاف منظرنامے کا ایک عکس ہے۔

ہمارے غیر مسلم شعراء بھی اپنے دھرم کے الہامی صحائف سے استفادہ کرتے ہوئے عقیدت اور یقین کا ادب کشمیری شاعری کے ادبی سرمائے کی امارت میں اضافے کا ذریعہ بناتے رہے۔ لیلائیں۔ بھجن اور شادیوں اور مذہبی تقریبات پر جو عقیدتی نغمے، روایتی گانے اور گیت کشمیری ہندوؤں کے گھرانوں میں گونجتے ہیں وہ بھی ہندو دیومالا اور مہابھارت، رامائن اور دیگر دھارمک تخلیقات سے استفادہ کا ایک خوبصورت اور دل نشین ردعمل ہے۔

پرمانند اپنے دھرم کے ازلی اور ابدی حسن کا متلاشی تھا اور اس طرح اُس

نے اس کی پیشانی کو رام لیلا کے جواہرات سے مزّین کرلیا۔ پرمانند کی امرناتھ یاترا، درخت اور سایہ اور کرم بھومکا وغیرہ اسی تلاشِ حق کا ایک والہانہ اظہار ہے۔صاحب کول نے رام اوتار چرت کو کشمیری میں منتقل کیا۔ پرکاش رام کوری گامی نے رامائن کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور رام کی ساری زندگی کو اپنی شاعری میں بیان کیا جس میں کشمیر کے حسین نظاروں کا شاعرانہ بیان بھی اس داستان کی بھرپور رنگ آمیزی کرتا ہے۔اس کے علاوہ ویشنہ کول نے بھی رامائن لکھی اور آنند رام اور نیلہ کنٹھ نے بھی یہ رزمیہ کشمیری زبان میں ڈھالا البتہ پرکاش رام کوریگامی کی تخلیق نے ان سبھی ترجموں پر برتری حاصل کرلی۔کرشن جوراڑوان نے عقیدتی ادب کو شو پوران اور شومہاپوران کا ترجمہ کر کے اور وسعت بخشی۔ وہ کہتا ہے کہ بھگوان شو اور شکتی کا میل ایسے ہوا گویا ایک ایک کنول کا پھول ہزاروں پھول کھلاتا رہا۔

ہماری صوفی شاعری بھی عقیدتی ادب کی گونا گون اصناف سے آباد ہے۔کشمیری میں شاذونادر ہی ایسا کوئی صوفی شاعر ہوگا جس نے اپنے کلام کے ذریعہ خالق کائنات اور پیغمبر آخر زمان کو خراج عقیدت پیش نہ کیا ہو۔ یہ عجز و انکساری انہیں قرآن پاک کے مطالعہ سے ہی ودیعت ہوئی ہے۔احمد بٹواری جب راجہ اندر کے دربار میں پرستان کے نغمے سُنتا ہے تو وہ اس میں سوزِ منصور کی بھی آمیزش دیکھتا ہے اور اس طرح سے اس کی یہ شاعرانہ تخلیق حکایت اور حقیقت کا ایک خوبصورت امتزاج بن جاتی ہے۔ہماری صوفی شاعری میں شاستروں، ویدوں اور دیگر الہامی کتب کا بھرپور استفادہ بھی موجود ہے۔

کشمیری زبان کے نعتیہ ادب کی جو آبیاری عبدالاحد نادم، عزیز اللہ حقانی، ولی اللہ متو، ثنا اللہ کریری اور اُن کے بعد غلام رسول نازکی اور فاضل کشمیری نے کی اُس کا منبع بھی فارسی، عربی یا اردو کا وہ ادب ہے جسے عقیدت

مندی کا ادب کہا جاتا ہے۔ ثناء اللہ کریری کہتا ہے:

ہا واوہ واتکھنا تو تے یتہِ ڈاف تراوُتھ مصطفیٰ

احوال میانی تس وَنکھ سۓ ہو کریم وادین دوا

یہ براہِ راست مولانا جامی کی ایک مشہور نعت کے اس شعر کا ترجمہ ہے:

نسیما جانب بطحا گذر کُن

زاحوالم محمدؐ را خبر کُن

کشمیری نثر میں بھی وقتاً فوقتاً دیگر زبانوں سے ترجمہ شدہ ایسے شہکار موجود ہیں جن کی بدولت کشمیری زبان کو بالیدگی اور تنوّع حاصل ہوا ہے۔ مرحوم شمس الدین احمد نے زین العابدین راہنما کی مشہور عالم سیرتی کتاب پیامبر کا حیات النبی کے نام کے جو ترجمہ کیا وہ میری نظروں میں ہمارے سبھی عقیدتی ادب کے ترجموں میں نثر کی دنیا میں ایک بے مثال فن پارہ ہے۔ اس عمل میں شمس الدین کی ذاتی عقیدت اور عشقِ محمدؐ کا شدید جذبہ بھی شامل ہے اسی لیے محسوس ہوتا ہے کہ تین جلدوں میں شائع شدہ یہ ترجمہ گویا کشمیری الاصل ہی میں لکھا گیا ہے۔ اس عقیدت اور عشق رسولؐ کا والہانہ پن مترجم کو اس ترجمہ کی ترغیب دیتا ہے ورنہ فارسی زبان کے اس عالم و فاضل نے اس کے بجائے گلستانِ سعدی، دیوانِ حافظ یا مثنوی رومی ہی کو اس حوالے سے منتخب کر لیا ہوتا۔

ہمارے عقیدتی ادب میں مرثیہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے جو خاص طور پر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی شہرہ آفاق مراثی سے متاثر ہو کر کشمیری مرثیہ نگاروں نے اپنی زبان میں شامل کر لیا ہے۔

کشمیری کے ہم عصر شاعروں میں مرزا عارف، نازکی اور فاضل کا کلام زیادہ سے زیادہ نعت گوئی کا فن ادا کرتا ہے۔ مرزا عارف نے حضرت شاہِ ہمدان کی چہل اسرار کا ترجمہ کیا جس میں حضرت کی معرفت سے سرشار وہ چالیس

غزلیں شامل ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاہ ہمدان نے اپنے اُن چالیس احباب کے گھروں میں تخلیق کیں جنہوں نے شاہ ہمدان کو ان گھروں میں دعوت پر بُلایا۔

ولی اللہ متو نے بھی اس صحیفۂ عرفان کا کشمیری ترجمہ کیا جو 1360 ہجری میں شایع ہوا مگر اس کے اکثر اشعار محض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ کشمیری میں منتقل کئے گئے ہیں اور ان میں کسی طرح کی شاعرانہ لطافت اور نزاکت نظر نہیں آتی ہے۔ مثلاً:

قبلۂ دل آفتابِ روئے اوست
کعبۂ جاں خاکِ راہ کوئے اوست

اور اس کا بے جان ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

قبلۂ دل مہر روتس یارہ سُند
کعبۂ جاں خاکِ کوتس یارہ سُند

اس کے علاوہ غلام محمد شاد نے بھی چہل اسرار کا کشمیری ترجمہ کیا ہے۔

کشمیر میں واقع ہزاروں مسجدوں، درگاہوں اور سینکڑوں منادر کی موجودگی کی برکت سے بھی وادی میں عقیدتی ادب کے تخلیقی سلسلے کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری میں خدا پرستی، دین فہمی اور مذہب شناسی کا جو ایک وافر ذخیرہ موجود ہے اُسے کشمیری میں پہلے ہی منتقل کیا جا چکا ہے۔ یا یہ کہ اس کے زیر اثر لہجۂ اقبالؔ میں بھی اس قسم کا ادب کشمیری میں جلوہ گر ہے۔

فاضل کشمیری کے عقیدتی ادب میں تقریباً سارے مذاہب کا رنگ جھلک رہا ہے۔ جن آسمانی صحیفوں سے فاضل نے اثر قبول کیا ہے ان میں انجیل مقدس، گورو گرنتھ صاحب، رامائن وغیرہ شامل ہیں جن میں سے شاعر نے حضرت سلطان العارفین کو ایک واقعہ کے حوالے سے یہ خراج پیش کیا ہے۔

چھہٗ سلطان سون بناوان کوہِ ماران

چھہٗ یتھ ہیو کیمیا گر پوز مسلمان

(ہمارا سلطان سونا بناتا ہے۔ اُسی جیسا کیمیا گر سچا مسلمان ہے)

دینا ناتھ نادم نے بھی خدا کے بزرگ بندے اور ولی کامل شیخ نورالدین کو ایک نعتیہ نظم میں یہ خراج پیش کیا ہے:

ننی تن وزہِ وزہِ لج و بتھ واوس

ہاریشہ لاگے ناوس پوش

غلام رسول نازکی نے جو قابل ستائش اضافہ کشمیر کے نعتیہ ادب میں کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس مقالے کے اختتام پر اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ مولانا جامی کی چار مصرعوں والی معنی آفرین نعتیہ رباعی اس مصرعے سے شروع ہوتی ہے:

یا صاحب الجمالِ ویا سید البشر

نازکی صاحب نے ان چار مصرعوں پر کشمیری، فارسی اور اردو میں گیارہ مصرعوں کی تضمین کی ہے جن میں سے یہاں کشمیری تضمین کے آخری تین مصرعے پیش کیے جاتے ہیں:

وانج پھٹم زبان وٹم کتھ کھٹم مگر

خاموش آہ و نالہ چھُ آخر کران اثر

ہر دس بنیم میہ سونت میہ کُن تراو اکھ نظر

یا صاحب الجمال ویا سیدّ البشر

☆☆☆

گوئٹے اور ''دیوان مغربی''

عیسوی سن کے 1749 سال میں 28 اگست کی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ جرمنی کے شہر فرانکفورٹ میں اٹھارہ سالہ الیزبتھ کے یہاں ایک بے حس سا بچہ پیدا ہوا۔ اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مر چکا ہے۔ بقول تھامس مان '' یہ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے یہ نومولود ماں کی گود سے نکل کر سیدھا زمین کی گود میں چلا جائے گا''۔ لیکن اس کے روئی کے گالے جیسے جسم میں رفتہ رفتہ حرکت ہونے لگی۔ بعد میں تھامس مان نے اسی بچے کے بارے میں کہا ''کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ادبی شخصیت کی بلندی اور شان کن کن سرحدوں کو چھو لے گی''۔

یہ تھا یوہان وولف گانگ وان گوئٹے جو وقت گذرنے کے ساتھ نہ صرف سرزمینِ المانیہ کا بلکہ سارے یورپ کا ایک ممتاز اور عدیم المثال شاعر، ڈرامانگار، فلسفہ دان، انشا پرداز اور ناول نویس بن گیا اور ان فنون لطیفہ میں اس نے اپنے فنی کمال کے موتی بکھیرے ہیں۔ یہ ساری خصوصیات اس میں اس وجہ سے سمٹ کر آئی تھیں کہ اس کا مطالعہ وسیع تھا اور اسی لئے وہ کہتا ہے:

Wer nicht von dreitausend jahren
Sich wieB Rechenchaft zu geben



گوئٹے کی سب سے زیادہ پسندیدہ تصویر جو اُس کے اٹلی کے سفر کے دوران88- 1786ء میں کھینچی گئی

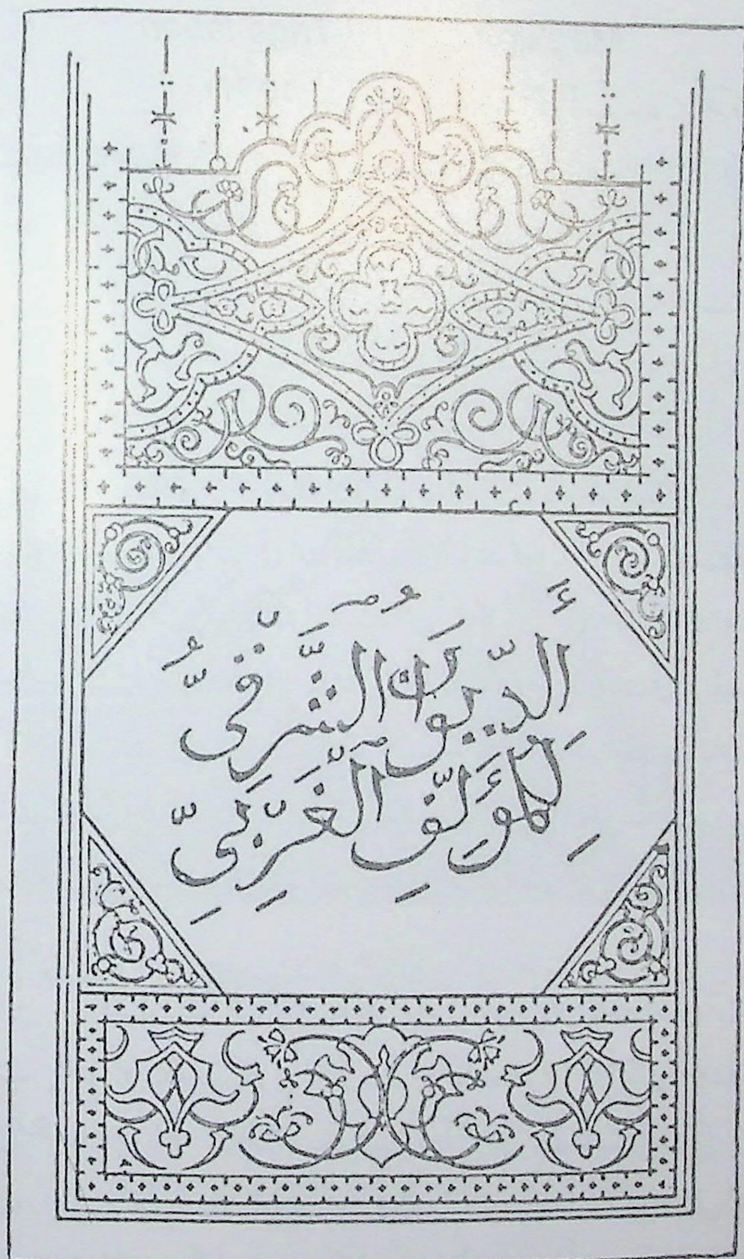
Blieb' im Dunkel unerfahren

Mag von Tag zu Tage laben

(اگر گزشتہ تین ہزار سال کی تاریخ آپ کے زیر نظر نہیں ہے تو آپ کے ذہن کی تاریکی کبھی چھٹ نہیں سکتی اور پھر آپ کو صرف ایک ایک دن کے لئے جینا ہوگا)

گویٹے کے سبھی ادبی کارناموں میں اس کا لافانی شاہکار فاؤسٹ سرِ فہرست ہے۔ اس تخلیق میں شاعر نے فاؤسٹ کے کردار کو بدی اور نیکی کی دیرینہ لڑائی کو بے حد پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ فاؤسٹ اپنی ہوسناک زندگی کے لئے ہر طرح کی سرشاریاں اور شادمانیاں حاصل کرنے کے لئے دیوانگی کی حد تک بے قرار ہے اور اپنی ان دُنیوی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ شیطان کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے لیکن آخر کار فتح الٰہی صداقت اور ابدی انسانیت کی ہی ہوتی ہے۔ علامہ اقبال ان الفاظ میں اس ڈرامے کی تعریف و تحسین کرتا ہے۔ ''اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا'' (1)۔

گویٹے نے بلبل شیراز حافظ شیرازی کے دیوان کا وہ جرمن ترجمہ جب پڑھا جو جوزف ہیمر پرگستال نے کیا تھا اور جو 1814 میں دو جلدوں میں منظر عام پر آیا تو اس ترجمہ نے گویٹے کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دئے جو ایک آیئنہ کی طرح اُس کے سامنے تھی اور اس میں اُسے اپنے خیالات و محسوسات کے گونا گون جلوے دکھائی دے رہے تھے۔ ملک کے سیاسی حالات سے دل برداشتہ ہوئے گویٹے کو امن، سکون، اطمینانِ



عربی رسم الخط میں دیوانِ مغربی کا صفحہ ٔ اول جو گویٹے نے 1819ء میں بقلمِ خود لکھا

قلب اور زندگی کی ایک نئی تصویر چاہیے تھی جو اُس نے فقط حافظ کی شاعری میں پائی۔ وہ مغرب کی مادی اور دُنیوی ترجیحات سے بیزار ہو کر مشرق کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا لگا گویا مشرق میں بلند اخلاقی قدروں سے بھرپور، انسانی اخوت سے سرشار اور نیکیوں کی خشبو سے معطر ایک ایسی دنیا برابر آباد ہے جو اس کے درماندہ اور سرگران فکر و ذہن کو جاودانی طمانیت عطا کر سکتی ہے۔ دیوانِ مغربی کے انگریزی مترجم جان ویلے کے بقول: ''دیوانِ مغربی کی تخلیق کے پسِ پردہ چند اہم واقعات بھی اس کے محرّک بن گئے۔ جب اکتوبر 1813ء میں لیپزگ میں جنگِ اقوام چھڑ گئی تو گوئٹے کے ہاتھ میں غیر متوقع طور پر کاغذ کا ایک ورق آ گیا جو ویمر کے سپاہیوں نے جنگِ ہسپانیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر عربی اور فارسی میں قرانِ پاک کا سورۃ النّاس لکھا ہوا تھا۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اعظمؐ سے فرماتا ہے۔'' قُل اعُوذ بربّ النّاس ملك النّاس اله النّاس من شرّ الوسواس الخناس الّذی یُوسوِسُ فی صدُور النّاس مِنّ الجنّته والنّاس۔ '' کہہ دے اے رسول اللہؐ! میں مالکِ کائینات سے پناہ مانگتا ہوں اُس شیطان کے شر سے جو لوگوں میں وسواس ڈالتا ہے خواہ یہ وسواس پیدا کرنے والا جن ہو یا انسان''۔

گوئٹے اس کلام اللہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی تشریح اُس کی اپنی زندگی کی تصویر بن گئی۔ اُس کی نظروں میں ''مشرقی علوم کا مطالعہ ایک ایسی ہجرت کے مانند تھی جس کی بدولت ایک شخص حال سے فرار اختیار کر کے دور دراز زمان و مکان کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے جنت جیسی فضا اور ماحول نصیب ہوتا ہے۔(2)

یورپی ریاست جرمنی سے گوئٹے کے اس مختلف رنگ اور آہنگ کے دیوان کا مشرقی ادبیات کو ایک بیش بہا تحفہ اقبال کے سب سے اہم اور معتبر

فارسی مجموعہ کلام پیامِ مشرق کی صورت میں حاصل ہوا جس کی تصنیف کے محرکات کو اقبال نے خود بیان کرتے ہوئے گوئٹے کی مشرق نوازی کے پس منظر کو اس طرح واضح کیا ہے۔ ''پیامِ مشرق کا مدعا جو مغربی دیوان کے سو سال بعد لکھا گیا زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقایق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کی اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں جو ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے... مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں منتقل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے جسے قران نے انّ اللہ لا یغیر ما بقومِ حتی یغیر واما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدّ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے''۔(3)

اقبال نے یہاں پر دیوانِ مغربی پر اسرائیلی شاعر ہائینے کا یہ تبصرہ دوہرایا ہے کہ ''یہ ایک گلدستہ ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے۔ اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے میں حرارت کا متلاشی ہے''۔

پیامِ مشرق میں اقبال نے جگہ جگہ گوئٹے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

صبا بہ گلشن ِ ویمر سلامِ ما برسان

کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیارافروخت

علامہ نے مولانا رومی کی زبان سے بھی شاعرِ المانوی کو اُس وقت تعریف وتوصیف سے نوازا ہے جب گویٹے جنت میں مولانا کو فاوسٹ کا قصہ سناتا ہے تو رومی اُس سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:

فکرِتو در کنجِ دل خلوت گزید

ایں جہانِ کہنہ را بازآفرید

سوز وسازِ جاں بہ پیکر دیدۂ

در صدف تعمیرِ گوہر دیدۂ

ہر کسے از رمزِعشق آگاہ نیست

ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

داند آں کونیک بخت ومحرم است

زیرکی زابلیس وعشق ازآدم است

اسی طرح وہ ایک جگہ غالب کو گویٹے سے مشابہت دے کر اُس سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

آہ تواجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے

گلشن ِ ویمر میں تیرا ہم نواخوابیدہ ہے

دیوانِ مغربی میں گویٹے نے مشرقی تلمیحات، مقامات اورافراد کے اسمائے خاص سے نہ صرف استفادہ کر کے حاتم، زلیخا، بلبل، آدم، فتویٰ، فردوسی، رومی، ہدُہدُ جیسے فارسی ناموں کا استعمال کیا بلکہ دیوان کے الگ الگ ابواب کے عنوانات بھی حافظ کے والہانہ اثر میں آکر پارسی نامہ، مُغنّی نامہ، حافظ نامہ، عشق نامہ، تفکیر نامہ، رنجش نامہ، حکمت نامہ، تیمور نامہ، زلیخا

نامہ، مثال نامہ، خلد نامہ اور ساقی نامہ رکھ لئے۔

گویٹے کے مشہورِ عالم فاوسٹ کے اگرچہ کئی تراجم اردو زبان میں موجود ہیں جن میں ڈاکٹر عابد حسین اور مولوی عبدالقیوم خان باقی کے فاوسٹ حصۂ اول کے تراجم قابل ذکر ہیں، مگر دیوانِ مغربی کا مکمل اور مبسوط اردو ترجمہ (غالباً) نہیں ہوا ہے۔ پاکستان کے میاں غلام قادر نے آج سے کچھ عرصہ قبل اس کی چند منظومات کا نثری ترجمہ کیا جو اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے سہ ماہی مجلّہ 'ادبیات' کے جلد 12، شمارہ 48,49,50 برائے سال 1999 میں شایع ہوا۔

اسی طرح **Goethe, Iqbal and the Orient** نام کی محمد اکرام چغتائی کی انگریزی تصنیف میں کسی ثاقب رزمی کے گویٹے کی ایک نظم کے ترجمے کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جو ہمارے پاس دستیاب نہیں ہے۔لہٰذا 'اکادمی' سے ہی یہاں گویٹے کی تین اہم نظموں کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

(1) بہشت کا مژدہ پانے والے

(تاروں بھری رات، غزوۂ بدر کے بعد)

حضور ﷺ کی آواز:

دشمنِ ایمان کافر کو اپنے ساتھیوں کی موت کا ماتم کرنے دو
مشرک اب وہاں پڑے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا
جہاں تک اپنے بھائیوں کا معاملہ ہے
اُن کی شہادت پر ماتم کرنے کی ضرورت نہیں
وہ اس وقت تاروں کے جہاں میں مقیم ہیں

سات فلک اُن کے انتظار میں آغوش وا کیئے ہوئے ہیں

اور یہ اپنی بہترین صورت ہے

جنت کے دروازے پر خود اعتمادی سے دستک دے رہے ہیں

اُن کے لئے جو کچھ وہاں موجود ہے

وہ کبھی اُن کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا

میں ان حالات کا بچشم خود مشاہدہ کر چکا ہوں

وہ معراج کا موقعہ تھا جب میں بُراق پر سوار تھا

اور تا حدِ نظر پھیلی کائنات کے عجائبات کے مشاہدے میں مگن تھا

ان عجائبات میں سے کئی راحت افزا، سایہ فگن اشجار تہہ در تہہ

ثمر ہائے خوش ذائقہ اور گل ہائے رنگا رنگ کو ڈھانپے ہوئے ہیں

مشرق سے جو دلنواز ہوا چلتی ہے

حوروں کا ملکوتی نغمہ اُس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے

اور حوریں بھی ایسی روح پرور کہ اُن کی ایک جھلک سے ہی تُم مسحور ہو کر رہ جاؤ

وہ ہر آنے والے سے دریافت کرتی ہیں:

بھلا تم نے اس جہان میں کون سا ایسا معرکہ سر کیا

جو بہشت کے حقدار ٹھرائے گئے؟

کیا تم نے بڑے بڑے منصوبے بنائے؟

ملک فتح کیئے؟ جنگیں لڑیں؟

ویسے تو تمہارا یہاں تک پہنچنا ہی اس بات کی شہادت ہے

کہ تم کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے کر یہاں آئے ہو

تاہم یہ تو بتاؤ تم کر کیا آئے ہو؟

ہمیں تو یہی کچھ جاننے کا اشتیاق ہے

ہاں، ایک چیز تو تمھارے رِستے زخم سے صاف عیاں ہے
بالکل ایسے ہی واضح جیسے کتبہ کی کوئی عبارت
تم شہادت کی ناقابل بیان مسرت چکھ چکے ہو
بھر کیف وارفتگی کے وہ نایاب لمحے تو گزر چکے
اب تو تمہاری کہانی بیان کرنے کے لئے تمہارے زخم ہی کافی ہیں
شاعر: حضور! اگر آپ اپنی نظر کرم فرمائیں
تو بغیر کسی حیل وحجت کے مجھے جنت میں داخل کروا سکتے ہیں
میں نے بھی اپنی زندگی مردانہ وار گزاری ہے
آپ ذرا میرا سینہ تو ملاحظہ فرمائیے
یہ زخموں سے فگار سینہ آپ کو حیران و پریشان کر دے گا
زندگی کی ناہمواریوں نے مجھے بھی کاری زخم عطا کئے ہیں
اور میری کامیاب محبت کی جنونی کیفیت کے زخم ان سب پر مستزاد!
میں عمر بھر اپنی خوش اعتقادی کے گیت گاتا رہا
اور کہتا رہا میرا محبوب میرا رمز آشنا ہے
دنیا چاہے میری کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے
مجھے دنیا والوں سے کوئی گلہ نہیں
میں نے زندگی بھر تکمیل انسانیت کی تگ ودو کی ہے
زمانہ بھر کے جگر افروز عاشق مجھ سے واقف ہیں
حضور! از راہ کرم میری طرف اپنا دستِ شفقت بڑھائیے
تاکہ میں بھی آپ کے لطف وکرم سے حیاتِ جاودانی حاصل کرلوں۔

(2) ہجرت

شمال، مغرب، جنوب میں زلزلے طاری ہیں
تخت وتاج ٹوٹ رہے ہیں
سلطنتیں زمین بوس ہو رہی ہیں
چلو مشرق کی سمت ہجرت کریں
جہاں معزز انسانوں کی طرح ہماری پذیرائی ہوگی
وہاں محبت، سرور اور نغمہ کی ایک الگ دنیا آباد ہے
وہاں خضر کے چشمۂ حیات سے دائم شباب پھوٹ رہا ہے
وہ صحیح بصارت اور درست بصیرت کی سرزمین ہے
وہیں ہمیں صحیح طور پر اس بات کا ادراک ہوگا
کہ اقوام اول اول کیسے وجود میں آئیں
اُن کی تشکیل کیسے ہوئی
وہ کون سا جان فزا لمحہ تھا جب انسان نے ارضِ خدا پر
خالقِ کائنات کے کلام کو گوش سے سنا
یہ مشرق ہی ہے جس نے اپنے بزرگوں کی کماحقہ عزت کی
ناپسندیدہ بیرونی اثرات کو رد کیا
وہاں جا کر میں نوجوانوں کی بغاوت سے کنارہ کش ہو جاؤں گا
اور بزرگوں کے زیرِ سایہ رہ کر اپنے شباب کی زیردستی قبول کروں گا
وہی الفاظ قدر و قیمت کے حامی ہیں
زبان وہی کہتی ہے جو دل میں ہوتا ہے
قہوہ، شال اور کستوری کا بیوپار کرتے ہوئے

میرے قدموں تلے منڈیوں تک جانے والی ہر صحرائی رہ گزر ہوگی
ہاں! میں بلند و بالا اور غیر آباد چوٹیوں پر
حافظ (حافظ شیرازی) کی خوشگوار یاد سے
سامانِ نشاط حاصل کروں گا
میرے محترم حافظ! تیرا تصوّر بے حد بابرکت ہے
میں تجھے چشموں کے کنارے اور کارواں سراؤں میں
بڑے پیار سے یاد کیا کروں گا
اس وقت جب میرا محبوب اپنی عطر بیز اور عنبریں زلفیں بکھیرے
شمعِ محفل بن کر ناز و ادا دکھانے میں مصروف ہوگا
بے شک شاعر کی دل دوز نوا سے تو حوریں تک وجد میں آجاتی ہیں
دوستو! تمہارے جذبۂ رقابت کو میری بات اچھی نہ لگے
اور میرے انمول جذبات کا یہ اظہار تمہیں بے حقیقت لگے
تو عفو و درگزر سے کام لینا اور یاد رکھنا کہ
شاعر کی زبان عام لوگوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے
شاعر کا کلام تو عرش بریں تک کو چھو لیتا ہے
اُسے ہمیشہ عالم جاوداں کی تلاش رہا کرتی ہے!

(3) صدائے بازگشت

مکالمۂ حور و شاعر۔ جس کے جواب میں حضرت علامہ اقبالؒ نے
"پیام مشرق" میں اپنی مشہور نظم "حور و شاعر" رقم کی)

حور: وہ کیسی دلنواز گھڑی تھی جب میں نے پہلی بار تیرا جاں فضا نغمہ سنا
اُس روز میں حسب معمول سرحدات پر تعینات تھی

آج ایک بار پھر میں نے فضا میں سرسراہٹ محسوس کی
اور دھیمی دھیمی سرگوشیوں سے مجھے گمان ہوا جیسے تیری آمد آمد ہو
مگر کچھ دیر کے بعد یہ سرگوشیاں دم توڑ گئیں
اور سرحد پار سے یہاں کوئی داخل نہیں ہوا
اس وقت صرف تیری گم گشتہ یاد باقی ہے یا وہ جانفزا نغمہ
جس کی صدائے بازگشت مجھے صاف سنائی دے رہی ہے!
شاعرِ عزیز از جان حور! تیری نوائے شوق سے پوری کائنات وجد میں آ گئی ہے
تیرے مشاقانِ دید دیوانہ وار تیری طرف لپک رہے ہیں
زمین و آسمان کی جملہ مخلوق کی یہ آرزو ہے
کہ نبی پاک کے صبا رفتار براق کی مانند مائل پرواز ہو کر
اس در پر حاضر ہو جہاں تو موجود ہے
تیرے دیگر احباب کی طرح میں بھی متمنی ہوں کہ تیرا سحر انگیز نغمہ
مجھے بھی آشنائے راز کرے
اگر تیری ہم نوا سہیلیاں اس منظر کا مشاہدہ کریں تو
زمین والے بجا طور پر ان کی توجہ اور التفات کے مستحق ہیں
وہ توقع رکھتے ہیں کی انہیں بھی حوروں سے حسین ملاقات کی حلاوت محسوس ہو
انہیں بھی بقدرِ ظرف اس کی اشد ضرورت ہے
تا کہ وہ بھی دونوں جہانوں میں کامران و بامراد ہوں
حوروں کی یہ رفاقت روئے زمین پر
ان کی پیہم کوششوں کا ثمر ہوگی
اور وفا اور الفت کا احساس ان کا دائمی سرمایہ حیات ہوگا!
حورِ با تمکین! اگرچہ تو میرا مقدر ہے مگر میں یہ ہرگز نہیں چاہتا

کہ تو بہشت کی ابدی راحت سے محروم ہو کر میرے پاس آئے
اچھا یہ ہے کہ تو میرا انتظار چھوڑ کر اپنی کسی بہن کو نعم البدل کے طور پر
روئے زمین پر بھیج کر میرے دکھ درد کا مداوا کرے!

شاعر: تیرا پیار بے حد کیف وسرور کا حامل ہے
میں اپنی بے کیف تنہائیوں میں ضرور اس نکتہ پر غور کروں گا
لیکن سچ سچ بتا کیا زمین کے بدلتے رُت بھی تیرے وجود کا حصہ رہے ہیں
در حقیقت مجھے بعض اوقات احساس ہوتا ہے
اور میں قسم اٹھا کر اس کا ثبوت بھی مہیا کر سکتا ہوں
کہ روئے زمین پر تو کبھی زلیخا کے روپ میں جلوہ گر تھی!

حور: ہم سب کو آگ، پانی، مٹی اور ہوا سے تخلیق کیا گیا ہے
لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ زمین کی آب وہوا
ہمیں بھی راس نہیں آئی!
اسی لئے ہم نیچے انسانی مخلوق کے پاس نہیں جاتے
ہاں جب وہ یہاں آتے ہے تو ہمارا وقت ان کی صحبت میں گزرتا ہے
شاید تمہیں معلوم ہو کہ اللہ کو ماننے والے جوق در جوق یہاں داخل ہوتے ہیں
ان سب کو ان کے رسولؐ کی شفاعت نصیب ہوتی ہے
وہ آتے ہی یہاں بہشت میں متمکن ہو جاتے ہیں
اور پھر ان کا حق بنتا ہے کہ ہم ان کی راحت کا خیال رکھیں
ہمارے حسن وجمال کی تو اللہ نے خود تعریف فرمائی ہے
فرشتوں کی تو ہم پر نظر بھی نہیں پڑی!
اس سب کچھ کے باوجود ایک، دو، تین (یہاں تعداد کی کوئی قید نہیں)
اور روئے زمین پر بھی تو ان لوگوں کی ایک منظور نظر تھی

اگر ہم سے اس کا موازنہ کیا جائے تو بے حد کم عیار و کم قیمت ثابت ہوگی
پھر بھی یہ حضرت ہمیں ہی کم تر سمجھنے میں عار محسوس نہیں کرتے
چاہے، ہم کتنی ہی حسین، خوش مزاج اور حاضر جواب کیوں نہ ہوں!
روئے زمین پر نہ جانے ابھی کتنے مسلمان ہیں جنہیں یہاں آنا ہے
حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ طرز عمل سوہان روح تھا
ایک بار حضور نبی کریمؐ براق پر تشریف فرما زمین کی طرف جا رہے تھے
ہم ان کی طرف برابر دیکھتے رہے مگر انہوں نے ہم پر نگاہ تک نہیں ڈالی
ہم نے حضورؐ کا تعاقب کیا اور ذرا سی دیر کیلئے براق کا محاصرہ کرلیا
حضو نبی کریم بے حد شفیق مگر سنجیدہ تھے
ان کا انداز سراسر پیغمبرانہ تھا
انہوں نے چند مختصر ہدایات جاری کیں
اور پھر کسی کو ان سے اختلاف رائے کا یارا نہ رہا!
یہی وہ لمحہ تھا جب ہم نے تمہاری طرح سوچنا شروع کیا
اور دل میں فیصلہ کرلیا کہ اب ہم نے تمہارا محبوب اور منظور نظر بن کر رہنا ہے
یہیں ہماری خود پسندی اور خود بینی دم توڑ گئی
ہم میں سے ہر ایک نے اپنے احتساب کے بعد اپنے آپ کو قائل کرلیا
کہ بہشت کی ابدی زندگی میں کسی کو بھی
خالق کے اٹل احکامات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں!
اب ہم میں سے ہر ایک اسی سوچ کی حامل ہے
وقت کا دھارا پہلے کی طرح بہہ رہا ہے
ہم میں سے کسی کا رنگ گندمی ہے کسی کا گلابی
ہماری اپنی چاہتیں ہیں، اپنی رقابتیں

اور کبھی کبھی ایسا طرزِ عمل جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے

(اس شخص کو دیکھو)

وہ بظاہر بالکل پرسکون اور محوِ راحت ہے

اس (ایک شخص) کے مشاہدے سے ہمارے متعلق

لوگوں کا حسن ظن بڑھ رہا ہے

اور ہمارے حسن اور ہماری شگفتہ مزاجی میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے

جب جنت کے مکین اس تھوڑے پر اس قدر مطمئن ہوں

گویا حقیقت بس یہی کچھ ہے!

لیکن اے شاعر خوش بیاں! تیرا مزاج قدرے آزادانہ ہے

بلاشک میں ایک بہشتی مخلوق ہوں

میرے لئے تیرا دیدار اور تیری چاہت کسی اعزاز سے کم نہیں

تاہم حقیقت یہ ہے کہ میں روئے زمین کی زلیخا نہیں

یہ اور بات ہے کہ حسن کے اعلیٰ مراتب پر فائز تیری زلیخا

سر سے پیر تک مجھ بہشتی حور سے مشابہ ہو!

شاعر: تم بہشتی چمک دمک سے میری نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی ہو

مجھے معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے یا فریب نظر؟

میرے پاس تمہاری تعریف وتوصیف بیان کرنے کیلئے

موزون الفاظ نہیں کہ اس وقت ایک حور باتمکین

ایک حزن کو مسرت بخشنے کے لئے، شاعری کی مروجہ روایات

سے ہٹ کر رطب اللسان ہے!

حور: بہتر یہی ہوگا کہ تم یونہی غزل سرائی کرتے ہوئے

زمین کی طرف لوٹ جاؤ میں تمہارے خلوص کی مداح ہوں

جتنی مخلوق کو سچائی اور خلوص ہی پسند ہے
رہے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے جنہوں نے دنیا میں کبھی سرکشی نہیں کی
یہاں آکر ان کا لب و لہجہ ذرا کھردرا بھی ہو تو ہمیں افسوس نہیں ہوتا
بہشت میں سچے اور کھرے جذبات کی ہمیشہ قدر کی جاتی رہی ہے
ہمیں ہر وہ چیز پسند ہے جس میں کسی قسم کی آلائش نہ ہو!

حور: پیارے شاعر! تمہاری انگلیاں اب تک مجھے چھو رہی ہیں
کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم نے باہم گفتگو میں کس قدر وقت صرف کیا؟

شاعر: مجھے وقت کے گزرنے کا قطعی احساس نہیں اور نہ ہی مجھے اس کی
کوئی پرواہے اس وقت میں جس روحانی کیف و سرور سے گزر رہا ہوں
اور جس اچھوتی اور پائیدار محبت سے میرا واسطہ ہے اس کا لمحہ لمحہ انمول ہے!

حور: اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہاری شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے
جو تمہیں مدہوش کر کے زمان و مکان سے بے نیاز کر دیتا ہے
ایسے نایاب لمحات میں تمہاری جرأتِ رندانہ تمہیں فرش کی پستیوں سے اٹھا کر
عرش کی بلندیوں تک لے جاتی ہے!
اب اگرچہ تم اپنی محبت کو نہیں بھولے
لیکن کیا تمہارا گیت ابھی اختتام پذیر نہیں ہوا؟
آہ! سرحد کے اس پار تمہارے گیتوں میں کیسا فسوں تھا؟
ان گیتوں میں کیسی شیرینی تھی!
میں جواب کیلئے تمہیں مجبور نہیں کرتی
مگر مجھے ایک بار تم پھر وہی گیت سناؤ
جو تم نے اپنی زلیخا کے لئے بطور خاص لکھے تھے
مجھے یقین ہے کہ بہشت کی اس آزاد فضا میں تمہارا فن

اپنے عروج پر ہوگا!

گوئٹے کی اس بے مثال شعری تصنیف کا اردو میں مکمل اور خاص کر منظوم ترجمہ ادبیاتِ اردو کے لئے بہت ہی گراں مایہ اضافے کا حامل ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(1) پیامِ مشرق، شیخ مبارک علی، لاہور، 1961ء، ص246

(2) پویمز آف دی ویسٹ اینڈ ایسٹ، ویسٹ ایسٹرن دیوان، پیٹر لینگ، برلن، 1998ء، صXI

(3) پیامِ مشرق، ص ک،م

سعادت حسن منٹو اور کشمیر

فروری 1960ء میں پاکستان کے ایک معتبر جریدے ہفت روزہ ''نصرت'' لاہور نے کشمیر کے موضوع پر ایک ضخیم خاص نمبر شائع کیا جس میں شاعر کشمیر غلام احمد مہجورؔ پر بھی سعادت حسن منٹو کا ایک مختصر سا مضمون شامل تھا۔اس مضمون کی تحریک منٹو کے بقول اُسے کسی کشمیری ہم عصر نصیرؔ انور سے ملی تھی جس نے مبینہ طور پر اُردو نثر میں مہجورؔ کی چند کشمیری منظومات کا ترجمہ کیا تھا ۔تاہم ان تراجم کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوسکا کہ یہ مہجورؔ کی کون سی نظمیں ہیں؟

جہاں تک ہمارے مطالعے کا تعلق ہے مہجورؔ کے سارے کلام میں اس قسم کی منظومات کہیں بھی موجود نہیں ہیں ۔امکان اغلب یہی ہے کہ مترجم نے کشمیر کے معاشی اور اقتصادی حالات کے ساتھ ساتھ اس دورِ ابتلا کے سیاسی پس منظر میں یہ نثری تخلیقات خود ہی قلم بند کر کے انہیں وقار اور مرتبہ بخشنے کی غرض سے مہجورؔ کے مشہور نام سے وابستہ کیا ہو۔

زہر خند، کشتی، شرابی، برف اور اشرف المخلوقات کے عنوانات کے تحت اگرچہ ان نظموں میں اس وقت کے کشمیر کو ایک مخصوص پس منظر میں ایمانداری اور جذبات کی صحیح ترجمانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن منٹو کا یہ دعویٰ بہرحال قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ یہ مضامین مہجورؔ نے اپنے کلام بالخصوص اپنی نظموں میں


سعادت حسن منٹو

باندھے ہیں۔

مہجور پر تحقیق وتنقید کی گرہیں کھولنے کی غرض سے منٹو کا ن یہ مضمون اور ان نظموں کے اقتباسات یہاں پر اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں تا کہ دورِ جدید کے اس کشمیری نقیب سخن کے فن اور تخیل کو جانچنے کی خاطر ان منظورمات کے ماخذ الاصل کا بھی پتہ لگایا جا سکے۔

منٹو خود بھی ایک کشمیری تھا اور تقسیم ہند کے بعد جو کشمیرنژاد اہل دانش پاکستان منتقل ہوئے یا جن کے کشمیری آباواجداد پہلے ہی دورِ غلامی کے استبداد سے مجبور ہو کر ہندوستان کی طرف ہجرت کر چکے تھے ان میں چراغ حسن حسرت، شورش کشمیری، محمد دین فوق، ظہیر کشمیری، قدرت اللہ شہاب، میراجی محمود ہاشمی، اثر صہبائی، خلیفہ عبدالحکیم، طاؤس بانہالی، قیس شیروانی، احمد شمیم، مولانا انور شاہ لولابی اور رفیق خاور کے ساتھ ساتھ دیگر لاتعداد قلم کاروں میں سعادت حسن منٹو کا نام بھی زبان پر آجاتا ہے۔ علامہ اقبال تو اسی قبیل کا مطلع کشمیر سے طلوع ہونے والا وہ خورشید منور ہے جس کے فکروفن کی آب وتاب سے آج بھی برصغیر کے کروڑوں لوگ اپنے اذہان وافکار کے لئے روشنی اور فیضان حاصل کرتے رہتے ہیں۔

منٹو نے نصیر انور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھی تضاد بیانی موجود ہے۔ منٹو لکھتا ہے کہ "نصیر انور خدوخال سے تبت کا رہنے والا لگتا ہے لیکن وہ کشمیری زبان سمجھتا ہے اور بولتا بھی ہے"۔ اس بیان کی صحت پر شبہ کرنے کی تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے کافی گنجائش موجود ہے۔ ثانیاً یہ کہ نصیر انور مقامی طور پر کشمیری الاصل نام نہیں ہے۔ منٹو کے دور میں جو عام کشمیری نام ہوا کرتے تھے وہ خاص الفاظ کی بندش کے ساتھ مخصوص مذہبی نقطہ نگاہ سے رکھے جاتے تھے۔

منٹوؔ کی تحریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ نصیر انورؔ نے مہجورؔ کی ان مصروضہ نظموں کا ترجمہ کر کے انہیں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع بھی کیا ہے جس کا پیش لفظ منٹو نے اُس مختصر مضمون کی شکل میں تحریر کیا۔ جسے اب یہاں پر من و عن نقل کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کا عنوان منٹوؔ نے ''شاعر کشمیر مہجورؔ کشمیری۔ تین ہاتو (ہتو)'' رکھا ہے:

''میں ایک کشمیری ہوں...... ایک ہاتو۔ صرف اس لحاظ سے کہ میرے آبا واجداد کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے (خدا معلوم کب؟) یہ عجیب بات ہے کہ میں نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا۔ صرف بانہال تک گیا ہوں لیکن میرے والد صاحب تو وہاں تک بھی نہ پہنچ سکے تھے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیر اثر کسی ''ہاتو'' یعنی کشمیری مزدور کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اسے بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے ''میں بھی کاشر ہوں''۔

لڑکپن میں والد صاحب کی یہ بچگانہ جذباتی حرکت مجھے بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے بھی کشمیر اور کشمیریوں سے وہی والہانہ اور غیبی محبت اور الفت ہے جو والد صاحب مرحوم کو تھی۔

اسی جذبے کے زیر اثر میں اس کتابچے کے متعلق کچھ کہہ رہا ہوں، حالانکہ شاعری سے مجھے کوئی شغف نہیں۔

عرصہ ہوا والد مرحوم نے مجھے بتایا تھا کہ ایک شاعر غنی ہوا ہے۔ بہت بڑا شاعر ہے۔ فارسی کا شاعر جس کی شاعری کی دھوم ایران میں بھی مچی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ایران کا ایک شاعر (شاید پیدل چل کر) کشمیر گیا اور غنی کے

گھر پہنچا۔اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے لیکن پھر بھی اس نے دستک دی۔ اندر سے ایک خستہ حال آدمی نکلا۔ایرانی شاعر نے اس سے کہا کہ وہ ایران سے غنی کاشمیری سے ملنے آیا ہے۔ خستہ حال آدمی نے ایرانی شاعر سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے میں انہیں بلا کر لاتا ہوں۔

وہ اپنے مہمان کی مہمان نوازی کے لئے کچھ بندوبست کرنے چلا گیا۔ یہ خستہ حال آدمی غنی کاشمیری تھا، جس کی فارسی شاعری کی دھوم ایران تک پہنچ چکی تھی۔ وہ چلا گیا اور وہ ایرانی شاعر وہاں کمرے میں بیٹھ گیا۔دیر تک بیٹھتا رہا مگر غنی کاشمیری نہ آیا۔تنگ آکر اُس نے اپنی بیاض فرش پر رکھ دی جس میں اُس کا ایک شعر نامکمل تھا۔اس نے مصرعہ ثانی لکھا تھا لیکن مصرعہ اولیٰ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔مصرعہ یہ تھا :

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

بیاض چھوڑ کر ایرانی شاعر چلا گیا وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو غنی کشمیری آیا۔اس نے دیکھا کہ بیاض کھلی پڑی ہے جس کے کھلے ہوئے صفحہ پر ایک نامکمل شعر درج ہے جس کا مصرعہ ثانی ہے :

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

غنی کاشمیری نے فوراً قلم اُٹھایا اور مصرعہ اولیٰ لکھ دیا :

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت

یہ میں نے سب کچھ تمہیداً عرض کیا ہے، اصل میں مجھے اپنی اس عقیدت ،محبت اور عشق کا اظہار کرنا تھا جو مجھے کشمیر اور کشمیریوں سے ہے۔ کشمیر میں نے نہیں دیکھا لیکن کشمیری دیکھے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجور کو نہیں دیکھا جسے میرا عزیز دوست نصیر نہ صرف دیکھ چکا بلکہ اس سے مل چکا ہے۔ مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ میں کشمیری زبان سمجھ سکتا ہوں نہ بول سکتا ہوں

لیکن نصیر یہ زبان سمجھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے اور چونکہ وہ ذوق سلیم رکھتا ہے۔ اس لئے اس نے مہجور کے ترقی پسند خیالات کا ترجمہ کیا اور بڑی خوبصورت نثر میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

نصیر بھی کشمیری ہے، حالانکہ اس کے خدوخال سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تبت کا رہنے والا ہے۔ اُس کا رنگ گہرا سانولا ہے جو کشمیریوں کا نہیں ہوتا، لیکن وہ کشمیری ہے، اس کا دل کشمیری ہے۔ اس کے گرد ے کشمیری ہیں، وہ مہجور نہیں ہے، لیکن اس کا عاشق ہے، اس کا پرستار ہے۔ وہ جب مہجور کی باتیں کرتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ اس فضاء کی باتیں کر رہا ہے جو کشمیر ہے جس میں میرے آباواجداد کسی زمانے میں رہا کرتے تھے اور وہاں کے حکمران کے جورو ستم سے تنگ آ کر ہجرت کر آئے تھے۔

مجھے ندامت ہے کہ میرے آباواجداد نے ہجرت کی۔ جورو ستم سہنا بہت بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اُس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی اذیت ہے، برداشت کی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ وہیں رہا جہاں کا وہ تھا۔ ہجر، ہماری رومانی شاعری کا ایک اہم جزو ہے...... معلوم نہیں یہ کیا بلا ہے، کیونکہ اس سے مجھے آج تک واسطہ نہیں پڑا لیکن مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال تھا۔

ایک عجیب بات اور ہے کہ آج کل پاکستان اور ہندوستان میں کشمیر کا جھگڑا اچل رہا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی کشمیری ہے اور اسے کشمیر سے محبت ہے، جیسی مجھے ہے، جیسی نصیر کو ہے، جیسی کسی اور کشمیری کو ہو سکتی ہے۔ کاش مہجور زندہ ہوتا...... اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔

وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لعل نہرو اور خواجہ نظام الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں۔ کشمیری خواہ مسلمان ہو یا ہندو۔ وہ ہر حالت میں کشمیری ہے تم جواہر لال نہرو ہو۔ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو سکتے لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔ ''تم گوگجی اور بتہ'' (شلغم اور چاول) اپنے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو۔ آؤ اور اسی بَتہ (بھات) کی قسم کھاؤ کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو؟

سعادت حسن منٹو

19 نومبر 1952

اب مہجور کی ان پانچوں نظموں کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

1۔ زہر خند

کشمیر کی حسین وادی تیرے دامن میں
زعفران کی مہک ہے بہار کی رنگینی ہے
تو اترا رہی ہے کہ دور سے آنے والے
تیری رعنائی پر مرتے ہیں تیرے شیدائی ہیں
تو شیدائیوں کے ہجوم میں بھول گئی ہے
وہ انسان جس نے تمہیں زندگی عطا کی
خود زندگی سے محروم ہوا جاتا ہے
دیکھ میری آنکھوں سے دیکھ!
تیری جھولی رنگین پھولوں سے لبریز ہے
ان پھولوں کو سونگھ ان میں زندگی کا خون ہے

جو ہر ورقِ گل کو رنگین بنا چکا ہے
دیکھ اپنی خمار آلودہ آنکھوں سے
اب مہیب ڈھانچوں کو دیکھ!
جنہوں نے اپنے خون سے تمہیں رنگینی بخشی
دیکھ ان زرد چہروں کو دیکھ!
جن پر ہر لمحہ یاس و حسرت کی بدلیاں چھائی رہتی ہیں
اے حسین وادی!
اپنی بہار کی چھاؤں میں اس خزاں رسیدہ ہجوم پر بھی ایک نظر ڈال
شاید تو مسکرانا چھوڑ دے
یہ مصنوعی ہنسی اب تمہیں زیب نہیں دیتی

2۔ برف

اے برف!
میں افلاس زدہ تجھے بلند چوٹیوں پر سے اٹھا لایا ہوں
تو نے وہاں سیاہ پہاڑیوں کی ہیبت کو اپنے سیمین آنچل سے چھپا رکھا تھا
لیکن میں غربت کا مارا تمہیں اٹھا لایا
اور سبزہ زار کی ہری ہری گھاس میں
چھپا کر بازار چل پڑا
تا کہ تمہیں بیچوں
لیکن تو اتنی باحیا ہے
کہ سورج کی کرنیں پہاڑوں کی اوٹ سے
تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں

تو خود مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے

3۔ کشتی

میں کشتی میں سوار ہو چکا تھا
مانجی ایک سوار کے انتظار میں
ابھی کشتی کنارے لگائے بیٹھا تھا
یکایک ایک صاحب کا خود پسند چہرہ نمودار ہوا
اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا
''چلو چشمۂ شاہی چلو''
وہ طمطراق سے کشتی میں سوار ہوا
ہم ایک کشتی میں سوار تھے
صاحب، مانجی اور میں
مانجی چپّو چلانے میں مصروف تھا
اس کی دونوں کہنیاں بار بار
اس کے پیٹ سے ٹکراتیں
جیسے اشاروں ہی اشاروں میں سمجھا رہی ہوں
ذرا صبر کرو......بس تھوڑی ہی دیر ہے
تمہارے سامنے چاولوں کا تھال ہوگا
شلغم کا کٹورا ہوگا

4۔ شراب

میں گنگناتا ہوا چلا جا رہا تھا

اچانک ہی لڑکھڑا کر نالی کے قریب گرا
راہگیروں نے یہی جانا
میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوں
انہوں نے اپنے ہوش وحواس کا اظہار کرتے ہوئے کہا
''ارے یہ تو شرابی ہے''
لڑکوں نے سنا تو بلند آواز کی
''شرابی ہے شرابی ہے''
اور مجھ پر کنکر پھینکے
کاش یہ کنکر اس طرح معصومانہ انداز میں
مجھ پر برستے رہیں
اور میں یونہی تماشا بن سکوں
ان لڑکوں کو کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے

5۔ اشرف المخلوقات

پہاڑوں کے اُس پار مجھے زندگی نے آواز دی
مست ہواؤں نے مجھے گیت سنائے
میں والہانہ انداز میں آگے بڑھتا گیا
یکا یک ایک پہرہ دار نے مجھے روک لیا
''تم اس سرحد کو پار نہیں کر سکتے
پروانۂ راہداری دکھاؤ''
''میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں
میں اس زمین کا وارث ہوں

میں دھرتی کا فرزند ہوں
مجھے ہواؤں نے زندگی کا پیغام سنایا ہے
مجھے آگے بڑھنے دو''
پہرہ دار نے اپنے ایک ساتھی سے کہا
اس پاگل سے کہو دور ہٹ جائے
ورنہ کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے گا
نہیں نہیں۔ میں آگے بڑھوں گا
مجھے روکو مت
''چلے جاؤ یہاں سے'' اس نے غصہ سے کہا
میں سوچتا ہی رہ گیا، کیوں؟
اتنے میں ایک خوبصورت پرندہ
اپنے چمکیلے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہوا
زور زور سے تالیاں بجاتا
ہمارے سروں پر سے گذر گیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے
سرحد کے اس پار
نگاہوں سے اوجھل ہو گیا (1)

''کشتی'' اور ''شرابی'' بے حد طویل نظمیں ہیں جنہیں من وعن نقل کرنا تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ثانیاً جیسا کہ ہم پہلے ہی وثوق سے کہہ چکے ہیں ان نظموں کا کلام مہجور میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا لہٰذا انہیں اصل صورت میں نقل کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک معروف دانشور اور صحافی

مرحوم کلیم اختر نے بھی اپنے ایک مضمون ''مہجور۔ اقبال کا کشمیری ترجمان'' میں مہجور کے ساتھ ساتھ فرضی طور پر منسوب نظم ''اشرف المخلوقات'' کا ترجمہ شامل کرلیا ہے۔(2)

اس نظم کی ہیئت اور اس کا نفس مضمون بجائے خود اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس مفروضہ کے پس پردہ دراصل وہ سیاست گری کارفرما ہے جس کی رو سے کشمیر کو غلامی اور استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دکھانا مقصود تھا۔

1947ء کے بعد بالخصوص پاکستان میں کشمیر اور سیاست کشمیر کے تناظر میں جو کچھ وہاں کے ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں نے لکھا اُس میں قدم قدم پر حقیقت بیانی سے زیادہ مبالغہ آمیزی اور سیاسی مصلحتوں کا ہی عمل دخل رہا ہے۔ اس نوع کی ایک اور تحریر میں ایک پاکستانی قلم کار نے اس حد تک غلط بیانی سے کام لیا کہ ''مہجور جیل میں میرا دل پاکستان کے لئے ہے'' کا نعرۂ مستانہ لگاتے ہوئے اللہ کو پیارا ہوگا۔(3) حالانکہ مہجور نے اپنی اچھی خاصی اور آرام دہ زندگی میں اپنے سرکار نواز اور وقت پرست خیالات کی بدولت کوئی تکلیف نہیں اٹھائی بلکہ وہ ہر موقعہ پر حکام وقت کی مدح سرائی کرتا رہا۔ اور اپنے ذاتی مفادات کو ملکی اور قومی مفادات پر ترجیح دیتا رہا۔ مہجور کشمیر کا واحد شاعر ہے جس نے کشمیری قوم پر غضب اور جبر کے نتیجے میں حکمرانی کرنے والے ڈوگرہ مہاراجہ ہری سنگھ کی ستائش میں بھی ایک قصیدہ لکھا اور بھارت نواز کشمیر سیاست کار شیخ محمد عبداللہ کی تعریف وتوصیف میں اس کا ایک مشہور گیت سالہا سال تک ریاست جموں وکشمیر کے سرکاری ایوانوں میں گونجتا رہا۔

کلیم اختر کے خیالات کو جس طرح امین کامل نے یہ کہہ کر رد کیا کہ ''وہ کشمیری نہیں ہے لہٰذا اُسے کسی بھی حوالے کا وسیلہ نہیں بنایا جانا چاہئے۔''(4) تنقید اور تحقیق کے وسیع اور بے پناہ جہانِ تجسس میں قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

ادب اور ثقافت کے میدان میں تحقیق وتلاش ایک ایسا شعبہ ہے جہاں ہر صاحب عقل اور باشعور محقق اپنی ذہانت اور مادۂ اشتیاق کے جوہر دکھانے کیلئے پوری طرح آزاد ہے او راُس کے خیالات کو اگرچہ دستاویزی گواہی کے سہارے رد تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے اظہار خیال پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ مزید برآں یہ کہ کلیم اختر کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کشمیری نہیں تھا۔ اس نے ساری زندگی جو کچھ لکھا اُس میں سب سے زیادہ کشمیر کی تاریخ، ادب اور سیاستِ کشمیر اُس کے فکر اور سوچ پر حاوی رہی۔ چونکہ کلیم اختر جموں میں پیدا ہوئے تھے غالباً اسی بناء پر کامل نے انہیں کشمیری ہونے سے محروم کر دیا۔

اس مقالے کے اخیر پر منٹو کے اُس تاریخی خط کا اندراج ضروری معلوم ہوتا ہے جو اُس نے جواہر لال نہرو کے نام 27/اگست 1954ء کو لکھا اور جس میں منٹو نے اپنے خاص لب ولہجہ اور طرزِ بیان میں نہرو کو اپنے اور دیگر امور کے بارے میں لکھا ہے۔ منٹو لکھتا ہے:

''پنڈت جی! السلام علیکم۔ یہ میرا پہلا مراسلہ ہے جو میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ خدا کے فضل سے امریکی لوگ آپ کو بہت خوبصورت شخصیت سمجھتے ہیں۔ میرے خدوخال بھی کچھ بُرے نہیں ہیں۔ اگر میں امریکہ جاؤں تو شاید مجھے آپ جیسا ہی مرتبہ حاصل ہوگا۔ لیکن آپ تو ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں اور میں پاکستان کا مشہور افسانہ نگار ہوں۔ اس طرح ایک گہری خلیج ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ البتہ ہم میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہم دونوں کشمیری ہیں۔ آپ نہرو ہیں اور میں منٹو۔ کشمیری ہونا خوبصورت ہونا ہے اور خوبصورت ہونا...... مجھے نہیں معلوم۔

میری ایک دیرینہ خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات ہو۔ یہ بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ میں نے آج تک آپ کو دیکھا تک نہیں۔ صرف ایک بار ریڈیو پر

آپ کو سنا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا آپ سے ملنے کی میری دیرینہ خواہش ہے۔ کشمیری ہونے کے ناطے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ جب بھی ضرورت ہوا ایک کشمیری دوسرے کشمیری سے کہیں نہ کہیں کسی کوچے میں یا کسی چوراہے پر ملتا ہے۔

آپ ایک نہر کے کنارے آباد تھے لہذا نہرو کہلائے۔ مجھے حیرانی ہے کہ میں منٹو کیسے بن گیا۔ آپ بار بار کشمیر گئے ہوں گے لیکن میں صرف بانہال تک گیا ہوں۔ میرے وہ کشمیری احباب جو کشمیری زبان جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ منٹو دراصل مَنٹ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ڈیڑھ سیر کا پیمانہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کشمیری جانتے ہیں۔ اگر آپ نے اس خط کا جواب دیا تو ذرا لفظ منٹو کی بھی تشریح کریں۔ میں تو صرف ڈیڑھ سیر ہوں لہذا ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے آپ تو ایک پورا دریا ہیں اور میں محض ڈیڑھ سیر۔ میں آپ سے کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں؟ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم کشمیریوں نے کسی بھی شعبے میں شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ میں سیاست کی دنیا میں آپ کا نام فخر سے لے سکتا ہوں کیونکہ آپ اپنے کہے ہوئے کی تردید کرنے کا ہنر اچھی طرح جانتے ہیں۔

آج تک ہم کشمیریوں کو کُشتی میں یا شاعری میں کوئی مات دے سکا ہے.؟ لیکن مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ آپ ہمارے ملک میں بہنے والے دریاوں کا پانی روکنا چاہتے ہیں۔ پنڈت جی! آپ صرف ایک نہر ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں صرف ڈیڑھ سیر کا ایک پتھر ہوں۔ اگر میرا وزن تیس یا چالیس ہزار ٹن ہوتا تو میں اپنے آپ کو دریا میں ڈالتا تا کہ آپ کو اپنے انجینئروں سے مشورہ کرنا پڑتا کہ اس بھاری پتھر کو پانی سے کیسے نکالا جائے۔

پنڈت جی! آپ بلا شک ایک عظیم شخصیت ہیں۔ آپ ہند کے وزیر اعظم ہیں. آپ اُس ملک کے حاکم ہیں جو پہلے میرا تھا۔ آپ گونا گوں شخص ہیں لیکن معاف کیجیے کہ آپ نے اس خاکسار کی کبھی کوئی فکر نہیں کی۔

میرا والد جو خود کشمیری تھا جب کسی ہتو کو دیکھتا تو وہ اسے گھر لاتا اور پھر کشمیری نمکین چائے اور کلچوں سے اس کی خاطر کرتا۔ پھر وہ ہتو سے فخر سے کہتا کہ میں بھی ایک ہتو ہوں۔

پنڈت جی! آپ بھی کاشر ہیں۔ قسم خدا کی، اگر آپ میری زندگی مانگیں تو یہ حاضر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کشمیر کے ساتھ اس لیے چمٹے ہوئے ہیں کیونکہ کشمیری ہونے کے ناطے آپ کو اس کے ساتھ مقناطیسی کشش ہے اور ایک غیر کشمیری بھی اسی طرح محسوس کرسکتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں صرف بانہال تک جاسکا ہوں۔ میں نے کُد، بٹوت اور کشتواڑ جیسی جگہیں دیکھی ہیں۔ میں نے وہاں لوگوں کے حسن کے ساتھ ساتھ اُن کی غریبی بھی دیکھی ہے۔ اگر آپ نے اس غریبی کو دور کیا ہے تو آپ اُن کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ یہ کر نہیں سکتے کیونکہ آپ کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

ہم دونوں پنڈت بھائیوں کی آپس کی بات ہے کہ آپ مجھے ہندوستان واپس بلالیں۔ سب سے پہلے میں وہاں آپ کے گھر پر شلغم اور شب دیگ نوش کروں گا اور پھر میں امورِ کشمیر اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ یہ بخشی وغیرہ جو ہیں ان کو فوراً ہٹا دیجیے۔ یہ اول درجے کے فریبی ہیں۔ آپ نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کو اقتدار دیا ہے کیونکہ یہ آپ کو راس آتا ہے۔ لیکن کیوں؟ ہم جانتے ہیں کہ آپ سیاست دان ہیں جو کہ میں نہیں ہوں لیکن اُس کے یہ معنی نہیں کہ میں کچھ نہیں جانتا!



سری نگر کے پرانے ہوائی اڈے پر کھینچی گئی ہند کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر جہاں واضح طور پر یہ سرکاری ہدایت نامہ درج ہے کہ ''یہاں پر فوٹوگرافی کی سخت ممانعت ہے''

ملک کو تقسیم کیا گیا۔ ریڈ کلف نے پٹیل کو یہ گندہ کام کرنے کو کہا۔ آپ نے جونا گڈھ پر غیر قانونی طور پر قبضہ کیا ہے جو ایک کشمیری صرف ایک مراٹھا یعنی پٹیل کے زیر اثر ہی کر سکتا ہے۔ خدا اُس کے گناہ معاف کرے۔

آپ ایک معتبر انگریزی دان ہیں۔ یہاں میں اردو میں افسانے لکھتا ہوں جس زبان کو آپ کے ملک میں مٹایا جا رہا ہے۔

پنڈت جی! میں اکثر آپ کے بیانات پڑھتا رہتا ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اُردو سے محبت ہے۔ تقسیم ملک کے وقت میں نے آپ کی تقریر اُردو میں ریڈیو سے سنی۔ ہر شخص آپ کی انگریزی کی تعریف کرتا ہے لیکن جب آپ نے اُردو کا استعمال کیا تو مجھے ایسا لگا کہ اس تقریر کا اُردو ترجمہ کسی جوشیلے ہندو مہا سبھائی نے کیا ہے جو آپ کی پسند کے بالکل منافی تھا۔ اسی لئے آپ ہر جملے پر اٹکتے تھے۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ آپ یہ متن پڑھنے پر کس طرح راضی ہوئے؟

یہی وہ وقت ہے جب ریڈ کلف نے ملک کو ایک روٹی کے دو حصوں کی طرح بانٹا تھا۔ آپ اُس طرف اپنے حصے کو کاٹتے ہیں اور ہم اپنی طرف سے اس کا مزہ لیتے ہیں لیکن ہمارے آتش دان میں شعلے کہیں اور سے آ رہے ہیں۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بخشی کو سبھی اختیارات دئے ہیں حالانکہ وہ کوئی تحفہ بھی نہیں بھیجتا۔ چلو یہ تحفہ جائے جہنم میں۔ میں آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ میری کوئی کتاب کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر آپ نے کوئی پڑھی بھی ہوگی تو افسوس کا مقام ہے کہ آپ نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی ہے۔ ایک اور شکایت یہ ہے کہ آپ کے ملک میں میری تصانیف میری اجازت کے بغیر دھڑا دھڑ چھاپی جا رہی ہیں۔

مجھے یہ شکایت بھی ہے کہ آپ پانی کو ہمارے دریاؤں میں بہنے سے

روکتے تو ہیں لیکن آپ اُن ناشروں کو میری کتابیں میری اجازت کے بغیر چھاپنے سے نہیں روکتے جو انہیں آپ کی راجدھانی اور لکھنو اور جالندھر میں دھڑا دھڑ شایع کر رہے ہیں۔

میرے خلاف فحش نگاری کے الزام میں کئی مقدمے دائر کیے گئے ہیں لیکن دیکھیے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے دہلی میں ایک ناشر کس طرح میرا افسانوی مجموعہ چھاپتا ہے اور اسے منٹو کی گندی کہانیاں کہتا ہے۔ میں نے ایک کتاب گنجا فرشتہ لکھی، ایک ہندوستانی ناشر نے اسے پردے کے پیچھے کے نام سے چھاپا۔ بتائیے میں کیا کروں؟

میں نے ایک نئی کتاب لکھی ہے اور یہ خط اسی کا پیش لفظ ہے۔ اگر یہ کتاب بھی بلا اجازت شائع کی گئی تو خدا کی قسم میں دہلی آ کر آپ کا گلا پکڑوں گا اور آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ میں آپ کے ساتھ اس طرح چمٹ جاؤں گا کہ آپ عمر بھر یاد رکھیں گے اور پھر آپ کو مجھے ہر صبح نمکین چائے اور کلچے کھلانے ہوں گے اور یہ سلسلہ ہفتوں تک جاری رکھنا ہوگا۔ جب میری یہ کتاب چھپ جائے گی میں آپ کو ایک جلد بھیجوں گا اور امید کروں گا کہ آپ اس پر اپنی رائے دیں گے۔

آپ کو میرے اس خط سے جلے ہوئے گوشت کی بو محسوس ہوگی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے کشمیر میں غنی کشمیری نام کا ایک شاعر ہوا کرتا تھا۔ ایک بار ایک ایرانی شاعر اُس کے پاس آیا۔ غنی سری نگر میں اپنے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ یہ ایرانی شاعر اپنا دیوان وہیں چھوڑ کر وہاں سے نکلا اور اس میں ایک غزل کے شعر کا صرف یہ ایک مصرعہ لکھا اور اسے جوں کا توں وہیں رکھ کے چھوڑ دیا۔ یہ مصرعہ یوں تھا:

کدام سوختہ جاں دست زد بدامانت؟

غنی جب واپس گھر لوٹا تو اس نامکمل شعر کے ساتھ اپنا یہ مصرعہ جوڑ کر اسے مکمل کر دیا:

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

پنڈت جی! میں ایک ناپسندیدہ شخص ہوں اسی لیے میں نے آپ کے ساتھ اس خط میں کچھ چھیڑ خانی کی ہے کیونکہ میں زیر تکمیل کتاب بھی آپ ہی کی نذر کر رہا ہوں"۔ (5)

کشمیر کے حوالے سے منٹو کے افسانے صرف چند ایک تک محدود ہیں۔ "آخری سیلیوٹ" کی کہانی 1947ء کے بعد کی اُس مخاصمت کو بے نقاب کرتی ہے جس کا مظاہرہ ہندوستانی اور پاکستانی افواج کو ایک دوسرے کے خلاف کرنا پڑا۔ پاکستانی صوبیدار رب نواز اور ہندوستانی فوجی رام سنگھ غیر منقسم پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ساتھ ساتھ جیئے، پلے بڑھے اور بچپن اور جوانی کا اکثر حصہ اکٹھے گزارا۔ لیکن تقسیم ہند نے اُنہیں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا اور وہ کشمیر کے ایک سرحدی علاقے ٹیٹوال میں بندوقیں تانے اپنے دشمن کو نشانہ بنانے پر مجبور ہوئے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑے تھے۔ ایک دوسرے کے بہترین دوست ہونے کے باوجود کل کے یہ یاران وطن آج برصغیر کے نقشے پر ایک لکیر کھنچے جانے کی وجہ سے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اُن کی کل کی ہنستی مسکراتی کہانی اسی ویران سرحد کے آر پار ایک کربناک المیہ پر اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔

"ٹیٹوال کا کتا" نام کا منٹو کا افسانہ بھی اُس کے وطن مالوف کی اُس وقت کی کہانی کا دردناک پہلو بیان کرتا ہے جس کا پہلا باب کشمیر میں 1947ء کی برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی شک اور نفرت کی روشنائی سے لکھا گیا۔ کشمیر پر

قبائلی حملے کی جنگ بندی کا اعلان ہوا تو وادی کشمیر کے شمال مغرب میں سرحدی گاؤں ٹیٹوال بھی اس غیر فطری حد بندی کی زد میں آ گیا جہاں ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں کسی بھی نا خوشگوار صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ اسی دوران ایک کتا خوراک کی تلاش میں اس علاقے میں گھستا ہے جس کی موجودگی کے دوران فوجیوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اس حیوان کو دشمن ملک کا جاسوس سمجھ کر اُسے گولیاں مار مار کر ہلاک کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی فوجی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم ہندوستانی ہو یا پاکستانی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مرنے سے پہلے غالباً یہی جواب دیتا ''میں نہ تو ہندوستانی کتا ہوں نہ ہی پاکستانی۔ میں تو تم جیسے بے رحم انسانوں سے بدرجہا بہتر ایک بے زبان جانور ہوں''۔

کشمیر پر بہت کم لکھنے کے باوجود منٹو کے فکر و ذہن پر اپنے وطن مالوف سے وابستہ محسوسات اور خیالات ایک یا دوسری شکل میں ظاہر ہوتے رہے۔ اگر چہ یہ تخلیقات معدودے چند ہی ہیں لیکن ان میں بھی اُس کا دردِ وطن پنہاں ہے۔

1934ء میں جب منٹو کو اس جرم کی پاداش میں صرف نو مہینے کے بعد ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایک بہانہ تراش کر خارج کیا گیا کہ وہ درس و تدریس سے زیادہ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہے تو اس کے چند حریفوں نے یہ مفروضہ گڑھ لیا کہ منٹو کو تپ دق ہوا ہے اور اُسے علاج کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُس کی اپنی ہی خواہش کے مطابق اسے بٹوت (کشمیر) کے پہاڑی قصبے میں واقع ایک سینی ٹوریم میں داخل کیا گیا۔ منٹو نے یہاں بھی اپنا تخلیقی عمل جاری رکھا اور تفنن طبع کی خاطر ایک مقامی لڑکی سے عشق بھی لڑایا۔

ایک اور جگہ منٹو نے کشمیر کے حال زار کو ایک مختصر سی تخلیق میں اس طرح بیان کیا ہے:

تقسیم ہند کے دوران فسادات میں ایک کشمیری مزدور ایک فساد زدہ سڑک کے بیچوں بیچ پھنس جاتا ہے جہاں لوگ دکانوں کو لوٹنے اور ان سے اشیا چرانے میں لگے ہیں۔ یہ مزدور بھی چاول کی ایک بوری اٹھا کر بھاگ جانے کی کوشش میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور اُس کی ٹانگ میں گولی ماردی جاتی ہے۔ زخمی ہو کر مزدور زمین پر گر جاتا ہے مگر پولیس اُسے حکم دیتی ہے کہ وہ یہ بوری اُٹھا کر تھانے تک پہنچائے وہ اُن سے عاجزی سے کہتا ہے 'جناب! یہ بوری آپ ہی رکھئے، مجھے صرف یہ بوری اٹھانے کی مزدوری یعنے چار آنے دیجیے'۔(6)

سیاہ حاشئے کی اس مختصر تخلیق میں منٹو نے دراصل اُس وقت کی کشمیر کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔

بہر حال منٹو کے قلم سے حوالۂ کشمیر سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ورطہ تحریر میں لانے سے اُس کی وطن پرستی اور کشمیر نوازی کا وہ قرض ادا نہیں ہو سکا ہے جس کا مقروض منٹو ایک باشعور اور حساس ادیب کی حیثیت میں ہوسکتا تھا۔

منٹو کے ساتھ فیض احمد فیض بھی اسی قبیل کا ایک اور عظیم قلم کار ہے جو کشمیر کے ساتھ کئی طرح کی وابستگی کے باوجود اپنے جاندار اور شاندار فن کا نذرانہ کشمیر اور اہل کشمیر کو پیش کرنے سے قاصر ہی رہا۔ غالباً سالہا سال کا احاطہ کئے ہوئے کشمیر کے خون آشام واقعات فیض اور منٹو کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے عمل میں ان دونوں کے ذاتی نقطہ نظر کے سامنے بھرپور توجہ کے درخور ثابت نہیں ہو سکے حالاں کہ ان دونوں کے تخلیقی دور میں کشمیر میں

ایسے تاریخ سازواقعات پیش آئے جنھوں نے یہاں کی سیاسی اور سماجی دنیامیں ایک انقلاب لایا۔



حوالہ جات

(1) ہفت روزہ نصرت لاہور، کشمیر نمبر، فروری 1960ء، صفحہ 375-367

(2) شیرازہ اُردو، مہجور نمبر، کلچرل اکادمی سری نگر، اگست نومبر 1984ء صفحہ 106-104

(3) کشمیر: ادب اور ثقافت، سلیم خان گمّی ادارۂ مطبوعات پاکستان، کراچی 1963ء، صفحہ 27

(4) شیرازہ کشمیری، کلچرل اکادمی سرینگر، جلد 32، شمارہ 3، ص 51

(5) اس خط کا انگریزی ترجمہ محمد اسدالدین نے کیا ہے جو اَنول آف اردو سٹڈیز، جلد 11، 1996ء میں شایع ہوا۔

(6) دی ویری بیسٹ آف سعادت حسن منٹو، ترجمہ و تدوین خالد حسن، پنگوِن بکس، نئی دہلی، 2008ء، ص xviii



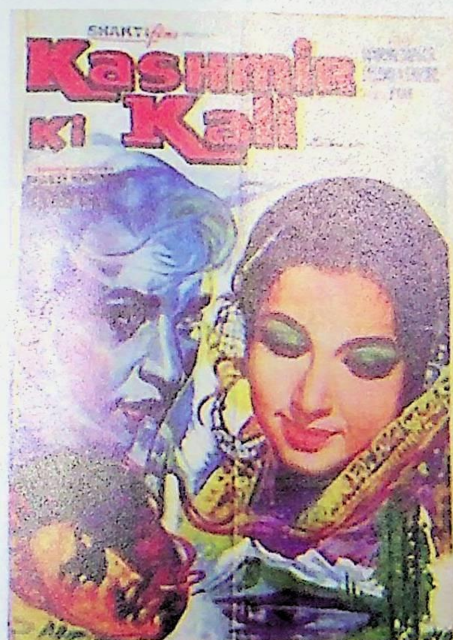
کشمیر: فیض اور فلمستان

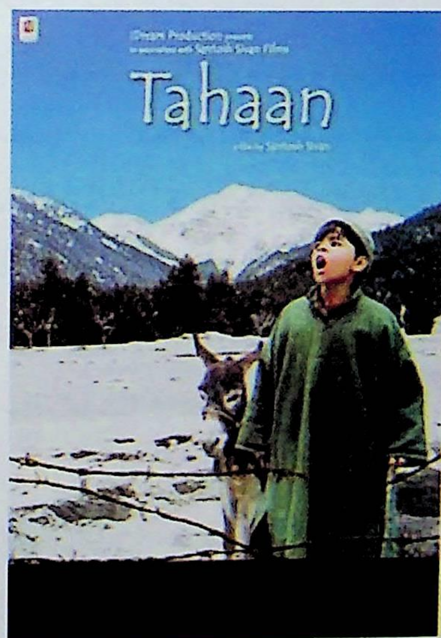
فیض احمد فیض کا شمار جہاں برصغیر کے ممتاز اور عہد ساز شاعروں میں ہوتا ہے وہاں بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ فیض نے فلمی دنیا کے ساتھ بھی اپنے لگاؤ کا کبھی کبھی اظہار بھی کیا ہے۔ وہ اگرچہ عام قسم کی بازاری اور عامیانہ فلموں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا لیکن اُس کے اردگرد کے ماحول نے اُسے ایک ایسے احساس اذیت میں مبتلا کر دیا تھا کہ اُس نے اس شدت احساس کو پردۂ سیمین پر لا کر اُن لاکھوں کروڑوں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جن کی رسائی اُس کے کلام تک نہیں تھی۔

فیض کے زمانے میں پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ پس ماندہ صوبے بلوچستان میں جو پریشان کن حالات موجود تھے۔

اُن کے پس منظر میں فیض نے ''دور ہے سکھ کا گاوں'' نام کی ایک فلم تیار کی جس کا منظر نامہ اور نغمات اُسی نے لکھے۔ اُن دنوں پاکستان کی فلمی دنیا میں حبیب جالب، ریاض شاہد اور حسن طارق جیسے آزمودہ کار اور ترقی پسند فلم سازوں کا طوطی بول رہا تھا۔

پاکستان میں مارشل لا نافذ ہونے کے بعد اس فلم کو اگرچہ مکمل بھی کیا گیا لیکن حکومت نے اسے نمایش کے لئے پیش کرنے سے روک دیا۔


SHAKTI
KI


Tahaan

فیض احمد فیض کو اگرچہ اُن ممالک اور علاقوں کا دکھ درد بار بار بے چین کرتا تھا لیکن آزادی کی جنگ میں برسرِ پیکار کشمیر کے بدترین حالات اس حساس شاعر کی روح کو ضرب لگا نہیں سکے اور اُس نے کشمیر کو اس نوع کے موضوع کے لئے منتخب نہیں کیا۔

بنگلہ دیش کے خون آشام واقعات نے بھی فیض کو جذباتی طور بے حد تکلیف پہنچائی۔ اس متمدن علاقے میں کشت وخون کا بازار دیکھ کر فیض نے ایک عالم اضطراب میں ''قسم اُس وقت کی'' نام کی ایک اور فلم بنائی۔ اعلان تاشقند نے فیض کی اس کوشش پر بھی پانی پھیر دیا جب فلم کو اس بری طرح سے سنسر کیا گیا کہ اس کی نمائش ایک سعی ناکام ثابت ہوئی۔ البتہ سہیل رعنا کے لکھے ہوئے اس کے گانے بے حد مقبول ہوئے جن میں مہدی حسن کی گائی ہوئی ایک نظم ''منزلیں'' بھی شامل ہے۔

فیض کی ایک اور فلم ''دُور ہے سچ کا گاوں'' بھی سالہا سال تک نامعلوم وجوہات کی بنا پر نہ جانے کس سرد خانے میں پڑی رہی۔ یہ فلم جب مکمل ہوئی تو فیض کو ملک چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ یہ فلم بھی بلوچستان میں تیار کی گئی تھی۔

فیض کی آخری فلم ''جاگو ہوا سویرا'' خوش قسمتی سے حکومتی پابندیوں اور زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی اور اسے نصف صدی کے تعطل کے بعد 12 جنوری 2012ء کو کلکتہ میں دکھایا گیا۔ فیض نے اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھے تھے۔ اس فلم کی کہانی دراصل بنگالی ناول نگار مانک بندوپادھیاے کے افسانے ''پدما نادر ماچھی'' (پدما دریا کا مانجھی) پر مبنی تھی۔

اے جے کاردار کی ہدایت میں بنی اس فلم کو عام مقبولیت حاصل ہوئی



فیض احمد فیض کی تیار کردہ فلم ''جاگو ہوا سویرا''، جس کی نمائش سالہا سال بعد جنوری 2012ء میں کلکتہ میں ہوئی

اوراسے گیارہ بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا جن میں ماسکو میں منعقدہ عالمی فلمی میلہ میں دیا گیا انعام بھی شامل ہے۔ یہ فلم مشرقی پاکستان میں اُس وقت بنائی گئی جب اس خطے میں فلم سازی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ فلم ڈھاکہ کے قریب میگھنا دریا کے کنارے صرف اڑتالیس گھنٹوں میں تیار کی گئی۔ فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی کے بقول ''یہ ایک جذباتی لمحہ تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فیض کو اس میں لاہور اور کلکتہ اور اس کے علاوہ کلکتہ کی فلمی دنیا کی جھلک دکھائی دیتی تھی''۔ انھوں نے یہ بھی کہا کی ''فیض ستیہ جیت رے کا ذکر نہایت شفقت اور چاہت سے کرتے تھے''۔

''جاگو ہوا سویرا'' میں اُن دنوں کے بنگالی ماہی گیروں کا حال زار نہایت پُر اثر طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس فلم کے مکالمے اور گیت بھی فیض نے ہی تحریر کئے تھے۔ اس فلم کا مرکزی کردار مشرقی پاکستان کے خان عطاالرحمان (انیس) نے اور خاتون کا کردار کلکتہ کی ترپتی مترا نے ادا کیا تھا۔

گذشتہ چھ سات دہائیوں سے وادی کشمیر ملک کے فلم سازوں کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ اس دوران کشمیر کے حوالے سے جو فلمیں بنائی گئیں اُن میں کشمیر کے فطری حسن کی جلوہ باریاں، یہاں کی ثقافت اور سماجی زندگی اور کسی حد تک حالات حاضرہ کو ہی فلم بنانے والوں نے اپنی صلاحیتوں اور کشمیر شناسی کے پیش نظر پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔

اس پس منظر میں اگر کسی بھی واحد فلم کو کشمیر کے بارے میں سب سے زیادہ حقیقت پسند، شاندار اور دل نشین کہا جا سکتا ہے تو وہ تھی جب جب پھول کھلے۔ یہ فلم کشمیری مناظر کی رنگا رنگی اور مقامی محسوسات اور جذبات کی بہترین عکاس تھی اور اسے فلم بینوں نے بھی دل و جان سے سراہا۔

اس کے ساتھ کشمیر میں بالخصوص رومان اور حسن وعشق کی داستانوں پر مبنی ایک تھی لڑکی، آرزو، برسات، کشمیر کی کلی، ایک پھول دو مالی، نوری، بیتاب، کبھی کبھی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اُس زمانے میں اصحاب علم و دانش فلم سازوں کا کشمیر کے ساتھ بے حد لگاؤ تھا اور وہ مناظر کشمیر اثر انگیزی کے ساتھ پیش کرنے کے لئے محنت شاقہ سے کام لیتے تھے۔ اسی تناظر میں رامانند ساگر نے اپنی فلم آرزو کا ایک نغمہ فلمانے کے لئے کشمیر میں موسم خزاں تک کا انتظار کیا جب چناروں کے درختوں سے لال لال پتے ایک ایک کر کے اور دھیمی رفتار کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں۔ یہ منظر وادی میں انتہائی خوبصورت نظاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ساگر نے اس نغمے کو فلمانے کے لیے کئی مہینوں تک انتظار کیا اور پھر حسرت جے پوری کے اس سدا بہار نغمے کو کشمیر کے مشہور اور چناروں سے بھرپور مغل باغ شالیمار میں فلمایا:

بیدردی بالما تجھ کو میرا من یاد کرتا ہے
برستا ہے جو آنکھوں سے وہ ساون یاد کرتا ہے

اس گیت میں چناروں سے پتے گرنے کا ذکر بھی ایک شعر میں موجود ہے اور یہ آج بھی وادی میں ہر خاص وعام کی زبان پر اپنی موسیقی کا جادو جگا رہا ہے۔

1990ء کے بعد کشمیر کے حالات نے غیر متوقع کروٹ لے کر نامساعد اور خوف وخطر سے بھرپور ایک غیر موافق صورت حال پیدا کر لی جس سے فلم سازوں کو بھی اپنی تخلیقات کے لئے زوردار اور شور انگیز مواد حاصل ہوا، البتہ کئی فلم ساز اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے اور وہ اسے حقیقی تناظر میں

پیش کرنے سے قاصر ہی رہے جس کی بنیادی وجہ کشمیر کے زمینی حالات سے اُن کی سراسر ناواقفیت ہے۔

اس ضمن میں مشن کشمیر، شین، غدر: ایک پریم کہانی، انڈین، گنہگار، ہندوستان کی قسم، ماں تجھے سلام، ایل او سی کرگل، قیامت، مہرا، حنا، کہرام، میجر صاحب، ریفیوجی، فضا، بورڈر اور بہت ساری پروپگنڈہ فلموں کا نام لیا جاسکتا ہے لیکن اس کے برعکس اسی پیچیدہ اور مشکل موضوع پر روجا نام کی فلم نے ہر طبقہ خیال سے داد و تحسین حاصل کی کیونکہ اس میں شورش زدہ کشمیر کے بارے میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا تھا۔ اس فلم کا وہ منظر غالباً مدتوں تک فراموش نہیں کر سکتے جب فلم کا ہیرو قومی جھنڈے کو جلتا ہوا دیکھ کر اسے اپنے بدن سے ڈھانپتا ہے اور دہکتے ہوئے شعلوں کی پروانہ کرتے ہوئے اس قومی نشان کو خاکستر ہونے سے بچالیتا ہے۔ 1992ء میں تیار کردہ یہ فلم تامل، ہندی، مراٹھی اور ملیالم میں بھی بنائی گئی اور اسے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ مانی رتنم کی اس فلم کو اے آر رحمان نے موسیقی سے سنوارا تھا اور اس میں دو کشمیری گانے رندہ پوشہ مال (رسول میر) اور بومبرو بومبرو (نادم) بھی شامل کیے گئے تھے جو بہت ہی مقبول ہوئے۔

لمحہ فلم کو چند اعتراضات کی بنا پر سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور اومان میں نہیں دکھایا گیا اور متنازعہ کشمیر میں بھی اس کی نمائش ممکن نہیں ہوسکی۔

بدقسمتی سے جو پروپگنڈہ فلمیں کشمیر کے حوالے سے بنائی گئی ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر میں عاقبت نا اندیشی اور متعصّبانہ ذہن کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ہندو پاک کے مابین کشیدہ تعلقات کو معمول پر لانے کا نہیں

بلکہ اُن میں مزید تناو پیدا کرنے کا قوم دشمن رول ادا کیا گیا ہے۔

مشن کشمیر میں اس حد تک نا قابل یقین مبالغہ آمیزی کا بھونڈا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ عسکریت پسند سرحد پار سے وادی کشمیر میں ٹینک اور توپیں تک لاتے ہیں جو کشمیر کی مغربی سرحد کی طرف سے ایک ناممکن عمل ہے۔

اشون کمار کی انشاالله کشمیر وادی کے موجودہ حالات کی زبردست عکاس ہے جس میں فلمساز نے ہم عصرنئ اصطلاحات جیسے کریک ڈون، کرفیو، عصمت ریزی، یتیمی، فرضی تصادموں، اذیت رسانی، نفسیاتی دباو اور بیہمانہ قتل وغارت کو اثر انگیز طور پر پیش کیا ہے۔ فلم بین اُس وقت ایک جذبات خیز تلاطم میں گھر جاتے ہیں جب وہ کشمیر کے دیدہ زیب نظاروں کو خاردار تاروں میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عسکریت پسندوں کے حملوں کے نتیجے میں جو خون بہتا ہے اور جو انسانی اعضاء سڑکوں پر بکھرتے ہیں اُن کی تصویر کشی بے حد متاثر کن ہے۔ اس کے بعد جو فوجی کارروائی ہوتی ہے وہ سبھی واقعات دیکھ کر ایک ہندوستانی فلم بین مخمصے میں پڑ کر پوچھتا ہے کہ آخر یہ کشمیری لوگ کیا چاہتے ہیں؟

یہ فلم بھی متنازعہ فیہ قرار دی گئی اور اسے صرف آن لاین ہی دکھایا گیا۔

گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں مظفر علی نام کے ایک فلم ساز نے کشمیر آکر یہاں ملکہ حبہ خاتون پر زُونی نام سے ایک فلم بنانے کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں اسے جموں وکشمیر بنک کی طرف سے کروڑوں روپے کا قرضہ بھی دیا گیا جس کی اُس وقت کے ریاستی وزیر اعلی ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے بذات خود سفارش کی تھی۔

اس فلم کے لئے ممتاز شاعر شہریار سے گانے لکھنے کی رضامندی حاصل

کی گئی تھی اور مشہور موسیقار خیام نے اسے موسیقی سے سجانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

اس کے بعد مظفر علی 1990ء میں کشمیر میں حالات کی تبدیلی کے پیش نظر اس منصوبے کو ابتدائی مرحلے میں ہی چھوڑ کر واپس گھر چلا گیا اور یہ فلم پھر کبھی نہ بن سکی۔

جموں و کشمیر بنک کے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مظفر علی کے نام بنک کا قرضہ اب اصل زر سے کئی گنا زیادہ ہو چکا ہے۔

اس سلسلے میں علی کو پے درپے یادداشتیں بھی اُس کے لکھنو اور دہلی کے پتے پر ارسال کی گئی ہیں مگر ان مراسلوں کا کوئی جواب تک نہیں آیا ہے اور نہ ہی بنک کا قرضہ لوٹانے کا علی نے کبھی اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

ہندوستانی فلموں میں کشمیر کی مسخ شدہ تصویر کشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بمبی کے جو فلم ساز اس خطہ ارضی پر اپنی فلمی تجربہ کاری کرتے ہیں ان میں سے اکثر کبھی کشمیر آئے ہی نہیں ہیں بلکہ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر ہی اپنے آپ کو ماہر کشمیریات سمجھ کر اپنی نافہمی اور صحیح حالات سے ناواقفیت کا خود ہی پردہ فاش کرتے ہیں۔ مشن کشمیر میں ایک ناممکن عمل یعنی فلک بوس پہاڑوں میں گھری مغربی سرحد سے وادی میں بڑے بڑے ٹینک لانا اور عسکریت پسندوں کی طرف سے انہیں سری نگر میں مشہور ہندو مندر شنکر آچاریہ اور مسلم درگاہ حضرت بل کو اڑانے کی بے سود کوشش کرنا بعید از حقیقت فلم سازی کی ایک عامیانہ مثال ہے۔

کشمیر میں گزشتہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصے میں جو قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور جس کے منفی اثرات اب بھی برابر موجود ہیں اُسے ایک مثبت اور صحیح تناظر میں بھارتی فلم سازوں نے پیش کرنے کی کبھی کوشش نہیں

کی کیونکہ ایسا کرتے وقت انہیں کچھ ایسی حقیقتوں کا بھی اظہار کرنا تھا جو اُن کی نظروں میں اصحاب اقتدار کے لئے ناپسندیدہ ہوسکتی تھیں لہازا وہ اس صداقت بیانی سے دور ہی رہے اور روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر کے مصداق کشمیر کی حقیقت کو خرافات کی صورت میں سامنے لانے کا بازاری کام انجام دیتے رہے۔



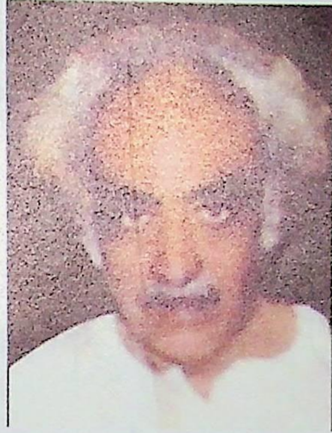
غلام رسول سنتوش

جیسا دیکھا ویسا پایا

بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی کے دن تھے۔ سری نگر میں کلچرل کانفرنس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بازار سرگرم تھا۔ کانفرنس کی ہفت روزہ نشستوں میں درجنوں شاعر، ادیب، نقاد، مصور، فن کار اور دیگر کلاکار ذوق و شوق سے حصہ لے کر یہاں کی ادبی زندگی میں ایک نئی حرارت پیدا کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک دن ایک پستہ قد، بھرے بھرے چہرے والا اور بالوں کو کھچڑی بنائے ایک شخص اس محفل میں وارد ہوا اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر نشست کی کارروائی کو خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ ذہن نشین کرتا رہا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام غلام رسول ڈار ہے اور سری نگر کے ایک وسطی علاقے چنکرال محلّہ کا رہنے والا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ دسویں جماعت پاس کی ہے لیکن سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد دکانوں کے سائن بورڈ لکھتا ہے۔ بوقتِ ضرورت ریشم کی بنائی بھی کرتا ہے اور پیپر ماشی کا کام بھی کرتا ہے۔ چند دنوں کے بعد اُس کا نام غلام رسول سنتوش پڑ گیا۔

سنتوش کی یہ سب سے بڑی خاصیت تھی کہ اُس نے پیٹ کا دوزخ



غلام رسول سنتوش

بجھانے کی خاطر جو کام بغیر کسی ہچکچاہٹ اور خوف کے اپنائے دوسرا کوئی بھی شخص غالباً انہیں اپنے لئے ہتک آمیز تصور کر لیتا۔ لیکن سنتوشؔ اپنی لگن اور محویت کے ساتھ یہ کام نہایت فن کاری کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اُس نے کئی سال تک دیواروں پر سفیدی کرنے کے کام میں بھی مضائقہ نہیں پایا۔

رفتہ رفتہ جب کانفرنس کی ہفت روزہ مجلسوں میں غلام رسول سنتوشؔ کی صلاحیت ظاہر ہونے لگی تو پتہ چلا کہ وہ ایک بہت بڑا مصور بننے کی راہ پر بے خوف وخطر نکل پڑا ہے اور سارے ہندوستان میں اس شعبے میں نام کما کر کشمیر کا نام بھی روشن کرنا چاہتا ہے۔ اپنی خود پسندی اور خود اعتمادی کی بدولت بالآخر اُسے یہ شہرت حاصل ہو کے ہی رہی۔

مصوری کے فن میں سنتوشؔ نے اُس وقت کے مشہور فنکاروں سوم ناتھ بھٹ، دینا ناتھ المست اور تریلوک کول سے اگرچہ فیضان اور رہنمائی بھی حاصل کر لی لیکن بعد میں اُس نے کسی اور کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے ہی موقلم کو انفرادی اظہارِ خیال اور تصور کی عکس بندی کے زیور سے اس طرح آراستہ کیا کہ سنتوشؔ کی تصاویر کو مصوری کے ہزاروں لاکھوں نمونوں میں رکھ کر

آسانی کے ساتھ شناخت کیا جانے لگا۔

1957ء میں ریاست میں کلچرل اکادمی کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس ادارے کے ساتھ سرگرمی سے وابستہ ہوگیا جہاں اکادمی کے اولین سکریٹری مرزا کمال الدین شیدا صاحب نے اُس کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اسے کئی اہم کام سونپ دیئے جن میں اکادمی کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کے سرورق کی تیاری اور اُن کی تزئین کاری بھی شامل تھی۔ سنتوشؔ کے کام کرنے کا ڈھنگ بالکل الگ تھا۔ وہ جس فرضِ منصبی میں جٹ جاتا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیتا۔ سنتوشؔ کے ساتھ جب میرے ذاتی تعلقات رفتہ رفتہ مضبوط تر ہوتے گئے تو میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ کینوا س کو سامنے رکھ کر گھنٹوں خیالات کی دنیا میں محو ہو جاتا اور اس دوران کھانا پینا بھولنے کے علاوہ اپنے اہل خانہ کی کسی بھی بات کا مشکل سے جواب دیتا۔ وہ بھی جب اُس کا کام کسی حد تک مکمل ہو جاتا تو مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر کہتا ''چلو اب کچھ کھا لیں اور کشمیری زبان اور ادب کی باتیں کریں''۔

مصوری کے ساتھ دل سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ سنتوشؔ نے اپنے یار دوستوں کی صحبت کے زیر اثر کشمیری میں شاعری کرنے کا بھی شغل شروع کیا۔ اُسے دوسروں کو شاعری سنانے اور اُس کی داد حاصل کرنے کا جنوں کی حد تک شوق تھا۔ اُس کا یہ شوق کبھی کبھی احباب کے لئے بوریت کا بھی سبب بن جاتا لیکن سنتوشؔ اپنی بحرِ طویل سنانے کا سلسلہ طویل کرنے سے کبھی باز نہیں آتا۔ سنتوشؔ کی شاعری سننے اور مجبوراً اُسے داد دینے کی یہ محدود احباب پر مشتمل محفلیں سری نگر میں ایک خاص جگہ پر لب ڈل کے میکدہ میں رات گئے تک جاری رہتیں۔

غلام رسول سنتوشؔ کی زندگی میں ایک ہنگامہ خیز موڑ اس وقت آ گیا جب

اُس نے شہر کی ایک پنڈت لڑکی سے شادی کرلی۔ اس پر لڑکی کے گھر والوں اور سنتوش کے رہائشی علاقے کے چند جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں نے ایک طوفانِ بدتمیزی کھڑا کیا اور انہوں نے سنتوش کو گرفتار کروانے اور اس شادی کو توڑنے کا احمقانہ مطالبہ کیا۔ اِن ہنگامہ پرستوں نے سنتوش کے خلاف لاتعداد تار اور خطوط اکادمی کے سکریٹری کو بھی ارسال کئے جن میں طرح طرح کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

سنتوش نے اپنے آپ کو نادیدہ خطرات اور ناموافق ماحول کی زوردار آندھی میں گھرا ہوا دیکھ کر اسی میں خیریت جان لی کہ وہ اپنی بیوی توشہ کو لے کر دہلی بھاگ گیا۔ جہاں اُس نے ڈیفنس کالونی میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ مصیبت کی اُس نازک گھڑی میں دہلی کے ایک فن شناس اور کمار آرٹ گیلری کے مالک کمار صاحب نے سنتوش کی اتنی مدد کی کہ کشمیر کے چند جنونی پنڈتوں کے مقابلے میں کمار صاحب کو ایک فرشتے کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

میں بدستور اکادمی میں ملازم تھا اور اب وہاں علی جواد زیدی نے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ زیدی صاحب نے ایک دن میرے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں حضرت شیخ یعقوب صرفی ایشان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی پنج گنج کی تدوین اور ترتیب کا کام سنبھالوں جسے بعد میں اکادمی کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ پنج گنج کی پانچ مثنویوں میں سے ایک کا قلمی نسخہ رام پور یوپی کی رضا لائبریری میں موجود تھا جس کی نقل تیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا تاکہ پنج گنج کو ایک مکمل صورت دے کر منظر عام پر لایا جائے۔

زیدی صاحب نے اکیڈیمی کے خرچ پر میرے رام پور جانے کے لئے احکامات جاری کئے اور میں کشمیر سے کسی بیرونی شہر میں جانے کے لئے پہلی بار سری نگر سے باہر کی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے روانہ ہوا۔

دہلی میں میرا قیام سنتوشؔ کے یہاں رہا جس نے مجھے دل و جان سے اپنے فلیٹ میں جگہ دی اور جی جان سے میری خاطر داری کی۔ اُس کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا پروستا اور خود ہی کھلاتا۔ اُس دوران اُس کی وفاشعار، شریف النفس اور فرمانبردار بیوی توشہ بلائیں لے لے کر مجھے کھانا پوری طرح سے کھانے کے لئے منّتیں کرتی اور سنتوشؔ کبھی کبھی مذاق میں اسے یہ کہہ کر خاموش کروا دیتا۔ ''کیوں اِس چھ فٹ لمبے آدمی کے پیچھے پڑی ہو۔ اگر اِس نے تمہاری بات مان لی تو کیا اس کا پیٹ پھٹ نہیں جائے گا؟''۔

اُن دنوں سنتوشؔ کی قسمت شعبۂ فن میں اس لئے چمک اُٹھی تھی کہ اُس نے ترکا یا شیو فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو اپنے موقلم سے عکاسی کرتے ہوئے اپنا بہت سارا وقت صرف کرلیا تھا اور ہندوستان کے چوٹی کے مصوروں کی صفوں میں اپنی خاص جگہ بنالی تھی۔

چونکہ اس فلسفہ اور اس کے برمحل یا مبنی بر حقائق کے پس منظر سے ہم واقف نہیں اور نہ ہی ہم نے یہ واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش کی ہے لہٰذا ہم سنتوشؔ کے اس مکتب مصوری پر کوئی خامہ فرسائی نہیں کریں گے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس خیال کی عکاسی اُن کی تصاویر میں ایک خاص قسم کا جادوئی عمل اور اُس عمل کے نتیجے میں نہایت ہی جذبات انگیز اور دل کو آلۂ ثقل کی طرح اپنی طرف کھینچنے والے فن کا کمال نظر آتا ہے جو سنتوشؔ کو ہم عصر کشمیری مصوروں میں بلاشبہ سب سے ممتاز اور بلند مقام عطا کرتا ہے۔

سنتوشؔ دہلی میں مقیم تھا کہ اُس پرسری نگر میں ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی جب اس کے شریف الطبع اور کم گو بھائی محمد صادق کو کسی بندوق بردار نے قتل کردیا۔

غلام رسول سنتوشؔ نے اِس دوران ادب کی دنیا میں بھی اپنی جگہ بنالی

تھی۔ اس نے اردو زبان میں ایک ناول ''سمندر پیاسا ہے'' بھی تخلیق کیا تھا اور اُس کے کشمیری مجموعہ کلام ''بے سوکھ روح'' کو ساہتیہ اکادمی کے پُروقار انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ 1977ء میں اُسے پدم شری کا خطاب بھی دیا گیا۔

غلام رسول سنتوشؔ زبردست قوتِ ارادی کا مالک تھا لیکن اس احساس نے بعض اوقات اُس کے ہاتھوں ایسے تجربے بھی کروائے جو بہرحال ناکام ہی ثابت ہوئے۔ اُس کے اردو ناول ''سمندر پیاسا ہے'' کو خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ جس زمانے میں اُس نے یہ ناول تحریر کیا وہ کشمیری زبان کی نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جس کی بنیاد 1947ء میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک پر اُستوار ہوئی تھی۔ اس تحریک کی بدولت پہلے پہل اُردو زبان میں ادب تخلیق کرنے والے شاعروں اور ادیبوں دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی نے اس زبان کو خیرباد کہہ کر اپنی مادری زبان میں اپنی فنکارانہ مہارت کا لوہا منوا لیا تھا اور 1950ء اور 1970ء کا یہی وہ زمانہ تھا جس نے کشمیری شاعری کو عدیم المثال تخلیقات سے مالامال کر دیا تھا۔

سنتوشؔ نے صحافت کی دنیا میں ''کاشر ادب'' کے نام سے ایک ثقافتی رسالہ جاری کر کے ایک اور تجربہ کیا جبکہ یہ جریدہ صرف چند ماہ تک ہی اکھڑی اکھڑی سانسیں لے کر دم توڑ بیٹھا۔

البتہ سنتوش کے لئے جس شعبے میں اُس کی مایہ ناز کارکردگی کا سہرا بندھا تھا۔ وہ آخرکار اُسی میں زبردست بالادستی حاصل کر کے ہندوستان کا ایک ممتاز مصور بن گیا اور اِسی دین کی بدولت اُسے للت کلا اکادمی کے اعزاز سے بھی نوازا گیا جس کا وہ ہر طرح سے مستحق تھا۔ سنتوشؔ نے بہرحال ایک شاندار، نرم دل اور شفیق انسان کی طرح اپنی زندگی گزاری اور ہر مخالف ہوا کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے ہٹا کر اپنے لئے شہرت اور مرتبت کے مطلع سے عوام میں قبولیت کا

سورج روشن کیا۔ مالی اعتبار سے سنتوشؔ مشکل سے ایک خود کفیل تھا شخص تھا لیکن جب بھی اُس کے سامنے کسی شناسا کی شکل آجاتی تھی تو وہ قدمے، درمے اور سخنے اس کی اعانت کرنے سے کبھی پیچھے نہیں رہتا۔

سنتوشؔ کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگر وہ مسلکی اعتبار سے اہلِ تشیعہ میں سے تھا لیکن اُس نے مذہب کی تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر اور روشن دماغ اور واضح نظریہ رکھنے والا فنکار تھا۔

البتہ کبھی اُس کی ان انسانی اقدار کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑتا تھا جب یہ دیکھا جاتا کہ کبھی کبھی وہ عاشورہ کے جلوس میں ایک کٹر شیعہ کی صورت میں شامل ہو کر سینہ کوبی کرتا نظر آتا۔ بہر حال خواہ وہ غلامِ رسول تھا یا سنتوش تھا، ایک بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اوّل و آخر ایک انسان تھا اور ایسے انسانوں کی آج کل دانشوروں کے حلقے میں کمی ہی نظر آتی ہے۔ اس کمی کے اسباب میں شاید وہ دورِ ناہنجار بھی شامل ہے جو سرزمینِ کشمیر پر 1990ء سے بہت حد تک غالب آچکا ہے۔

میری زندگی کے صحافتی سلسلے میں سنتوشؔ نے قدم قدم پر میری قلمی اور موقلم کی مدد کی۔ اُس نے میرے کشمیری ہفت روزہ ''وطن'' کے شہید نمبر، عید نمبر اور اردو اخبار ''اقبال'' کے بنگلہ دیش نمبر کی بھی تزئین کاری کی اور اس میں شامل مضمون نگاروں کے قلمی خاکے بنا کر اس خصوصی اشاعت کو ایک مخصوص زیب و زینت سے آراستہ کیا۔ سنتوشؔ کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات کم و بیش تیس سال پر محیط رہے اور میں اُسے بھی اپنے سب سے قریبی اور غیر رسمی دوستوں میں شامل کرتا ہوں کیونکہ اُس میں میں نے کبھی تصنع اور ریا کاری کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔

اُس کی خاص عادت یہ تھی کہ وہ اپنے بیحد قریبی احباب کو، جن میں، میں بھی شامل تھا، اس انداز سے گالیوں سے نوازتا گویا اُن کی تعریفیں کر رہا ہو۔ یہ سنتوش کا اپنا ایک مخصوص اندازِ گفتگو تھا جس سے یار لوگ مشتعل ہونے کے بجائے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

1929ء میں ایک نچلے درجے کے متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والا غلام رسول سنتوش 10/ مارچ 1997ء کو اپنی جنم بھومی سے دور دہلی میں انتقال کر گیا جہاں گنتی کے چند احباب اور کشمیری پنڈتوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کی موجودگی میں اُسے بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخبار انڈین ایکسپریس کے عقب میں ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اُس کے لوحِ محفوظ میں اپنے وطن مالوف سے دور ہی سفرِ آخرت پر روانہ ہونا رقم ہو چکا تھا اور اُ کی مٹی میں دبی ہوئی آواز بزبانِ حال کہہ رہی ہے:

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

☆☆☆

اسرار الحق مجازؔ اور کشمیر

چند یادیں

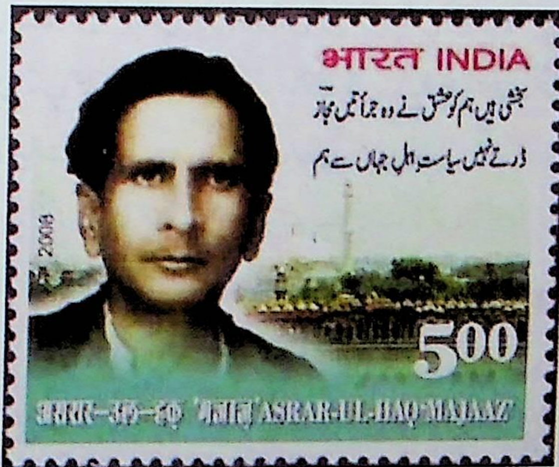
28 مارچ 2008ء کو ہندوستان کے محکمۂ ڈاک نے اسرار الحق مجازؔ کے نام سے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ مجاز کو عام طور پر اردو شاعری کا کیٹس کہا جاتا ہے۔ وہ اُتر پردیش میں بارہ بنکی کے نزدیک 1911ء میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان زمینداروں کا گھرانہ تھا۔ لکھنؤ کی طرف روانہ ہو کر مجاز نے پہلے نوآبوں کے اس شہر میں اور بعد میں علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر لی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں مجاز خاص طور پر طالبات میں بے حد مقبول تھا اور وہ اسے اپنا شریکِ حیات بنانے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔

یہ انقلابی شاعر عشق اور محبت کے گیت گاتا رہا اور اس کی کئی رومانوی منظومات نے علی گڑھ کے ادب نواز طلباء اور طالبات میں جذبات خیزی کا طوفان بپا کیا۔

مجاز کی سب سے بُری عادتوں میں اُس کی بلا کی مئے نوشی تھی اسی لئے اُس کے ایک قریبی دوست اور مشہور شاعر ساحرؔ لدھیانوی نے ایک بار مجاز کے بارے میں کہا کہ وہ ہر وقت نشے میں دھُت رہتا ہے اور بے مقصد آوارہ گردی کرتا رہتا ہے لیکن اس کے باوجود ساحرؔ نے سویرا لاہور کے صفحات پر مجاز کو



اے غمِ دل کیا کروں　　　　اے وحشتِ دل کیا کروں



مجاز کے نام سے اگرچہ پانچ روپے کا یادگاری ٹکٹ حکومت نے جاری تو کیا لیکن حکومت کی طرف سے اس بے مثال شاعر کو کبھی کسی اعزاز و اکرام سے نوازا نہیں گیا

متعارف کیا اور پھر یہ دونوں ساری عمر گہرے دوستوں کی طرح ساتھ رہے۔

مجاز نے صرف چوالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

1953ء میں جب کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی حکومت کو برخاست کر کے انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا تو ریاست جموں و کشمیر کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان شیخ صاحب کے دست راست اور خصوصی نائب بخشی غلام محمد نے سنبھالا۔ شیخ صاحب چونکہ اس وقت کشمیر کے محبوب عوامی رہنما تھے لہٰذا ان کی برخاستگی اور نظر بندی کے خلاف وادی کشمیر میں جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے ہوئے جن سے بخشی صاحب کو خاصی پریشانی ہوئی۔ بخشی صاحب چونکہ ایک وقت شناس سیاست دان تھے انہوں نے سیخ پا عوام کے جذبات پر قابو پانے اور انہیں معمول کی زندگی کی طرف مبذول کرنے کی غرض سے کئی ایسے اقدامات کر لئے جن میں لہو ولعب، کھیل تماشے، رقص وموسیقی اور رنگا رنگ ثقافتی پروگرام اور کل ہند مشاعرے شامل تھے۔ یہ سلسلہ عیش ونشاط ''جشن کشمیر'' کے نام سے مرتب ہوا جو مہینوں تک کشمیری عوام کا دل بہلاتا رہا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لوگ بھی آہستہ آہستہ شیخ صاحب کی سیاست کو بھول کر اپنے روزمرہ کے کام کاج میں لگ گئے۔

جن کل ہند مشاعروں کا اہتمام کیا گیا اُن میں ہندوستان بھر سے بڑے بڑے اور برگزیدہ شاعر مدعو کئے گئے جن میں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی، انور صابری، فنا نظامی، شاذ تمکنت، معین احسن جذبی، وامق جونپوری، سکندر علی وجد، ساغر نظامی، نشور واحدی، فضا ابن فیضی اور انور مرزا پوری وغیرہ شامل تھے۔

میں اُن دنوں ریڈیو کشمیر میں ملازم تھا اور اس حوالے سے مجاز سے بھی میری ایک دو بار ملاقات ہوئی۔ اس دوران ریڈیو نے اُن کی چند غزلیں بھی

صدا بند کیں اور اس عمل کے دوران میں وہاں پر برابر موجود رہا۔

وہ سری نگر کے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں ٹھہرا ہوا تھا جہاں میں اس سے ملنے گیا۔ چونکہ میں عمر میں مجاز سے چھوٹا تھا لہٰذا اس نے بہت حد تک مجھے درخور اعتنا نہیں سمجھا البتہ اس نے کھل کر اپنی زندگی اور شاعری سے متعلق باتیں سنائیں۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں صرف اپنی مادری زبان کشمیری میں ہی شاعری کرتا ہوں تو مجاز بے حد خوش ہوا اور مجھے یہ تاکید کی کہ ایک شاعر کو صرف اپنی مادری زبان میں ہی سخن گوئی کرنی چاہیے جس میں وہ اپنے محسوسات اور جذبات کا بہترین انداز میں اظہار کر سکتا ہے۔

اسی دوران ایک شام کو سری نگر کے پولو گراؤنڈ کی اُس عمارت کے وسیع و عریض صحن میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں اُس وقت ریڈیو کا سٹوڈیو تھا۔ اس مشاعرے میں مجاز بھی شریک تھا۔ سامعین میں کئی وزراء کے ساتھ ایک ادب شناس وزیر داخلہ درگا پرشاد در بھی موجود تھا۔

جب مجاز کی باری آئی تو اس نے پہلے ایک خوبصورت غزل سنائی اور اس کے بعد سامعین کی فرمائش پر اس نے شہرہ آفاق نظم "آوارہ" اپنے کمزور جسم کو لہلہاتے ہوئے سنائی۔ در صاحب کی فرمائش پر یہ نظم سنانے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اس طرح سے مجاز نے اس مشاعرے کو لوٹ لیا۔ مجاز کے واپس لکھنؤ لوٹنے کے بعد ہی اس کی افسوس ناک موت کی خبر آئی جب اسے 5 دسمبر 1955ء کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات میں ایک انجان میخانے کے باہر مردہ پایا گیا۔ اس طرح سے ہندوستان میں اردو ادب کی رومانی فضاؤں کا یہ شہزادہ اپنے عقابی پروں پر اڑتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا:

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

اس سے چند سال قبل جب جوش ملیح آبادی کشمیر آئے تھے تو انہوں نے شیخ عبداللہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یوں ہے:

بس اسی شیخ سے محبت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ

چونکہ جوش اور مجاز میں عام طور پر نہیں بنتی تھی لہازا مجاز نے اس نظم پر بھی طنز کرتے ہوئے کہا:

نطق رسوا، دہن دریدہ ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند برباد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

1946ء میں کشمیر میں تحریک آزادی مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کے خلاف شروع ہوئی اور اس نے دیکھتے دیکھتے ایک عوامی بغاوت کا رنگ اختیار کرلیا۔اس سے متاثر ہو کر اور اہل کشمیر کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاز نے بھی کشمیر پر ایک یادگار نظم لکھی جس میں اس نے کشمیر کے روشن اور تابناک مستقبل کی بشارت دی۔''نیا کشمیر'' عنوان کی یہ نظم یوں ہے:

نیا کشمیر

اک شرارا جھلملایا اور فضا میں کھو گیا
اک شرارا جانب خلد جواں آیا تو کیا
کوئی طوفان آئے اک کوہ گراں ہے اس طرف
کوئی طوفاں بر سر کوہ گراں آیا تو کیا
دست و بازو میں صلابت آ چکی فولاد کی
اب مقابل اک حریف نیم جاں آیا تو کیا

خود حقیقت پر پڑے باطل کا سایہ تا بہ کے
مہر عالم تاب کے آگے دھواں آیا تو کیا
دیر کی عظمت بھی ہے آخر مسلم ہم نفس
دیر کی محراب تک شور اذاں آیا تو کیا
چند بنیادی عناصر مائل پیکار ہیں
اک نئے کشمیر کی تشکیل کے آثار ہیں

☆☆☆

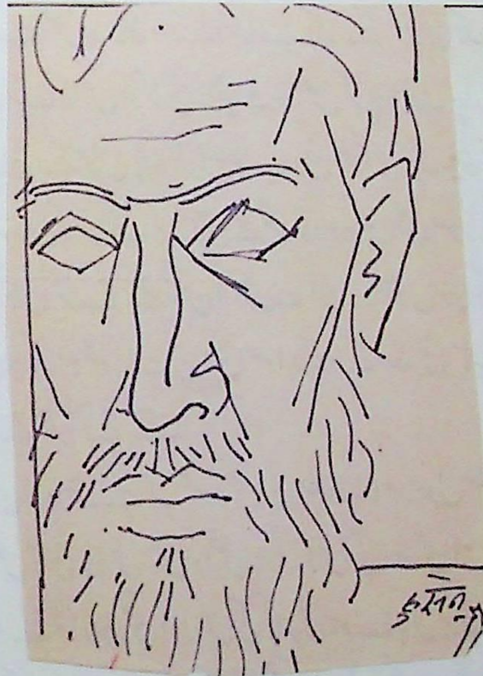
مقبول فدا حسین

ایک تحفہ میرے لئے سب کے لئے

یہ غالباً 1968ء کی بات ہے۔ اُن دنوں سری نگر میں ریزیڈنسی روڈ پر واقع انڈیا کافی ہاؤس یہاں کے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے احباب کے لئے گھنٹوں تک بیٹھنے اور گپیں ہانکنے کے لئے ایک خاص مرکز کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ چار آنے میں ملنے والی کافی کی پیالی کے عوض چند آرام طلب دن بھر اسی جگہ بیٹھ کر اپنی بے ربط باتوں سے دوسروں کو تو تنگ کرتے تھے مگر خود وہ کسی بھی صورت میں خاموشی اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اکثریت اُن دوستوں ہی کی تھی جو ادب، سیاست اور کئی دیگر موضوعات پر اپنی صوابدید کے مطابق سنجیدگی کے ساتھ اظہار خیال کرتے نظر آتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ مشہور کشمیری مصور غلام رسول سنتوش کے ہمراہ ایک دراز قد شخص کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ اُس کی داڑھی اس بند قہوہ خانے میں بھی گویا ہچکولے کھا رہی تھی اور اس کی کھچڑی ہوئے بال برف سے بھی زیادہ سفید تھے۔ اس کی عقابی ناک کے اوپر دو چمکتی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔





حسین کا خود بنایا ہوا اپنا قلمی خاکہ جو اس نے سرینگر میں خیال صاحب کو تحفہ کے طور پر عطا کیا

سنتوش اس بیحد دلکش شخصیت کو ہماری ٹیبل پر لایا اور اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ملک کے ممتاز مصوّر مقبول فدا حسین ہیں۔

حسین صاحب کا نام اگرچہ ہم نے سنا تھا لیکن اُن سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حسین خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے اور ہم میں سے ہر ایک کو گہری نظروں سے پرکھتے رہے۔ اس طرح یہ چھوٹی سی محفل ایک پُراسرار خاموشی کا مجسم بن گئی۔ اس تکلیف دہ صورت حال سے تنگ آ کر بالآخر میں نے ہی حسین صاحب سے مخاطب ہو کر یہ سکوت توڑا ''حسین صاحب کیا آپ اپنے قلم سے اپنا ہی خاکہ بنا سکتے ہیں؟'' سوال کچھ الٹ پھیر والا تھا کیونکہ عام طور سے دوسروں کی تصویریں لینا یا کینواس پر اُن کی شبیہ اُتارنا تو ایک عام سی بات ہے لیکن اپنی تصویر خود بنانے کا سوال بہت حد تک جواب طلب ہی رہ جاتا ہے۔ اُس وقت حسین صاحب کے پاس اپنی کوئی تصویر بھی نہیں تھی جسے دیکھ کر وہ یہ عکس مکمل کر لیتے۔ چند وقفوں کے لئے وہ خاموش رہے اور پھر مجھ سے کہا ''کاغذ ہے؟''۔ میرے پاس تو کاغذ نہیں تھا البتہ سنتوش نے اپنے تھیلے سے کاغذ کا ورق نکال کر حسین کو دے دیا۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی شبیہ کا خاکہ میرے ہاتھوں میں تھما کر کہا ''لیجئے یہ آپ کے لئے میرا تحفہ ہے''۔ حسین صاحب کی فنی برتری کا یہ نادر نمونہ آج بھی میرے لئے ایک انمول خزانے کی حیثیت رکھتا ہے اور میں نے اسے سالہا سال سے بیحد احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ (یہ نادر نمونۂ فن اس مضمون کے ساتھ شامل ہے۔)

مقبول فدا حسین ملک کے ممتاز مصور تھے جنہوں نے اپنے موقلم سے اپنے لئے وہ موضوعات منتخب کئے تھے جو اگرچہ خاص طور پر ہندوستانی کلاسیکی آرٹ کی مالا مال دنیا میں نئے نہیں تھے لیکن جس منفرد اور اچھوتے انداز سے

حسین نے ان موضوعات کو فنی شاہکاروں کا درجہ بخشا وہ شاید اپنی مثال آپ ہے۔

مقبول فدا حسین جس رفتار سے دنیا بھر میں قدر و منزلت کی پیار بھری نگاہوں کا مرکز بنتے گئے اسی قدر وہ اپنے ہی ملک میں اُن عناصر کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے رہے جو فنونِ لطیفہ کو بھی اپنے مخصوص متعصّبانہ نظریہ کے زاویے سے دیکھتے ہیں۔

حسین کے محبوب موضوعات میں ہندو دیویوں کو اُن کی بے لباس جسمانی شکل و شباہت کے ساتھ دکھانا بھی شامل تھا مگر ایسا کر کے انہوں نے اُن عناصر کے قہر کا دروازہ اپنے آپ پر وا کر دیا جنہیں وہ خود اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔

ہندوستان کی دیومالا سے وابستہ دیوی دیوتاؤں کو اپنی اصلی جسمانی حالت میں دکھانے کی روایت کا سلسلہ سینکڑوں سال سے جاری ہے۔ کھجوراہو، کونارک اور کامیا کھا کے تاریخی مندروں پر جو سنگ تراشی کی گئی ہے اس میں مرد اور عورت کو اس حد تک اُن کی فطری خواہشات میں ڈبو کر دکھایا گیا ہے کہ جنسی مباشرت کے واضح مناظر اس فنکاری کے ذریعہ ان قدیم یادگاروں میں جگہ جگہ کندہ ہیں۔ آج لاکھوں ہندو ان شاہکاروں کو دیکھ کر عش عش کر اُٹھتے ہیں مگر اُن کی زبان پر اس والہانہ ننگے پن کے خلاف کوئی آواز آج تک سنائی نہیں دی لیکن جب مقبول فدا حسین نام کا ایک مصور اسی موضوع کو اپنے فنی کمال سے آراستہ و پیراستہ کرتا ہے تو اس کے خلاف ایک بے ہنگم طوفان کھڑا کیا جاتا ہے کہ ایک مسلم مصور نے ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی جان بوجھ کر توہین کی ہے۔

حسین کی آواز ایک فردِ واحد کی آواز تھی اور وہ فیض احمد فیضؔ کی طرح نیم

خاموشی کے انداز میں بات کرتے تھے لہٰذا یہ دبی دبی آواز بھی اُن بنیاد پرست قوتوں کے سامنے ایک کمزور لہجے کی نقاہت میں ڈوب گئی۔

مشہور کالم نویس مدرار اکشس نے اس معاملے پر اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے: ''مقبول فدا حسین سے ناراضگی کی وجہ نہایت مصنوعی لگتی ہے۔ انہوں نے ایک دیوی کی برہنہ تصویر بنائی تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جو لوگ اُن پر حملے کر رہے تھے کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ معروف مصور اور آرٹسٹ راجا روی ورمانے ہندو دیویوں کی جتنی بھی تصاویر بنائی ہیں ان میں برہنگی کی حدیں پار نظر آتی تھیں۔ دوسری صدی اور اس کے بعد مندروں میں جو آرٹ کے نمونے پیش کئے گئے وہ بھی پوری طرح بے لباس ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کھجوراہو میں جگہ جگہ دیواروں پر جو نقشے نظر آتے ہیں وہ کیا ہیں؟ یہاں تک کہ شو پاروتی کی کوئی بھی مشہور مورتی کپڑے پہنے ہوئے نظر نہیں آتی۔ مزید آگے جائیں تو کالی داس کے کمار سمبھو کا آٹھواں باب اتنا فحش ہے کہ کوئی بھی اس کا ہندی ترجمہ شائع نہیں کرنا چاہے گا لیکن اُن کے ساتھ یا ان کی تصویر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جیسا حسین کے ساتھ ہوا۔ اُن پر مقدمات قائم کئے گئے۔ اس کے بعد 2006ء میں انہوں نے اس مٹی سے بظاہر رشتہ توڑ لیا جو اُن میں رچی بسی تھی''۔

حسین کو قتل کی دھمکیوں، عدالتی مقدمات اور بہیمانہ نوعیت کے مقابلے کے گرداب میں گھر کر اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑنا اور دبئی، قطر اور لندن کی دشت نوردی کرتے کرتے آخر یہ 95 سالہ فخرِ ہندوستان انگلستان کے ایک ہسپتال میں 9 جون 2011ء کو انتقال کر گیا۔

اس طرح سے حسین کے جس فن نے ہندوستان کی عظمت رفتہ کو کینواس پر منتقل کر کے دنیا بھر میں اس حد تک پذیرائی حاصل کی تھی کہ اس کا ایک ایک فن

پارہ کروڑوں روپے میں خریدا گیا اسی فن کو ہند کی آزاد فضا میں اُڑنے والے پنچھیوں کے پر کاٹنے والوں نے مذہب کا مذاق اُڑانے کے مترادف اقدام قرار دیا:

قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اُتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

ہندوستان کے فلمی دارالخلافہ ممبئی میں کچھ عرصے تک مقبول فدا حسین کے فلمی اداکارہ مادھوری دکشت پر فدا ہونے کا بھی خاصا چرچا رہا۔ اس میں حسین کا کوئی دوش نہیں۔ مرد خواہ عمر کی کسی بھی دہلیز پر بیٹھا ہو ایک خوبصورت نسوانی چہرہ دیکھ کر اس کا دل ضرور زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ کشمیری میں اس حوالے سے یہ کہاوت مشہور ہے کہ ''بڈہ عشق گوو موہرہِ مشک'' یعنی بوڑھے کا عشق ایک اشرفی کے بدلے خوشبو کی ایک چٹکی حاصل کرنے کے برابر ہے۔ آپ میں سے جس نے فلم ''ہم آپ کے ہیں کون'' دیکھی ہوگی تو وہ مادھوری کے قیامت خیز، جذبات انگیز اور مردانہ جبلت کو شعلوں میں لپیٹنے والے حسن کو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اس تعلق سے مقبول فدا حسین کو کچھ عرصے تک مادھوری (پر؟) فدا حسین کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اس کے بعد ودیا بالن پر اس پیر ہندی کا عاشق ہونا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

عورت حسین کی کمزوری تھی یا نہیں اس بحث سے قطع نظر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ فلمی دنیا کی خوبصورت حسیناؤں کو اپنی آنکھوں میں ان کی دلکشی اور دلربائی کے ساتھ جذب کرنا چاہتے تھے کیونکہ حسین تو بہرحال ایک حساس فنکار تھے اور فن کاروں میں حسن کی عبادت کا شوق اُسی طرح موجود رہتا ہے جس طرح ٹینی سن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے قریب ترین تعلقات انگلستان کے شاہی خاندانوں کے ساتھ رہے ہیں اور بقول کیٹس حسن ایک

صداقت ہے اور صداقت حسن ہے۔ حسین بھی مادھوری میں اسی حسنِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہے ہوں گے۔ یہ حسنِ بے مثال ہیلن، قلوپطرہ، مینکا سے لے کر مادھوری تک بدستور شاعروں اور قلمکاروں کے دلوں میں اُتر کران کے روم روم میں زندگی اور حرکت کی حدت وحرارت کی دہکتی آگ کو ہوا دیتا رہا ہے۔

یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے کہ عاشق حسین نے مادھوری دکشت کے جادو کو اپنے سر چڑھا کر فلم ''ہم آپ کے ہیں کون'' 67 بار دیکھی اور ایک بار تو مادھوری ہی کی ایک اور فلم ''آجا ناچ لے'' کسی اور کی موجودگی اور شور شرابے کے بغیر دیکھنے کی غرض سے ممبئی کا ایک پورا سینما ہال بک کرلیا۔

مادھوری کو اپنے خوابوں میں حقیقت کا روپ دینے کی غرض سے انہوں نے ''گج گامنی'' نام کی ایک فلم خود بنائی جس میں مادھوری نے شاہ رخ خان کے ساتھ مرکزی کردار کا رول ادا کیا۔

ممبئی کی صنف نازک کے متعلق جن دیگر اداکاروں نے اپنی اداؤں سے مقبول فدا حسین کا دل جیت لیا ان میں تبو، ارملا ماتونڈکر، امریتا راؤ، ودیا بالن اور انوشکا شرما شامل ہیں۔

جب پردیس میں مقبول فدا حسین کی موت ہوئی تو ہندوستان میں اس سانحہ پر کوئی ماتمی لہر نہیں دوڑی البتہ ممبئی کے چند فلمی فنکاروں نے ان کی موت کا ماتم کیا جن میں دیو آنند، شبانہ اعظمی، ششیکھر کپور جیسے گنتی کے لوگ شامل تھے۔ امیتابھ بچن نے اُن کے بارے میں اپنا اظہارِ غم یوں کیا ''ایم ایف حسین فنکار، مصور، دوست اب نہیں رہا۔ افسوس صد افسوس! اس کے کئی فن پارے میرے گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے ایک بہت ہی خوبصورت تصویر تحفتاً بخش دی جس میں ہنومان کو سنجیونی بوٹی لے کر اُڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ تحفہ اُس نے مجھے ممبئی کے بریچ کینڈی ہسپتال میں دیا جہاں میں ''قلی''

کی عکس بندی کے دوران زخمی ہونے کے بعد زیرِ علاج تھا۔ میں نے اسی ہسپتال میں ایک نظم لکھی جس کا ترجمہ اُس نے کیا۔ کینواس پر وہ بہت بڑی خصوصیت کا حامل اور سب سے زیادہ پیارا فنکار تھا"۔

حسین کی شخصیت اور فن کی جس طرح سے ہزاروں تاویلیں کی گئیں ایسا ہر ممتاز قلم کار یا دانشور کے ساتھ ہوتا آیا ہے لیکن خود انہوں نے اس مختصر سے جملے میں اپنی ساری کہانی کا خلاصہ کیا ہے:

"مقبول ایک لڑکا تھا جو پینٹنگ کیا کرتا تھا۔ حسین ایک آرٹسٹ ہے اور ایم ایف حسین ایک برانڈ"۔

ایک طرف ہندوستان نے انہیں پدم شری، پدم بھوشن، پدم وبھوشن اور کئی اور اعزازات سے نوازا مگر صد حیف کہ دوسری طرف ان کی خود پر عائد کردہ جلاوطنی کے بعد اُس سطح پر اُن کی باعزت واپسی کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی جس کے نتیجے میں انہیں پھر وطن واپس آنے کا موقعہ ملتا جہاں کی مٹی سے انہیں بیحد پیار تھا۔ اس طرح سے انسان کی عظیم قدروں کی روشنی تنگ نظری اور تعصب کے اندھیرے پر غالب نہیں آسکی۔ ایسا ہونے پر ملک کے عاقبت اندیش اصحاب فہم و دانش اس سانحہ پر تاابد غم و یاس اور غصے کا اظہار کرتے رہیں گے۔ صدیوں کا عرصہ گزر جانے کے بعد ملک نے حسین کی شکل میں جو ایک انمول ہیرا حاصل کر لیا تھا اُسے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے کیچڑ میں ملا کر اپنی بے نور آنکھوں سے خود ہی دور کر دیا:

کس نے یہاں کی ہے خطا ہم سے پوچھئے
پھر کس نے اس کی بھگتی سزا ہم سے پوچھئے

☆☆☆

کشمیری لال ذاکر

کشمیر کا گُل صد رنگ

کشمیری لال ذاکر کا نام یوں تو میں نے جوانی کے دنوں میں ہی سنا تھا اور میرے ذہن میں اِس اردو کہانی کار کی تصویر کے جو نقوش ثبت ہوئے تھے اُن کا حسین ترین پہلو یہ تھا کہ میں اُس کے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا کہ وہ کشمیر نژاد کشمیری بولنے والا ادیب ہوگا۔ اس حسین تصویر کا نصف صحیح ثابت ہوا۔

ذاکر صاحب تو جموں وکشمیر کے پہاڑی ضلع پونچھ میں پیدا ہوئے لیکن وہ کشمیری زبان سے نابلد ہی ہیں۔ اس کے باوجود جب میں نے اُن کی چند مطبوعات کا بغور مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کی محبت اُن کی رگ وپے میں رواں دواں خون کی طرح سرایت کی چکی ہے اور کشمیر تو اُن کی یادوں کی بارات بن چکا ہے۔

ذاکر صاحب کے ساتھ کئی سال قبل سری نگر میں ایک ادبی سیمنار میں جب اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے اس ستر سالہ شخص کو زندگی کی حدت وحرارت سے مالا مال اور اُن کی ہر ادا کو قوتِ شباب سے سرشار پایا۔

کشمیری لال ذاکر ہم عصر اُردو دنیا کے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی کتنی تصانیف تاحال شائع ہو چکی ہیں لیکن میں نے اُن کے تخلیق کردہ ادب کا جو بھی پہلو پرکھنے کی کوشش کی



کشمیری لال ذاکر

وہاں وہاں اُس میں مصنف کی انسانی زندگی کے ساتھ شفقت اور انسانی قدروں کا احترام واحتشام نظر آیا۔ یہ اُس قلم کار کا فکری نظریہ ہے جس کے نحیف ونزار جسم کے اندر ایک ایسا دل موجود ہے جو چھوٹے چھوٹے صدمے کی ٹھوکر کھا کر موم کی طرح پگھل جائے۔

کشمیری لال ذاکر نے نہ صرف اپنے نام کی مناسبت سے بھی کشمیر کو اپنی کہانیوں کا مرکزی موضوع بنایا ہے بلکہ اس جنتِ ارضی کی مدح سرائی میں مدھر اور رسیلے گیت بھی گائے ہیں۔

ذاکر صاحب نے اپنی جوانی میں وہ کشمیر دیکھا جہاں دریائے جہلم کی لہروں پر رات کو بھی شکارے چھوٹی چھوٹی قطاروں میں مقامی شب بیداروں اور بیرونی سیاحوں کو سری نگر شہر کی سیر کراتے تھے اور ان شکاروں میں ٹمٹماتے ہوئے مٹی کے چراغ اس دریا کو ایک طلسمی چراغاں سے منور کرتے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی آج بھی ذاکر صاحب کی بے چین روح کو اُس منزل کی طرف رہنمائی کرتی نظر آرہی ہے جہاں حدِ نظر سے آگے اور کوئی حد نظر میں نہیں آسکتی۔

اُن خوبصورت دنوں کی یاد ذاکر صاحب نے ان الفاظ میں تازہ کردی ہے۔

"(سری نگر کشمیر میں) یہ میری زندگی کا وہ زمانہ تھا جب میں نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں نامعلوم محبت کی ہلکی ہلکی گرمی محسوس کی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں سری پرتاپ ہائی سکول کی بڑی پُر وقار عمارت میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور سکول کے بعد گھر لوٹنے سے پہلے کچھ وقت ریزیڈنسی روڈ سے ملحقہ خوبصورت پھولوں سے آراستہ پرتاپ پارک میں گزارتا تھا اور ہر روز دیر سے گھر پہنچتا تھا۔ پرتاپ پارک سے میری بڑی ہی پیاری وابستگیاں آج تک زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی روپ میں میری تحریروں میں جلوہ ریز ہوتی رہتی ہیں۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ سری نگر چھوڑنے سے تین دن پہلے میں اُن تمام جگہوں میں بھٹکتا رہا جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ شالیمار اور نشاط باغ،

چشمۂ شاہی، ڈل جھیل، شنکر آچاریہ کا مندر، نسیم باغ، شیر گڑھی کے محلات، بٹہ مالو کا وسیع میدان جس میں ٹکٹکی پر چڑھا کر سیاسی ورکروں کو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ اپنے سکول کے بہت پرانے اور گھنی چھاؤں والے چناروں میں دن بھر گرتے بے شمار پتوں کو اکٹھا کرتا رہا اور انہیں سنبھال کے گھر لے آیا۔ جس پر مجھے والدہ کی جھڑکیاں بھی ملیں اور انہوں نے بہت سے پتوں کو وزیر پچھمن کی عمارت کی دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ میں اُن پتوں کو ہوا میں اُڑتے ہوئے بے بسی سے دیکھتا رہا اور روتا رہا"۔

حالات بدلتے گئے۔ ذاکر صاحب کشمیر چھوڑ کر چلے گئے اور بالآخر انہیں ہندوستان کی وسیع وعرض ادبی دنیا نے اپنی گود میں جگہ دی۔ اس طرح وہ اس کاروان کے ان تھک راہی بن گئے جس کے قافلہ سالاروں میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی شامل تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سبھی ہم عصروں سے متاثر ہوئے بغیر اپنا ایک جداگانہ اسلوب اور تجربات کے اظہار کا مخصوص اندازِ بیان اپنے لئے تخلیق کیا۔ احمد ندیم قاسمی ذاکر صاحب کی ان بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کشمیری لال ذاکر اردو افسانہ نگاری کے منور ترین دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس سنہری دور کو کرشن چندر، منٹو اور بیدی کی تخلیقات سے جو روشنی اور توانائی حاصل ہوئی اُس کی گواہ اُردو ادب کی تاریخ ہے۔ اُس خاص دور میں کسی دوسرے افسانہ نگار کا افسانے کے ذہین قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لینا مشکل تھا۔ مگر کشمیری لال ذاکر نے یہ مشکل اپنے تخلیقی جوہر کی مدد سے آسان بنالی۔ اس نے متوسط اور زیریں طبقات سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو حد درجہ سچائی اور حقیقت پسندی سے پیش کیا ہے۔ اور اُن کی نفسیات کا مطالعہ کمالِ گہرائی سے کیا ہے۔ پھر کشمیری لال ذاکر کا اسلوبِ اظہار دلآویز، اُس کی زبان صاف اور سلیس اور اُس کا اندازِ بیان ایسا رواں ہے جیسے افسانہ پڑھنے والے کے ساتھ اُس کی دوستانہ گفتگو ہو رہی ہے اور یہ کسی افسانہ نگار کا معمولی کارنامہ نہیں ہے"۔

ذاکر صاحب کے ساتھ میرے تعلقات ایک پُرشفقت دوستی میں اس طرح تبدیل ہوئے کہ وہ مجھے ہریانہ اُردو اکادمی کے سیمناروں اور مناظروں میں شرکت کی دعوت بار بار دیتے رہے۔ اُس دوران مجھے یہ دیکھ کر کسی حد تک حیرانی ہوئی کہ 80 سال کی عمر کی دہلیز پر کھڑا یہ مردِ بزرگ ایک نوجوان کی طرح اپنے کام کاج کو اپنی پوری جسمانی اور ذہنی طاقت کے سہارے سرانجام دے رہا ہے۔ یہ قوتِ ارادی میں نے بہت کم بزرگوں میں دیکھی ہے۔

اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''برف، دھوپ، چنار'' تو مکمل طور پر کشمیری کینوس پر رنگ بکھیرے ہوئے ہے۔ کشمیر کی برف اور چنار کے عظیم درختوں کی طرح یہاں کی دھوپ بھی انسان کے انگ انگ کو پُراسرار طریقے پر ڈھلتی جوانیوں اور کہنہ سالی کو شبابِ تازہ کا فیضان عطا کرتی ہے۔

ذاکر صاحب کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کشمیر سے سالہا سال دور رہنے کے باوجود بھی جب وہ کشمیر کے پس منظر میں کوئی کہانی لکھتے ہیں تو اُس میں تاریخی اور حقیقی لحاظ سے ناموں اور مقامات کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ کرتار سنگھ دگل اور ملک راج آنند کی طرح انہوں نے کبھی ایک ایسے خیالی کشمیر کو تخلیق نہیں کیا جس کا حقیقت سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔ دگل کا ''اور دیا بجھ گیا''، آنند کا ''شہید'' اور سلیم خان گمی کی ''کشمیر ادب اور ثقافت'' اس مبالغہ آرائی کی چند مثالیں ہیں۔

''دریائے جہلم، اس کی سست رفتار لہریں اور لہروں پر تیرتے شکارے اور ہاؤس بوٹ آج بھی میرے تحت الشعور میں دن رات ہچکولے کھاتے رہتے ہیں اور میں ان کی دلنواز خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔ خوبصورتی اور حسن سے میرا لگاؤ لڑکپن سے شروع ہو گیا تھا۔ جو آج بھی اُسی شدت سے قایم ہے۔

''کشمیری پنڈتوں کی شادیوں کی کئی بہت ہی پیاری رسمیں میں نے دیکھیں جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا لیکن ان سے بھی پیارے وہ کشمیری

لوک گیت تھے جو لڑکیاں رات بھر دف بجا کر گا رہی تھیں۔ (اسے کشمیری میں ممنج ناری کہتے ہیں)

قائم مجھے آج بھی پُر سکون پانیوں، میٹھی میٹھی خنک دھوپ اور اونچے اونچے پہاڑوں پر آرام سے سوئی ہوئی برف کی دوشیزاؤں سے محبت ہے۔ اور اُن کی پر چھائیاں میری کہانیوں میں اور میرے ناولوں میں جگہ جگہ عکس ریز ہوتی رہتی ہیں"۔ یسا دکھائی دیتا ہے کہ کشمیری سماج کے گونا گوں پہلوؤں اور رسوم ورواج کا گہرا مشاہدہ کرنے کا شوق ذاکر صاحب کے لئے ایک محبوب شغل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ کشمیر صدیوں سے فرقہ وارانہ میل ملاپ اور مذہبی رواداری کا ایک حسین گہوارہ رہا ہے اور یہاں کے معاشرتی نظام میں ہر کشمیری اس رنگارنگ تہذیبی اور ثقافتی وراثت کا امین ہے۔ ان امانت داروں میں ذاکر صاحب بھی شامل ہیں جنہوں نے کشمیر کے اقلیت پنڈت فرقے کی شادی کی بھی ایک دل نشین انداز میں منظر کشی کی ہے۔ یہ اُن کے ناول "لمحوں میں بکھری زندگی" سے ایک اقتباس "کشمیری پنڈتوں کی شادیوں کی کئی بہت ہی پیاری رسمیں میں نے دیکھیں جن کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا لیکن ان سے بھی پیارے وہ کشمیری لوک گیت تھے جو لڑکیاں رات بھر دف بجا کر گاتی رہی تھیں۔ (اسے کشمیری میں ممنج ناری کہتے ہیں)۔ گوری گوری دودھ سی چٹی لڑکیاں، جن کے گالوں پر میدہ اور سندور گھلا تھا۔ جن کے جسم بیدِ مجنوں کی طرح لچک دار اور جن کی آنکھیں ڈل کے پانی کی طرح گہری اور جن کے بال کیلاش پربت پر منڈلاتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح پیچ دار اور سیاہ تھے۔ جب وہ گاتی تھیں تو ایسا لگتا تھا کہ راجہ اندر کے دربار میں اپسرائیں گا رہی تھیں۔ سورگ تو خیر کسی نے نہیں دیکھا لیکن اُس کی جو کلپنا کی جاسکتی ہے وہ میرے سامنے موجود تھی۔"

سلوچنا کی ایک سہیلی نے جب گیت کے یہ بول اُچھالے تو ساری فضا مہک اُٹھی۔

باغچ آسس ببرے تھا جی

تاوَن زاجی نس

(میں باغ میں گلِ ریحان کی طرح مہک رہی تھی کہ دہکتی آگ نے مجھے بھون کے رکھ دیا)

مجھے گیت کے معنی نہیں آتے تھے لیکن لگتا تھا جیسے اس لڑکی کی خوبصورت مترنم آواز نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ کتنی پُر سوز اور دردیلی آواز تھی اُس لڑکی کی۔ جب میں نے اپنے پاس بیٹھی ایک اور لڑکی سے اس گیت کے معنی پوچھے تو اس نے بتایا کہ یہ پیار کرنے والی ایک لڑکی کے جذبات تھے جو جدائی کے جھلس دینے والے لمحوں میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ باغ کی ایک نازک کلی تھی جسے شدید تمازت نے مرجھا ڈالا تھا۔"

کشمیری لال ذاکر کا وطن مالوف کشمیر جب بھی حالات کے تھپیڑوں کی زد میں آ کر اپنی پُرسکون اور پُرامن زندگی کے رنگ و روپ سے محروم ہو جاتا ہے تو ذاکر صاحب اپنی اُس والہانہ عقیدت اور ہمدردی کا اظہار پھر ایک کشمیری قوم پرست کی طرح اس طرح کرتے ہیں گویا اُن کے دل پر کسی نے پے در پے ضربیں لگائی ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

"آپ میری کشمیر کی کہانیاں پڑھیں گے تو تقسیم کے بعد سے اب تک ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ زینہ بہ زینہ آپ تک پہنچے گی اور آپ جان جائیں گے کہ ریاست کے عوام کن کن مشکل مرحلوں سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں۔ لیکن یہ بھی اُن کی منزل نہیں ہے۔ کشمیری عوام کی آخری منزل ابھی دور ہے لیکن وہ مایوس نہیں۔ کشمیر کا رہنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا کہ یہی اُس کی وراثت ہے جس کی وہ کئی صدیوں سے حفاظت کئے جا رہا ہے"۔

کشمیر کی سدا بہار خوشیوں، دل شکن صدموں اور صدیوں پر پھیلی ہوئی کامرانیوں اور ناکامیوں کی ایک طولانی داستان کو کشمیری لال ذاکر کے سوا اردو ادب کے کسی ہم عصر ناول نگار یا افسانہ نویس نے اُن سے زیادہ شدتِ احساس

اور بہتری کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے۔

جب انہوں نے ازراہِ کرم اپنے افسانوی مجموعہ ''برف، دھوپ، چنار'' کے لئے مجھ سے پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے اُن کے فن کی قدردانی کے طور پر ایک مختصر سے نذرانہ کی شکل میں یہ الفاظ قلم بند کئے جنہیں یہاں پر بارِ دگر درج کرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنی اس تحریر کو اختتام پر لاتا ہوں۔

''کشمیری لال ذاکر دبستانِ اردو میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ گزشتہ نصف صدی سے اردو زبان اور ادب کے گیسو سنوارتے رہے ہیں اور اس پُر جمال اور پُر کمال فنی سلسلے کو انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور فنکارانہ نزاکتوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔

ذاکر صاحب کا سرزمین کشمیر سے ایک خاص تعلق رہا ہے جو کہیں کہیں پر عشق کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کشمیر کی جنت کے گونا گوں رنگوں اور اس میں رہنے والے نجیب، چرب دست اور تر دماغ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ اپنے افسانوی ادب میں پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

کشمیر پر اُن کی تازہ ترین کہانیوں کا یہ مجموعہ اُن کے فنی سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان کے افسانوں میں بھی افسانہ نگار کا وہ دل زور زور سے دھڑک رہا ہے جو کشمیر کے برف پوش کوہساروں، روپہلی آبشاروں، دلنواز نظاروں اور عطر بیز مرغزاروں کے جادوئی ماحول میں عشق کی حدت و حرارت سے بار بار پگھلا اور کئی بار موم ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔

خدا کرے کہ اُن کا یہ دل اب بھی نہ ٹوٹے اور زیرِ نظر مجموعہ اُن کے بہت بڑے نام کو اور بھی بلند و بالا کرنے کا باعث بن جائے''۔

☆☆☆

خیال نامہ

نہ سکوں کا پل بھی نصیب ہے نہ قرار ہی کا سوال ہے
جو بھری ہے درد و سکون سے وہی داستان خیال ہے

میری ادبی زندگی کا آغاز 1951ء سے ہوتا ہے جب میں شہر سری نگر کی اس وقت کی مایہ ناز تعلیمی درس گاہ اسلامیہ ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا۔ میرے اختیاری مضامین میں عربی بھی شامل ہونے کے ناطے یہ زبان کشمیر کے ایک ممتاز عالم دین اور سکالر مرحوم مولانا غلام نبی مبارکی ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مبارکی صاحب ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میری دلچسپی شاعری کے اوزان اور ردیف و قافیہ کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس طرح سے میں نے 1952ء میں اردو میں پہلی غزل لکھی جو جالندھر پنجاب کے ایک رسالہ ''راہی'' میں شائع ہوئی۔

انہی دنوں میرے ایک ہم جماعت نے دہلی کے مشہور فلمی رسالے ''چترا ویکلی'' کے مطالعے کا شوق مجھ میں پیدا کیا اور میں ہر ہفتے یہ رسالہ امیرا کدل کے اونکار برادرس بک شاپ سے خرید کر گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھنے لگا کیونکہ ہمارے گھر میں فلمی باتیں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ میں اردو افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اس دوران میں نے جو درجنوں افسانے لکھے وہ اسی ''چترا ویکلی'' میں جی این برسات۔ شہباز کشمیری اور صادق رضوانی کے میرے قلمی ناموں سے شائع ہوئے۔

یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے۔ جب میں نے اپنا اولین اردو افسانہ لکھا تو ان دنوں مرحوم پیر عبدالاحد سری نگر میں اخبار ''الحق'' کے ایڈیٹر تھے۔ لال چوک میں مشہور سیاست دان مرحوم غلام محمد صادق اور مرحوم خواجہ غلام محی الدین قرہ کی بیٹھک میں اس اخبار کا بھی دفتر تھا۔ ایک روز میں سہما سہما پیر صاحب کے پاس گیا اور ان سے گذارش کی کہ وہ میرا یہ افسانہ شائع کریں۔ اخبار کے اگلے شمارے میں افسانہ شائع تو ہوا لیکن کاتب نے اسے نامکمل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح سے افسانے کا اختتام جسے ہم ان دنوں فلمی اصطلاح میں The End کہا کرتے تھے اشاعت سے رہ گیا تھا۔ میں پھر پیر صاحب کے پاس گیا اور اس طرف ان کی توجہ دلا کر ان سے التجا کی کہ افسانے کا اختتامی حصہ بھی چھاپ دیں تاکہ پوری چیز پڑھنے والوں کے سامنے آسکے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے ''ضروری نہیں ہے کہ کسی افسانے کا اختتام بھی ہو۔ آپ کا افسانہ میں نے چھپنے کے بعد پڑھا ہے اور یہ مجھے The End کے بغیر زیادہ اچھا لگا ہے''

میرا اردو افسانہ نگاری کا شوق پھر بھی قائم رہا البتہ میرے یہ فلمی ٹائپ کے افسانے سوائے ''چترا ویکلی'' کے اور کوئی اخبار یا رسالہ شائع کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوا۔ یہاں پر یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس مقبول عام رسالے میں ہر ہفتے اس کے مستقل قارئین کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ اولین خط بغیر کسی ناغہ کے ''قلوپطرہ'' نامی کسی پراسرار نسوانی شخصیت کی طرف سے ہوتا تھا جس کا اتا پتا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کشمیر کے 'چترا پریمیوں' میں باقاعدہ مراسلہ نگاروں میں جموں کا لیکھ راج چھاپڑہ۔ حسن شش و پنج (حسن ساہو) اور ہمدم کشمیری (عبدالقیوم خان) شامل تھے۔

اس زمانے میں وہ دن میری دلی مسرت اور ذہنی آسودگی کا ایک عظیم دن

تھا جب اسلامیہ ہائی اسکول کے وسیع وعریض ہال میں میں نے ایک مشاعرے میں پہلی بار ایک کشمیری نظم پڑھی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض مرزا غلام حسن بیگ عارف انجام دے رہے تھے اور اس مشاعرے میں موجود میرے استاد مولانا مبارکی دل کھول کر مجھے داد دے رہے تھے۔ کشمیری۔ اردو اور فارسی زبانوں میں منعقدہ اس محفل سخن میں محمد امین داراب۔ مرزا کمال الدین شیدا۔ خوشباش کشمیری۔ مبارک شاہ فطرت گیلانی، پروفیسر نند لال طالب، غلام نبی عارض اور فاضل کشمیری کے علاوہ مولانا مبارکی نے بھی شرکت کی جنہوں نے اردو میں دلوں کو چھو لینے والی اور آنکھوں کو اشک بار کرنے والی ایک نعت محمدؐ سنائی۔

جہاں مولانا مبارکی نے ذہنی طور پر مجھے سخن گوئی کی طرف مائل کرایا وہاں پہلے پہلے رحمان راہی میری کشمیری نظموں اور غزلوں کی اصلاح کرتے رہے اور اس مناسبت سے میں انہیں بھی اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔

اپریل 1955ء میں مَیں ریڈیو کشمیر سری نگر میں اناونسر اور نیوز ریڈر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ سری نگر کے ریڈیو سٹیشن میں اُن دنوں کئی ادیب، شاعر اور ڈراما نگار جمع ہوئے تھے جن میں سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، غلام حسن اعجاز، پران کشور، علی محمد لون، اکبر لداخی، پشکر بھان، قیصر قلندر، وی ایس این کیمفر، کنول نین پرواز اور شفیع شفائی قابل ذکر ہیں۔ انہیں میں سے چند ایک مقامی حضرات کی ترغیب اور وساطت سے میں نے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کشمیر کلچرل کانفرنس کی ہفت روزہ ادبی نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرنا شروع کیا۔ یہ وہ دن تھے جب کئی کشمیری ادیب اور شاعر اردو ہی میں لکھا کرتے تھے جن میں رحمان راہی، دینا ناتھ نادم، اختر محی الدین، حبیب کامران اور امین کامل وغیرہ شامل تھے۔ امین کامل کی اُن

دنوں کی شاعری کچھ اس طرح کی ہوا کرتی تھی:

دیکھو تو پردیسی! ٹرومین دیتا ہے یہ کس کو دھمکی
ایٹم بم کی؟
کیا ہم جنگی بھوتوں کے آگے
جیتے جی جھک جائیں گے؟

اور نادم کا یہ شعر آج بھی مجھے یاد ہے:

بھڑکا نہ سکے آگ جو تڑپا نہ سکے خون
اس شاعر بے شرم بے ایماں کو بدل دو

انہی دنوں کا قصہ ہے کہ رحمان راہی نے ممتاز روسی ادیب میکسم گورکی کی مشہور نظم "موت اور دوشیزہ" کا اردو ترجمہ کانفرنس کے کشمیری جریدے "کونگ پوش" (زعفران کا پھول) میں اپنے نام سے چھپوا کر ایک تہلکہ مچا دیا۔ کانفرنس کی ایک ہفت روزہ میٹنگ میں جب یہ نظم زیر بحث آئی تو نام نہاد ترقی پسندوں نے اس کی ہیت اور مواد کے پیش نظر اسے قابل ملامت اور زندگی سے فرار پر محمول قرار دیا۔ بعد میں جب انہیں پتہ چلا کہ یہ تخلیق انہی کے ایک ادبی پیغمبر گورکی کی ہے تو وہ شرمندہ ہوئے اور ان کی کھوکھلی تنقید کے ساتھ ہی راہی کی اس حرکت سے کانفرنس کے پرسکون ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔

رفتہ رفتہ کشمیر کے سبھی اہل قلم محسوس کرنے لگے کہ ادب یا شاعری میں ترسیل و ابلاغ کے موثر ترین ذریعہ کا شرف مادری زبان کو ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان سبھی نے اردو کو ترک کر کے کشمیری میں لکھنے کا آغاز کیا اور "کونگ پوش" کی اشاعت کے باقاعدہ ہو جانے سے یہ تخلیقات متواتر طور پر شائع ہوتی رہیں۔ اس کشمیری رسالے کے ادارتی بورڈ میں نور محمد روشن اور عبدالعزیز ہارون کے ساتھ مجھے بھی شامل کیا گیا۔

ابتداء میں اگرچہ کشمیری ادیبوں اور شعراء کی تخلیقات سامراج کی تردید، ایٹم بم کی تباہ کاریوں اور امریکی اور یورپی سیاست کی مخالفت اور روس کی نام نہاد ترقی پسندی، سرخ سویرا اور لال انقلاب کے محور کے اردگرد ہی گھومتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوتی گئی جس نے جذبات پرستی اور درآمدی سیاست گری کے برعکس مقامی محسوسات اور شاعرانہ خیالات کو فکروفن کے رنگ وروغن سے آراستہ وپیراستہ کیا۔

اُدھر ریاست جموں وکشمیر کے وزیراعظم بخشی غلام محمد نے ایک سالانہ ادبی اور ثقافتی جشن کا اعلان کیا جو ''جشن کشمیر'' کے نام سے 1956ء سے کئی سال تک ریاست جموں وکشمیر اور بالخصوص مسلم آبادی والی وادئ کشمیر میں دھوم دھام سے منایا جاتا رہا۔ اس جشن کا مقصد یہی تھا کہ کشمیری مسلمانوں کو سیاست گری کی اس راہ پر پھر گامزن ہونے سے روکا جائے جس پر وہ 1947ء میں ہی چل پڑے تھے جب ان کے نام نہاد رہبروں نے ان کے سیاسی مستقبل کا سودا کر کے ریاست کو ایک متنازعہ علاقے کی حیثیت بخشی تھی۔

جشن کشمیر کا انعقاد ہوا تو غلام رسول نازکی کو سیکریٹری کا رتبہ مرحمت کیا گیا۔ اس جشن کے نتیجے میں وادی کے گوشے گوشے میں ناچ گانے، مشاعروں، قوالیوں، سنگیت کی محفلوں اور لہوولعب کی ایسی سرگرمیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ کشمیری قوم واقعی کچھ عرصہ تک اپنی سیاسی بے بسی اور اقتصادی بدحالی کو بھول کر اس مست ومخمور دنیا کی رنگینیوں میں کھوگئی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک ایسی ہی محفل سماع میں جب جنوبی کشمیر کے ڈورو شاہ آباد علاقے میں حبیب پینٹر نے قوالی کی شکل میں امیر خسروؒ کی یہ نعت گائی:

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

تو کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی سرخ آنکھوں سے حاضرین پر معنی خیز نظریں ڈالتے ہوئے وزیر اعظم بخشی غلام محمد وجد میں آکر ناچنے لگے اور ان کی بے ہنگم جسمانی حرکتوں کی داد دیتے ہوئے ان کے وہ کئی حواری بھی ایک قسم کا تانڈو ناچ کرتے رہے جو اس شعر کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھے۔

''جشن کشمیر'' کے سلسلے میں سری نگر میں سال میں کئی کل ہند مشاعرے ہوتے رہے جن میں جگر مراد آبادی۔ فراق گورکھپوری، انور صابری، انور مرزا پوری، فضا ابن فیضی، فنا نظامی کانپوری، ساغر نظامی، اختر رضوانی، نریش کمار شاد، غلام رسول نازکی، محی الدین نواز رتن پوری، رسا جاودانی، جگن ناتھ آزاد، محی الدین قادری زور، راہی معصوم رضا، شمیم کرہانی، نشور واحدی، سکندر علی وجد، سلام مچھلی شہری، منور لکھنوی، خمار بارہ بنکوی، شاذ تمکنت، وحید اختر، عرش ملسیانی، نخشب چارجوی، روش صدیقی اور دیگر شعرا برابر شریک ہوتے رہے۔

ایک مشاعرہ ''تاریخ ادب اردو'' کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی صدارت میں سری نگر کے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں ہوا جس میں انور صابری نے حاکم وقت بخشی کی مدح سرائی میں اس طرح زمین و آسمان کے قلابے ملادئے کہ سامعین میں بیٹھے ہوئے ایک کشمیری شاعر نے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ شعر لکھ کر صدر محفل کے ہاتھ میں تھمادیا:

جگؔر سے جوؔش سے مخمؔور سے واقف ہے میخانہ
یہ انوؔر صابری کس....... کا نام ہے ساقی

بخشی غلام محمد نے غالباً ہندوستانی مسلمانوں کا دل موہ لینے کی خاطر بھی ان اردو شاعروں کی آؤ بھگت اور خاطر داری میں اپنے مالی ذرائع کو مصرف میں لانے کی خاص ہدایت کی تھی۔ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جب جگر مرادآبادی کی طرف سے یہ جواب موصول ہوا کہ وہ صرف اسی صورت

میں کشمیر آسکتے ہیں کہ انہیں ہوائی سفر کا ٹکٹ دیا جائے تو بخشی نے اپنے سیکرٹری سے کہا ''جگر صاحب کو لکھو کہ ٹکٹ تو کیا اگر آپ کشمیر بھی مانگیں تو وہ بھی ہم آپ کی نذر کریں گے''۔ اس کے بعد جگر صاحب بہ نفس نفیس مشاعرے میں شریک ہوئے اور اپنے مخصوص ترنم میں وہی لافانی غزل چھیڑ دی:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے
ہجوم جلوہ میں پروازِ شوق کیا کہنا
کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گذرے
کہاں کا حسن کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گذرے
کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گذرے

انہیں مشاعروں کے حوالے سے ایک اور واقعہ یاد آجاتا ہے۔

لداخ کے پہاڑی علاقے سے آیا ہوا ایک اردو افسانہ نگار اکبر لداخی جو ریڈیو کشمیر میں ملازم تھا ان مشاعروں میں ہر شاعر کے تقریباً ہر شعر پر اچھل اچھل کر داد دیتا تھا۔ کئی صاحب ذوق لوگوں نے اسے بار بار اس اچھل کود کے لئے ڈانٹا بھی مگر اکبر پھر بھی باز نہ آیا۔

آخر میں کسی دل جلے نے کشمیر کے ایک محقق اکبر حیدری اور اردو شاعر اکبر جے پوری کے تذکرے کے ساتھ اُسے یہ شعر سنا کر آئندہ کے لئے خاموش کر دیا:

اک اکبر جے پوؔر ہے ایک اکبر حیدؔر
اک اکبر لداخ ہے معلوم نہیں کیوں؟

1958ء کا سال میری زندگی میں ایک انقلاب کا باعث بن گیا۔

8 جنوری کو اس وقت کے سب سے بڑے کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ کو پانچ برس کی نظر بندی کے بعد جیل سے رہا کیا گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے وادی کشمیر کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے اپنی آتش بار تقریروں میں حکومت وقت اور بھارتی حکمرانوں کو للکارا کہ کشمیری عوام کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ ان کے حق خود داری کے استعمال سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ان احتجاجات میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل ہوتے تھے جس سے ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی سرکار کے ایوانوں میں زلزلے محسوس ہونے لگے لیکن بخشی صاحب کے دماغ کی اختراع کا عملی مظاہرہ بھی اس وقت سامنے آیا جب فروری کے مہینے میں شیخ صاحب اور ان کے سیاسی ہم سفروں کے خلاف دو فرضی مقدمات عائد کیے گئے جو کشمیر سازش کیس اور حضرت بل قتل کیس کے نام سے مشہور ہوئے۔

23 فروری کو جب میں ریڈیو سے اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر سائیکل پر گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں شہر سری نگر کے وسطی علاقہ خانیار میں مجھے پولیس سٹیشن کے باہر گرفتار کیا گیا اور اس طرح سے میری زندگی کو پہلی بار ایک طویل قید و بند کے ماہ و سال سے گذرنا پڑا۔

طرفہ یہ ہے کہ میں اس وقت تک شیخ محمد عبداللہ سے کبھی ملا بھی نہیں تھا صرف میں نے ان کا نام سنا تھا۔ سرکاری ملازم ہونے کے ناطے اس وقت حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے محاذ رائے شماری اور کشمیری پولٹکل کانفرنس کے ساتھ میری وابستگی کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ سوال ضرور ذہنوں میں ابھر سکتا ہے کہ پھر مجھے حراست میں لے کر حضرت بل مقدمہ میں کیوں ملوث کیا گیا؟

اب میں آپ کو اپنی گرفتاری کے پس منظر کی کہانی سناتا ہوں۔

کشمیر کلچرل کانفرنس چونکہ انجمن ترقی پسند مصنفین ہی کی ایک شاخ کے طور پر کام کر رہی تھی لہٰذا اس کے طریق کار اور فکر و نظر پر ترقی پسند کشمیریوں اور ''کمیونسٹوں'' کا براہ راست اثر تھا۔ اس کانفرنس کے ساتھ غلام محمد صادق، درگا پرشادور، شیودان سنگھ چوہان، سید سجاد ظہیر، شیلا بھاٹیہ، محمودہ احمد علی شاہ، اومکار کاچرو، ریشی دیو، عبدالرحمٰن راحت اور اسی قبیل کے ترقی پسند سیاست دان اور دانشور عملی طور پر وابستہ تھے۔ ظاہر ہے کہ بخشی غلام محمد کے لئے یہ کارروائیاں ''مضرِ صحت'' ثابت ہوسکتی تھیں لہٰذا انہوں نے اسے ''خطرناک کمیونسٹوں کی ٹولی'' قرار دیا تھا۔

1957ء میں جب صادق صاحب اور ان کے ساتھی ریاستی سرکار سے الگ ہو گئے اور انہوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کر لی تو کلچرل کانفرنس سے منسوب ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو دار و گیر کی زد میں لایا گیا۔ علی محمد لون کو ریڈیو سری نگر سے اٹھا کر دہلی میں پھینکا گیا اور پران کشور کو جالندھر تبدیل کیا گیا۔ میرے بارے میں حکام وقت نے غالباً یہی سوچا ہو گا کہ میں چونکہ ریڈیو میں عارضی ملازم تھا اور کشمیری زبان کا نیوز ریڈر ہونے کی وجہ سے میری تبدیلی کشمیر سے باہر نہیں کی جاسکتی تھی لہازا طے پایا کہ مجھے جیل بھیج دیا جائے۔

خانیار پولیس سٹیشن کے گندے۔ تاریک اور مہیب حوالات میں جو پندرہ دن میں نے گذارے وہ ہر شب دیر گئے جموں کے ایک ڈوگرہ تھانیدار مینگی کی ان گالیوں پر ختم ہوتے تھے جو وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر سونے سے پہلے پاکستان اور ''پاکستانی ایجنٹوں'' کو بہ آواز بلند سنایا کرتا تھا۔ ان پندرہ طویل راتوں کی سحر اس صبح کو سری نگر کے سنٹرل جیل میں طلوع ہوئی جب 9 مارچ کو علی الصباح موسم بہار کے نغمہ سنج پرندوں نے سنٹرل جیل سری نگر کی بارکوں میں

میرا استقبال کیا۔اس وقت میری عمر انیس سال تھی۔

جیل خانے میں تقریباً دو سال تک کی نظر بندی کے دوران جن تجربات سے میں دوچار ہوا وہ بجائے خود ایک الگ افسانہ ہیں لیکن میں یہاں پر صرف انہی محرکات کا ذکر کروں گا جو میری ادبی زندگی کے کینواس کو وسیع تر کرنے کا باعث بن گئے۔

اس زندان خانے میں مجھے مولانا محمد سعید مسعودی جیسے سربرآوردہ مفکر اور عالم سے علمی اور ادبی استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا بحالتِ اسیری دن رات محوِ مطالعہ رہتے تھے اور اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جو عام طور پر انہیں شیخ صاحب کی ایک زبردست حامی مس مردولا سارا بھائی نئی دہلی سے باقاعدگی کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔

جیل میں مجھے فارسی زبان سیکھنے کا شوق لاحق ہوا اور میری یہ خواہش مولانا اور محاذ رائے شماری کے ایک اور رہنما حسام الدین بانڈے کی عنایات سے پوری ہوسکی۔ مولانا کے پاس سید سلیمان ندوی کا مرتب کردہ عمر خیام کی رباعیات کا ایک نسخہ تھا جو انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ خیام کی رباعیات نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے کشمیری زبان میں ان کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں ہمارے روزمرہ میں یہ مسلسل عمل شامل تھا کہ ہم قیدی ہر روز نام نہاد ناشتے کے بعد جیل کے وسیع صحن میں ایک مخصوص جگہ پر جمع ہوکر تبادلہ خیال کرتے۔ ان غیر رسمی محفلوں میں محاذ رائے شماری کے جانے پہچانے اراکین صوفی محمد اکبر۔ مرزا غلام محمد بیگ ذیلدار، غلام محی الدین شاہ، حسام الدین بانڈے، علی محمد نایک، مرزا غلام قادر بیگ، مرزا محمد یعقوب

بیگ، محمد خلیل جوہر، پیر مقبول شاہ ویلہ گامی، پیر یوسف شاہ مانکی پیر، غلام قادر شیر گاندربلی اور کشمیر پولٹکل کانفرنس کے عبدالحمید قرہ۔ غلام رسول قرہ، محمد امین نحوی، شیخ غلام محمد اور مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

ایک صبح اسی مجلس میں مولانا مسعودی نے خیام کی یہ رباعی پڑھ کر مجھ سے کہا کہ میں اس کا ترجمہ کروں تا کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ ''نرمک نرمک'' کو کس انداز میں میں نے کشمیری میں منتقل کیا ہے:

وقت سحر است خیز اے مایۂ ناز
نرمک نرمک بادہ خور و چنگ نواز
کانہا کہ بجا یند نپا یند دراز
و آنہا کہ شدند کس نمے آید باز

اس رات کو گویا آمد ہوئی اور ترجمہ یوں موزون ہوا:

وِز چھہ صبح یارہ گژھ بیدار زُلفن مار گراے
استہ استے لولہ مسہ کی پیالہ برتے چنگ واے
لیس یہ تمناہ اوس تس لاریو تمہ کےُ حسر تھاہ
قبرہ یم ن نیگلاوی تم نو آئے واپس ہائے ہائے

مولانا یہ ترجمہ سن کر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ ''نرمک نرمک'' کا جو ترجمہ ''استہ استے'' کی شکل میں کیا گیا ہے وہ موزون اور برمحل ہے۔

تقریباً ایک سال کے عرصے میں میں نے عمر خیام کی ڈیڑھ سو رباعیات کا منظوم کشمیری ترجمہ مکمل کر لیا جو بعد میں 1961ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا۔ اس ترجمے کے آغاز میں میرا موزون کیا ہوا یہ طبع زاد فارسی قطعہ بھی شامل ہے:



سنٹرل جیل سرینگر کشمیر



سنٹرل جیل میں لکھا ہوا غلام نبی خیال کا کشمیری زنداں نامہ ساز زنجیر ''زنجورہ ہنڈ ساز''

نغمہ عشرت، فغان غم، حدیث سوز و ساز
اہل دل را تحفہ ارباب حال آوردہ ام
نوش کن تا رازِ ہائے بستہ گردو آشکار
بادہ خیام در جام خیالؔ آوردہ ام

ترجمہ خیام میری آج تک کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب ہے۔

جیل میں مجھے سعدی، حافظ، جامی اور اقبال کا فارسی کلام پڑھنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔

1960ء میں میری رہائی کے بعد جب میں نے جیل خانے کے اپنے شب و روز پر ایک نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ اس دوران میں نے کشمیری میں کئی غزلیں اور نظمیں تخلیق کی ہیں۔ یہ کلام ایک مجموعہ کی صورت میں 1963ء میں ''زنجورہ ہُند ساز'' (سازِ زنجیر) کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میری زنداں کی شاعری پر فیض احمد فیض، ناظم حکمت اور قاضی نذر الاسلام کا اثر رہا ہے۔ نظر بندی کے دنوں میں میں نے غیر شعوری طور پر ان مصنفوں اور ادیبوں کی تخلیقات کا بھی ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی جیل گئے تھے ان میں جواہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد، فیض احمد فیضؔ، قاضی نذر الاسلام، جولیس فیوچک وغیرہ شامل ہیں۔ اس زندان نامے کا آغاز میں نے مجروح سلطان پوری کے اس شعر سے کیا تھا:

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غم جاناں، دردِ وطن
کیا کہیئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

1962ء میں ارسطو کی مشہور تنقیدی کتاب بوطیقا (Poetics) کا میرا کشمیری ترجمہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس کاوش کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ادبی تنقید کی اس قدیم ترین کتاب کو کشمیری میں منتقل کر کے اہل کشمیر کو اس کی اہمیت

اور افادیت سے روشناس کرا سکوں۔

اُس وقت کی کشمیر سرکار نے مجھے قید و بند میں رکھ کر غالباً مجھ پر ایک احسان ہی کیا تھا کیونکہ اگر میری زندگی میں یہ واقعہ ڈرامائی طور پر ظہور پذیر نہ ہوا ہوتا تو شاید میں ادبی دنیا میں وہ نہ ہوتا جو کچھ میں آج ہوں۔

ضمانت پر میری رہائی کے بعد وزیر اعظم بخشی صاحب نے ایک دن مجھے بلا کر میری بلا وجہ نظر بندی کے ضمن میں یہ انکشاف کر کے بذات خود معافی مانگ لی کہ اس حرکت کے پس پردہ ان کے بھائی بخشی عبدالرشید کا ہاتھ تھا جس نے ریڈیو میں کام کرنے والے دو سرکاری مخبروں شفیع قادری اور برج کشن تفچی اور میرے محلے کے دو ''پیس بریگیڈ'' والوں عبداللہ بیگ اور ببر عشائی کی باتوں میں آ کر میری گرفتاری کے احکامات اس وقت کے ایک بدنام زمانہ پولس افسر شیخ غلام قادر گاندربلی کو دئے تھے۔ بخشی صاحب نے کہا کہ جب انہیں اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے میری فوری رہائی کے لئے چند قانونی ماہروں سے مشورہ کیا جنھوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کی کہ ایک نظر بند کی اچانک رہائی سے حضرت بل کیس کی ساری بنیادیں ہل جائیں گی اور قانونی لحاظ سے یہ مقدمہ کمزور پڑ جائے گا۔

بخشی صاحب تک نہ جانے کن خاص ذرائع سے یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں نے نظر بندی کے دوران عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری آر سی رینہ کے ہاتھ مجھے فوری طور پر ملنے کا پیغام بھیجا۔ اس ملاقات میں بخشی صاحب نے میری اس کاوش پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا کیونکہ بقول روزن تھال جہاں شیخ عبداللہ اقبال کو چاہتے تھے وہاں بخشی غلام محمد کا پسندیدہ شاعر عمر خیام تھا۔

بخشی نے مجھے پانچ سو روپے دئے اور کہا کہ یہ ترجمہ فوراً کتابی صورت

میں شائع ہونا چاہیئے۔ جب اس کتاب کی پانچ سو جلدیں شائع ہوئیں تو پانچ سو روپے میں سے چند سو روپے بچ گئے تھے۔ میں یہاں پر بخشی غلام محمد کی اس ''ادائے دلبری'' کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا:

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

اس کے ساتھ ہی بخشی صاحب نے مجھے کلچرل اکادمی میں ملازمت دلوائی جہاں میں چار سال تک مرزا کمال الدین شیدا۔ صاحبزادہ حسن شاہ، نورالدین، علی جواد زیدی اور پروفیسر جیالال کول کی ماتحتی میں شعبہ مطبوعات کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور ان بزرگوں کی شفقت اور رہبری سے قدم قدم پر فیض یاب ہوتا رہا۔ اکادمی میں میں نے اپنا سارا وقت کشمیری زبان اور ادب کی تحقیق و تدوین میں صرف کیا جس کا ماحصل محمود گامی۔ لچھمن کول بلبل اور اکہ نندن پر میری تحقیقی مطبوعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ اکادمی کے لئے میں نے سمترانندن پنت کی ہندی نظموں کے ترجمہ کی شیرازہ بندی اور ''سون ادب'' (ہمارا ادب) کی ترتیب کے علاوہ اوتار کشن رہبر کی معیت میں کشمیری نثر کے ایک ضخیم انتخاب کو بھی مرتب کر کے شائع کروایا۔ اس دوران میری کشمیری غزلوں اور نظموں کا ایک اور مجموعہ ''پراگاش'' (نورِ سحر) کے نام سے منظر عام پر آ چکا تھا۔

اپریل 1964ء کی بات ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے مابین نئی دہلی میں کشمیر کے مسئلہ پر ایک اہم مذاکرہ کا اعلان کیا گیا۔ اس گفت و شنید کی خاطر شیخ صاحب اور ان کے دست راست مرزا محمد افضل بیگ 29 اپریل کو سری نگر سے نئی دہلی روانہ ہوئے۔

اس سے چند روز قبل چند کشمیری ادیبوں کی ایک خفیہ میٹنگ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ وہ بھی تاریخی اہمیت کی حامل اس نہرو۔ شیخ ملاقات کو

ہر طبقہ خیال سے اخلاقی حمایت دلوانے کی خاطر اپنا حصہ ادا کریں۔ یہ میٹنگ سری نگر کے قدیمی علاقے وازہ پورہ میں رحمان راہی کے گھر پر بلائی گئی۔ اگر چہ اس میں شمولیت کے لیے چالیس کے لگ بھگ شاعروں اور ادیبوں کو دعوت دی گئی تھی لیکن اس میں راہی کے علاوہ صرف اختر محی الدین۔ امین کامل۔ غلام نبی فراق اور میں نے شمولیت کی۔ گھنٹوں کی مغزماری کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہماری طرف سے ہندو پاک کے ادیبوں اور دانشوروں کے نام ایک اپیل جاری کی جائے اور اس کی نقولات پنڈت نہرو اور شیخ صاحب اور برصغیر کے کئی سیاسی رہنماؤں اور بارسوخ شخصیتوں کو بھیج دی جائیں۔ اپیل کا مسودہ کشمیری زبان میں تیار کیا گیا جس میں بالخصوص کشمیر کا تنازعہ منصفانہ طور پر حل کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ اب یہ سوال سامنے آیا کہ **Who'll bell the cat?** یعنی اپیل کس کے نام سے جاری کی جائے۔ چونکہ ہم سبھی لوگ سرکاری ملازم تھے اور اس وقت کے سیاسی ماحول میں ہمارے لئے یہ اقدام خودکشی کے مترادف تھا کہ ہم علی الاعلان سیاسیات میں دخل اندازی کریں۔ نتیجے کے طور پر یہ میٹنگ نشستند و گفتند و برخاستند تک ہی محدود ہونے والی تھی کہ میں نے شدت جذبات میں آکر اپنی ''خدمات'' پیش کیں۔ کچھ تو نوجوانی کا نشہ اور کچھ کشمیر کا درد تھا۔ میں نے اپیل کے نیچے اپنا نام اُس ''کشمیری رائٹرس آرگنائزیشن'' کے ''سیکریٹری'' کی حیثیت میں لکھ دیا جس کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔

اپیل کا مسودہ اگر چہ کشمیری زبان ہی میں شائع کرانا مقصود تھا لیکن راہی کی تجویز پر اس کے انگریزی ترجمہ کا بھی فیصلہ کیا گیا تا کہ ریاست سے باہر وہ احباب اسے پڑھ تو سکیں جن کے نام اسے جاری کیا جانا تھا۔ اپیل کا ترجمہ کروانے کی غرض سے ہم اس وقت کشمیر یونیورسٹی میں انگریزی شعبے کے صدر ڈاکٹر محمد سلطان وانٹ کے پاس نواکدل میں واقع ان کے گھر گئے۔

اس طرح سے یہ اپیل کشمیری اور انگریزی دونوں زبانوں میں 28 اپریل کو مشتہر کی گئی اور اس سے کشمیر اور دہلی کے سیاسی اور ادبی حلقوں میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔

ان دنوں جیالال کول کلچرل اکادمی کے سیکریٹری تھے۔ اگلے روز کول صاحب نے ریاست کے وزیر داخلہ ڈی پی درکی ہدایت پر مجھ سے اس اپیل کے بارے میں تفصیلات طلب کیں۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا یہ میری انفرادی کوشش ہے یا اس کے پس پردہ کوئی اور بھی کارفرما ہے۔ میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس اقدام کے ساتھ کسی اور ادیب یا شاعر کا نام وابستہ کرنے کی زحمت نہ کریں۔

اپیل کی جو نقل ہم نے شیخ عبداللہ کو ان کے نئی دہلی کے کوٹلہ لین کے پتے پر بھیجی تھی اس کا انہوں نے فوری طور پر ایک تہنیتی جواب لکھا جو شومیٔ قسمت سے اکادمی ہی کے ایڈریس پر میرے نام آ گیا۔ اس خط نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کول صاحب کے نام فون پر فون آنے لگے اور ایک دن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کول صاحب سے خود ہی وہ سبھی نام مجھے بتائے جو میں نے پردۂ راز میں رکھ لئے تھے۔ جب بات کھل کر سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر وانٹ نے محض ایک صفحہ کی اپنی ترجمہ کاری کے ''کارنامے'' کو اتنا اُچھالا تھا کہ انہوں نے ہم سبھی ''خطاوار مجرموں'' کے ناموں کی خوب تشہیر کی تھی۔ مبینہ طور پر مذکورہ میٹنگ میں شامل اختر محی الدین نے بھی ''وعدہ معاف گواہ'' بن کر اس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے سکریٹری محمد یوسف ڈار کو میٹنگ کی تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔ چونکہ ابھی تک حضرت بل مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہی تھا اور اس کا حتمی فیصلہ ہونا باقی تھا لہٰذا میری اکادمی کی نوکری بھی سرکاری ضوابط کی رو سے عارضی نوعیت کی تھی۔ چند روز کے بعد مجھے اکادمی کی

ملازمت سے برخاست کیا گیا۔

اس سے قبل جب کشمیری شاعر مرزا غلام حسن بیگ عارف نے 1960ء میں اپنے مشہور کشمیری رسالے ''گلریز'' کا احیاء کیا تھا تو ان کی درخواست پر اس کی ادارت میں نے سنبھالی تھی۔ گل ریز اپنے دور ثانی میں صرف ایک سال تک زندہ رہ سکا۔ میں نے عارف صاحب کے سامنے یہ رسالہ ذاتی طور پر اپنی تحویل میں لینے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور میں در در کی ٹھوکریں کھانے لگا۔

1964ء میں محاذ رائے شماری کا ترجمان اردو ہفت روزہ ''محاذ'' جاری کیا گیا اور اس کی مجلس مشاورت کے چار ارکان یعنی شیخ محمد عبداللہ۔ مرزا افضل بیگ۔ مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام رسول کوچک میں سے مسعودی صاحب اور کوچک صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی ادارت سنبھالوں جسے میں نے سرکاری عتاب اور حکومتی سطح پر سیاسی انتقام گیری کے امکانات سے بے پروا ہو کر قبول کر لیا۔ محاذ بھی صرف ایک سال تک زندہ رہا کیونکہ حکومت وقت نے سری نگر سے شائع ہونے والے ایک درجن اخباروں کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اگرچہ مجھے اور میرے دیگر پانچ ساتھیوں کو محاذ کی ادارت اور ملازمت سے پہلے ہی الگ کر دیا گیا تھا کیونکہ بقول مرزا افضل بیگ اخبار نے دس بارہ ہزار روپے کا خسارہ اٹھایا تھا اور وہ مالی لحاظ سے اس حالت میں نہیں تھے کہ اخبار میں کام کرنے والے درجن بھر اشخاص کو مستقل طور پر رکھ سکتے۔ اس وقت شیخ عبداللہ اور افضل بیگ کا اپنے ہی بہی خواہوں سے یہ غیر متوقع سلوک اُن کے ذہنوں میں ذرہ بھر کے لئے بھی یہ احسان نہیں جگا سکا کہ میں انہی کے سیاسی رفیقوں کے کہنے پر اور ناموافق صورت حال میں اس ہند مخالف اور سرکار دشمن اخبار کا ایڈیٹر بننے

پر آمادہ ہوا تھا۔ حیرت ہے کہ محاذ کی ادارت اس کے بعد چند ماہ تک ایک نیم خواہندہ محاذی کارکن عبدالغنی مست فریدی کے ہاتھ میں دی گئی اور دہلی سے منت سماجت کر کے بلائے گئے ایک اور ''خصوصی'' مدیر ناز انصاری کو بھی چلتا کیا گیا۔

1965ء میں میں نے کشمیری زبان کا پہلا اخبار ہفت روزہ ''وطن'' کے نام سے شروع کیا جس کا ایک سو صفحات پر مشتمل ''امن نمبر'' آج بھی کشمیری صحافت میں ایک یادگار اور لاثانی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خاص نمبر ستمبر 1965ء کی بھارت پاکستان جنگ کے ساتھ ہی شایع کیا گیا اور اس کیلئے عالمی شہرت یافتہ ممتاز فلسفہ دان برٹرینڈ رسل نے مجھے خصوصی طور پر اپنا وہ پیغام لندن سے ارسال کیا جس میں انہوں نے کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کی تائید کر کے ان کے حق خودارادی کی حمایت کی تھی۔ ''وطن'' کشمیری ادیبوں اور قلمکاروں کی بے حسی اور نام نہاد محبتوں کی مہربانی سے 1968ء میں دم توڑ گیا۔

میرا اردو روزنامہ ''اقبال'' بھی 1968ء سے لے کر 1984ء تک سری نگر سے شائع ہوتا رہا لیکن اس دوران انگریزی صحافت کی طرف رجوع کرنے کی بنا پر یہ اخبار بھی بعد میں بند ہوا۔

1972ء میں 512 صفحات پر مشتمل میری ضخیم کشمیری کتاب ''گاشری مُنار'' (روشنی کے مینار) منظر عام پر آ گئی جسے 1974ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے بہترین کتاب کی حیثیت میں پہلا انعام دیا اور 1975ء میں اس تصنیف کو ہند کی ساہتیہ اکادمی نے گذشتہ تین سال کے دوران شائع شدہ بہترین کشمیری کتاب قرار دے کر اپنے اعزاز سے نوازا۔ ''گاشری مُنار'' میری گیارہ سال کی عرق ریزی اور تحقیق و تلاش کا نتیجہ ہے جس میں دنیا بھر کے گیارہ

منتخب شاعروں پر سوانحی اور تجزیاتی مقالات درج ہیں۔ ان عظیم سخن وروں میں ہومر (یونانی)، ورجل (لاطینی)، کالی داس (سنسکرت)، ڈانٹے (اطالوی)، امرالقیس (عربی)، حافظ شیرازی (فارسی)، گوئٹے (جرمن)، پشکن (روسی) شیکسپیئر (انگریزی)، ٹیگور (بنگالی) اور اقبال (اردو) شامل ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ کشمیری پڑھنے والوں کے ذہن وشعور کو دنیائے ادب کے ان پرنور میناروں کی روشنی سے منور کیا جاسکے۔

اس سال جن دیگر ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو اس پروقار اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا تھا ان میں کیفی اعظمی (آوارہ سجدے) نراد چودھری (خود نوشت سوانح حیات) اور بھیشم ساہنی (تمس) بھی شامل تھے۔ برصغیر میں 1947ء کے دوران ہونے والے ہولناک ہندو مسلم فسادات پر مبنی ناول ''تمس'' جہاں بعد میں ایک مقبول ٹیلی ویژن سیریل کی صورت میں پیش کیا گیا وہاں کیفی کے مجموعہ کلام ''آوارہ سجدے'' پر چند نام نہاد ملاؤں نے پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کر کے شاعر کو بھی اسلام سے خارج کرنے کی بے ہودہ کوششیں کیں۔

اکادمی کے انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں نئی دہلی کے کمانی ہال میں 21 فروری 1976ء کو ایک باوقار تقریب منعقد ہوئی جس میں ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ''گاشری مُنار'' کے بارے میں کہا گیا کہ ''اس تصنیف کو دنیا کی چند عظیم الشان ادبی ہستیوں پر محققانہ مقالات اور ایک پختہ اور فن کارانہ طرز تحریر کی وجہ سے گذشتہ تین سال کے لئے کشمیری زبان کی بہترین کتاب قرار دیا جاتا ہے''۔

اس سے قبل بمبئی سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے **P.E.N.** کے اکتوبر 1974ء کے شمارے میں پروفیسر تریلوکی ناتھ رینہ نے اس کتاب پر



ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اکادمی کے صدر ڈاکٹر سنتی کمار چٹر جی غلام نبی خیال کو ان کی بہترین کتاب ''گاشری منار'' پر انعام سے نواز رہے ہیں۔ دائیں طرف اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے ایس کیلکر کھڑے ہیں۔ (نئ دہلی فروری 1976)



ساہتیہ اکادمی کی تقریب انعامات پر۔ دائیں سے غلام نبی خیال، کیفی اعظمی اور بھیشم ساہنی

تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''اس کتاب سے کشمیری نثر میں ایک نئی زمین ہموار ہوئی ہے۔ مقبول اردو اخبار ''اقبال'' کے مدیر غلام نبی خیال کو متعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا سیمابی ذہن نہ تو ادبی اظہار کے کسی ایک ذریعہ تک محدود رہ سکا ہے اور نہ ہی ان کی عالمانہ برتری ایک زبان کے دایرے میں بند ہو سکی ہے۔ وہ پانچ زبانوں انگریزی، فارسی، عربی، اردو اور کشمیری پر عبور رکھتے ہیں۔ خیاؔل نے اس کتاب کے ذریعہ اپنی مادری زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے''

سری نگر سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''ایکارڈ'' کے جنوری 1976ء کے شمارے میں پروفیسر بیگم نصرت اندرابی نے ''گاشری مُنار'' پر اپنے طویل تبصرے میں لکھا۔ ''کشمیری زبان میں نثر کی صنف صرف چند برس قبل تک ناپید تھی۔ جن کشمیری ادیبوں نے اس صنف ادب کو اپنی زبان میں متعارف کرایا ان میں Poet Laureate غلام نبی خیال بھی شامل ہیں۔

''گاشری مُنار'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں پر قلم اٹھاتے وقت ان کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کی بنا پر انہوں نے اس شاعروں کو کشمیری قارئین سے متعارف کرتے ہوئے ان کا بھرپور تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ کشمیری ادب میں ایک یادگار اضافہ ہے''۔

تقسیم انعامات کی تقریب پر میں نے جو مختصر سی تقریر اپنے فن اور تخلیقات کے بارے میں کی۔ یہ کتاب پڑھنے والوں کو غالباً اس میں بھی دلچسپی ہوگی۔ اسے میں نے انگریزی زبان میں ایک شاعر کی طرح لکھا اور ایک مخصوص اسلوب میں ڈھالا لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ کرنے کے بجائے اسے اپنی اصل صورت میں پیش کروں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

Art is a reflection of life and life's events and happenings. Today when I peep into my youthful past, I am reminded of a dramatic event, but for which I whouldn't perhaps find myself here in this distinguished literary gathereing exchanging ideas with you.

This event took place exactly eighteen years ago. I was arrested, incarcerated in Srinagar Central Jail and then released after about two years.

It was in the dingy cells and dark barracks of this jail that I found the windows of my consciousness gradually opening up to the shining lights of literature.

It was in this jail that I learnt Persian language. It was also here that I delved deep into the works of Hafiz Shirazi, Kalidasa, Shakespeare and Goethe and translated Omar Khayyam into Kashmiri verse. This translation is still my best-known work.

Also after my release, I published "Zanjoori Hund Saaz" (Music of Chains), a

collection of my poems written during those two years of jail-life. I followed it up with the Kashmiri translation fo Aristotle's "Poetics" which was acclaimed as a worthy contrribution to the nascent Kashmiri prose.

Kashmiri language, even though it is recognised under the Indian Constitution as the regional language of Jammu and Kashmir state, continues to be in oblivion.It has been sacrificed time and again at the alter of politics and it is more or less a stranger in the very region it belongs to. The simple reason for the sad state of this 5,000 year old beautiful language is the apathy of the state government. In fact, no government has so far made any serious effort for its promotion and development. There is not a single newspaper in Kashmiri language and a writer is always hesitant to publish his works on his own.

It might sound surprcsing to you but it is a bitter fact that the 'print order' of my book,

which has been given this Sahitya Akademi Award, was a mere 250 copies. Out of these, I gifted away about 150 copes while the remaining were purchased by the State education department.

This book "Gashiry Munaar" is a collection of eleven essays and it is a coincidence that these essays were completed also in eleven years. The book contains biographical, critical and research articles on Homer, Virgil, Kalidasa, Imar-ul-Qais, Hafiz Shirazi, Dante, Shakespeare, Goethe, Pushkin, Tagore and Iqbal.

I have been repeatedly ased: why these eleven classicists only? Why not also Tulsidas, Sappho, Firdausi, Milton or Ghalib?

But "Gashiry Munaar" is simply a selection I have made. It does not cover all the great poets of the world. The urge that motivated me was to illuminate the minds of my people with the light from these "light

houses" especially those of my people who could not read their works in English or in any other language.

"Gashiry Munaar" is the culmination of the urge which was born within me eleven years ago when I started reading Greek and Roman classics. As you all know, a writer's urge is fathomless and unceasing and as long as he lives, it is in his flesh and blood.

"Gashiry Munaar" is a collection of eleven essays, it was completed in eleven years, and it is again a strange coincidence that I will be completing forty years of my life exactly after eleven days from today.

Life is unpredictable. Or else, I would claim tha I have yet to paint many colours on life's canvas. I would say that I have yet to write many a melody of its abounding beauties and everchanging moods. I would continue to probe into the mysteries of life and experiment with its contradictions and multifarious shapes.

But such cravings are rarely fulfilled. Even Ghalib' heart was consumed by the fire of this desire and Tagore's heart craved:

"Let my love for thee be so
closely knit with my life.
As is the music with rabab.
It is my fervent wish
That I surrender my life to thee,
with all the love I have"

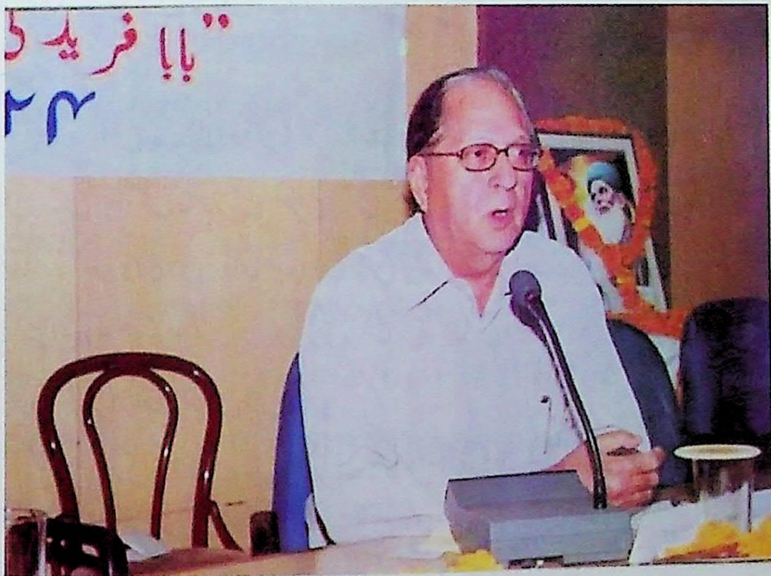
ادب کے میدان میں مجھے لیگ آف عرب سٹیٹس کے رسالے ''العرب'' کی جانب سے 1972ء میں اُس کشمیری نظم کے لئے بھی انعام سے نوازا گیا جس کا میں نے ''فلسطین کا سپاہی'' کے نام سے خود ہی انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ جن اعزازات واکرامات سے مجھے وقتاً فوقتاً نوازا گیا اُن میں فاضل میموریل انعام، بخشی میموریل کمیٹی ایوارڈ، لل دید فاونڈیشن انعام، اردو اکادمی انعام، دوردرشن کیندر چندی گڈھ، مسلم ہینڈس انٹرنیشنل پاکستان، ہرموکھ مرکز اور دیگر کئی ثقافتی، صحافتی اور ادبی اداروں کے عطا کردہ اعزازات شامل ہیں۔

فروری 1976ء میں حضرت جگر مرادآبادی کے شہر غزل مرادآباد (یوپی) کی ادبی خواتین سوسائیٹی نے میرے اعزاز میں ایک ''جشن خیال'' کا اہتمام کرلیا۔ جس کے زیر انتظام وہاں کی جانی پہچانی شخصیت مرحوم حاجی عبدالقدیر کی رہائش گاہ شان بھون میں ایک بہت بڑا مشاعرہ بھی ہوا جو شام کو شروع ہوکر



غلام نبی خیال کے اعزار میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے تقریب کا اہتمام



مصنف چندی گڈھ میں بابا فرید عالمی سمینار پر اظہار خیال کر رہے ہیں

صبح چار بجے تک جاری رہا۔ اس محفل سخن میں خصوصاً وہاں کی خواتین شعراء نے مجھ پر اس طرح تعریف و تحسین کے پھول برسائے کہ میں اس یادگار رات کو زندگی بھر بھول نہیں سکتا۔ اس تقریب کا مفصل حال اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔

1976ء ہی میں کلکتہ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا ایک ملک گیر اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کے تقریباً ہر کونے سے آئے ہوئے اردو مدیران نے شرکت کی۔ اس سہ روزہ اجلاس میں کانفرنس کے لئے پہلی بار جمہوری طرز کا انتخاب عمل میں لایا گیا جس کی رو سے صدر حیات اللہ انصاری (سب ساتھ، نئی دہلی)، نائب صدور ڈاکٹر خالد رشید صبا (ساتھی، پٹنہ)، خان غفران زاہدی (سیاست جدید، کانپور) اور معین فاروقی (انگارے، حیدرآباد) جنرل سیکریٹری جمنا داس اختر (سویرا، دہلی) اور سکریٹری صاحبان ہاشم رضا عابدی الہ آبادی (قومی جنگ، رام پور) حسن کمال (بلٹز، بمبئی)، غلام نبی خیالؔ (اقبال، سری نگر) اور ملک محمد علی خاں (آندھرا، حیدر آباد دکن) آرگنائزنگ سیکریٹری بہار برنی (صبح، دہلی) اور رضوان احمد (عظیم آباد ایکسپریس، پٹنہ) اور خزانچی غلام احمد خاں آرزو (ہندوستان، بمبئی) منتخب ہوئے۔ بعد میں پٹنہ میں ایک متوازی کانفرنس کی تشکیل ہوئی۔ اُدھر انصاری صاحب کے پارلیمنٹ میں جانے سے جمنا داس اختر کانفرنس کے صدر بن گئے اور اس کے بعد حسب توقع یہ کانفرنس اپنی موت آپ مر گئی۔ اب صرف دہلی کے چند دفتروں میں اس کا کاغذی نام باقی ہے۔

1982ء میں بھارت کے یوم جمہوریہ کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے نئی دہلی میں ہند کی تمام علاقائی زبانوں کے چیدہ چیدہ شعراء کا قومی مشاعرہ ہوا جس میں کشمیری شاعری کے نمائندہ کی حیثیت میں مجھے شامل

کیا گیا۔ میں نے اس اجتماع میں اپنی مشہور نظم ''مناجات'' پڑھی جسے بعد میں قیصر قلندر نے اردو نظم میں خوبصورتی کے ساتھ منتقل کر کے الہ آباد سے چھپنے والے معروف جریدے ''شب خون'' میں شائع کروایا۔ اس نظم کا ترجمہ ہند کی ساری علاقائی زبانوں میں بھی کیا گیا۔

اُسی سال مدھیہ پردیش کے دارالحکومت بھوپال میں وہاں کی اکادمی کے اہتمام سے ایک اور محفل سخن ہوئی جس میں کشمیری زبان کی ترجمانی کے لئے رحمان راہی۔ امین کامل اور راقم الحروف منتخب کیئے گئے۔ اردو کی ترجمانی ڈاکٹر قمر رئیس اور مرحوم ڈاکٹر وحید اختر نے کی۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے بھوپال ہی میں 9 اکتوبر 1982ء کو ملا رموزی کی یاد میں ایک ''محفل طنز و مزاح'' منعقد کی جس میں مشہور مزاح نگاروں فکر تونسوی، یوسف ناظم، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، جہان قدر چغتائی، فضل جاوید اور مصطفی تاج نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے ساری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اس محفل کی صدارت کا اعزاز راقم الحروف کو بخشا گیا۔

اُن دنوں سری نگر کے ٹیلی ویژن مرکز سے میرا پیشہ ورانہ رابطہ قائم ہو چکا تھا جہاں سے میں وقتاً فوقتاً تبصرے۔ مباحثے اور دیگر پروگرام نشر کرتا تھا۔ 22 اپریل 1981ء سے اس مرکز سے میرا تحریر کردہ کشمیری زبان کا سلسلہ وار فیچر ''شب رنگ'' شروع کیا گیا جو دیکھتے دیکھتے قبول عام کی بلندیوں کو چھوتا گیا۔ پہلے پہلے ''شب رنگ'' ہر پندرہ دن کے بعد ٹیلی کاسٹ ہوتا رہا پھر عوامی خواہشات کے احترام میں اسے ایک ہفت روزہ فیچر میں تبدیل کیا گیا۔ کل ملا کر اس کی 104 قسطیں نشر کی گئیں اور یہ سلسلہ ستمبر 1983ء تک جاری رہا۔

یہ طنزیہ اور مزاحیہ پروگرام مقامی عوامی مسائل اور سیاست گری کی ریشہ

دوانیوں پر تیکھے طنز اور چبھتی ہوئی تنقید کی وجہ سے اس قدر مشہور ہوا کہ اس کے بعد سے آج تک اتنا مقبول عام پروگرام سری نگر کے ٹیلی ویژن سنٹر سے پھر کبھی نشر نہیں ہوسکا۔ اس کے دو مرکزی کردار شمس الدین التمش (شادی لال) اور بیگم سلال (اوشا تکو) اب بھی کشمیری گھرانوں میں جانے پہچانے کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''ٹائمز آف انڈیا'' نئی دہلی نے اپنی 27 ستمبر 1982 کی اشاعت میں ''شب رنگ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے سری نگر ٹیلی ویژن کا ''سب سے بہتر پروگرام قرار دیا جس کی توصیف میں ٹیلی ویژن مرکز کو ہر ماہ 230 خطوط موصول ہوا کرتے ہیں'' اخبار نے مزید لکھا کہ ''یہ سارے بھارت میں ایک ایسا واحد پروگرام ہے جو کسی بھی ٹی وی سینٹر سے اتنی لمبی مدت تک باقاعدہ گی کے ساتھ دکھایا جارہا ہے''۔

1979ء اور 1985ء میں مجھے عراقی سرکار کی دعوت پر عراق جانے کا موقعہ نصیب ہوا۔

صحافت کے حوالے سے مجھے اس شعبے میں نمایاں کارکردگی کی خاطر 1976ء میں کلکتہ میں ناگری پرچارنی سبھا کا انعام دیا گیا اور اس کے بعد 1982ء میں نئی دہلی میں صحافیوں کی بہبود سے متعلق فاؤنڈیشن نے بھی اپنے اعزاز سے نواز۔ 1989ء میں مجھے جموں میں لالہ ملک راج صراف صحافتی ایوارڈ دیا گیا اور 1993ء میں آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد کی طرح سے عالمی سطح پر ''خدمات کشمیر'' کے لیے دو شخصیتوں کو خصوصی انعامات دئے گئے جن میں امریکی مصنف پروفیسر ولیم بیکر کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔

1986ء اور 1990ء کے دوران مجھے چار بار پاکستان اور آزاد کشمیر جانے کا بھی موقعہ ملا۔ اپنے ان نجی دوروں کی رویداد میں نے وقتاً فوقتاً بھارت



ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے آر قدوائی غلام نبی خیال کو حسن کارکردگی کیلئے دوردرشن کی طرف سے ایواڈ دے رہے ہیں (چندی گڈھ، 6 جون 2006)



جموں کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ لل دید فاونڈیشن کی طرف سے خیال صاحب کی خلعت پوشی کرر ہے ہیں (سرینگر 8 اکتوبر 2000)

کے رسائل و جرائد سنڈے میل نئ دہلی۔ پروب الہ آباد اور السٹر یٹڈ ویکلی آف بمبئ میں تحریر کی ہے۔ 1987ء میں مَیں نے صدر پاکستان محمد ضیاء الحق سے ایک خصوصی انٹرویو لینے کا بھی شرف حاصل کر لیا۔ صدر ضیا نے اس گفتگو کے دوران مجھ سے کہا کہ وہ انڈیا ٹوڈے نئ دہلی اور السٹریٹڈ ویکلی میں میرے ''بے لاگ اور بے باک'' مضامین سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور انٹرویو پر راضی ہونے کا سبب بھی وہی نگارشات تھیں۔ اس موقع پر پاکستان کی خارجی تشہیر کے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل اسماعیل پٹیل۔ محکمۂ اطلاعات کے سکریٹری مجید مفتی اور صدر کے پریس سکریٹری بریگیڈیر صدیق سالک بھی موجود تھے۔ ضیاء الحق 17 اگست 1988ء کو بہاولپور کے نزدیک ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

پاکستان میں کئی قابل ذکر شخصیتوں کے علاوہ میری طویل ملاقاتیں کشمیری احباب سے بھی ہوئیں جو وہاں پر اقتصادی لحاظ سے آسودہ حال ہونے کے باوجود اپنے وطن مالوف کشمیر کی یاد میں شب و روز تڑپتے نظر آرہے تھے۔ اس بے وطنی اور کربِ ہجرت کی اندوہناک تصویر کے خدوخال اس وقت بھی صاف صاف نظر آئے جب مجھے مظفر آباد میں میر واعظ کشمیر مرحوم مولانا محمد یوسف شاہ صاحب کی سرراہ واقع قبر پر فاتح خوانی کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ اُداس قبر بزبان حال کہہ رہی تھی:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

جہاں تک انگریزی میں میرے صحافتی سفر کا تعلق ہے اس سلسلے میں ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی ، ثقافتی ،سماجی اور اقتصادی موضوعات اور حالاتِ حاضرہ پر میرے مضامین اور تجزیاتی مقالے ہند اور بیرون ہند کے

مشہور جرائد اور اخبارات میں گذشتہ بیس سال کے دوران شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی)، انڈین ایکسپریس (نئی دہلی) ہندوستان ٹائمز (نئی دہلی)، دی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا (ممبئی)، کاروان (نئی دہلی)، انڈین لٹریچر (نئی دہلی)، فورٹ نایٹ (نئی دہلی)، العرب (نئی دہلی)، سنڈے (کلکتہ)، سویت یونین (نئی دہلی)، آن لکر (بمبئی)، ویک (کوچین)، پروب (الہ آباد)، گجرات سماچار (احمد آباد) کشمیر ٹوڈے (سری نگر)، سن (نئی دہلی)، سنڈے میل (نئی دہلی)، کشمیر ٹائمز (جموں) اور عربیہ (لندن) قابل ذکر ہیں۔ میں 1983 سے تین سال تک امریکی رسالے ''ٹائم میگزین'' کا بھی نامہ نگار رہا۔ اس کے علاوہ میرا صحافتی تعلق وویس آف امریکہ۔ یونایٹڈ پریس انٹرنیشنل۔ سکائی نیوز ٹیلی ویژن اور گارڈین لندن سے بھی رہا ہے۔ آج کل میں نوائے وقت لاہور اور نیشن اور پاکستان ٹیلی ویژن کے خصوصی نمائندہ کی حیثیت میں کام کرنے کے علاوہ جرمن ریڈیو اور لاس اینجلز ٹائمز سے بھی وابستہ ہوں۔

اردو زبان میں ادبی اور ثقافتی موضوعات پر میرے مقالات اور منظوم تخلیقات آج کل (دہلی)، شیرازہ (سرینگر)، تعمیر (سری نگر)، تحریک (دہلی)، صبا (حیدرآباد)، تعمیر ہریانہ (چنڈی گڑھ)، روشی (میرٹھ)، نگارش اور پگڈنڈی (امرتسر)، پمپوش (نئی دہلی)، ہمارا ادب (سری نگر)، راہی (جالندھر)، آواز (نئی دہلی)، بیسویں صدی (دہلی)، حرمت (اسلام آباد)، نیا دور (لکھنؤ) اور شب خون (الہ آباد) میں شائع ہو چکی ہیں۔

میری تازہ ترین تصانیف میں اردو میں ''اقبال اور تحریک آزادی کشمیر'' 1997 میں شائع ہو چکی ہے اور یہ تحقیقی کتاب اقبال اکادمی لاہور کے زیر اہتمام بھی اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ اردو ہی میں زیر طبع تصانیف میں فغانِ کشمیر اور

بقلم خیال

وہ مشرق پہ شمعِ رشی جلنے لگی
فضائے بہاراں مچلنے لگی

ڈھلی پھر حقیقت میں یادِ بہار
چلی سوئے کشمیر بادِ بہار

نشاطوں میں رقصاں نشاطِ بہار
کھلے کہساروں میں پھر لالہ زار

وِتستا کی لہروں میں چاندی گھلے
شکاروں کے ڈل جھیل میں پر کھلے

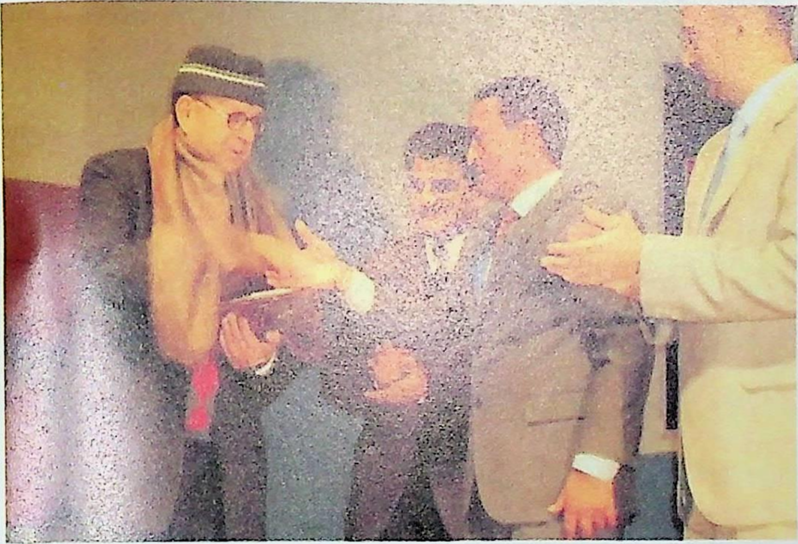
کھلی چاندنی زعفراں زار میں
کوئی زون پھر لُٹ گئی پیار میں

چلی آئے پہاڑی جوانی یہاں
تو پھر بلاتے ہیں پانی یہاں

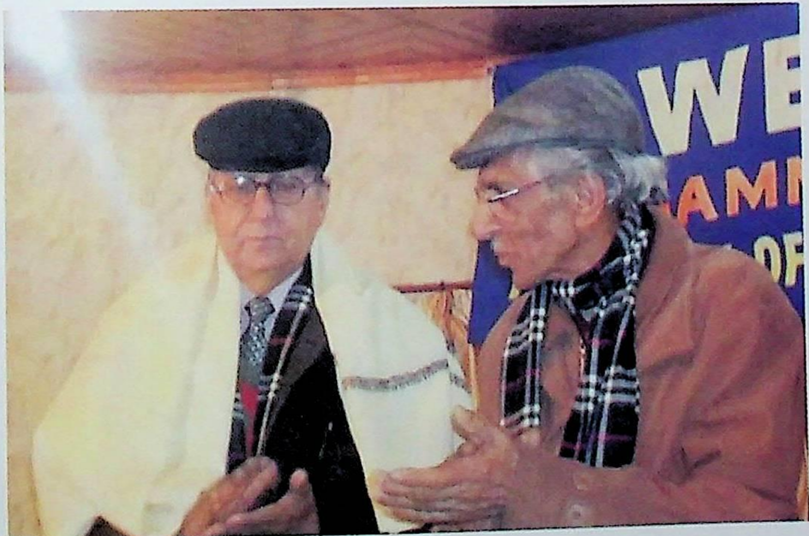
مرے ساقیا دل مچلنے لگے
بہاروں کے چشمے اُبلنے لگے

غلام نبی خیال

غلام نبی خیالؔ کے عکس تحریر میں اُنہی کی ایک اردو نظم کے چند اشعار۔ یہ پوری نظم بہ عنوان 'کشمیر' ماہ نامہ آج کل دہلی کے جون 1978 کے شمارے میں شایع ہو چکی ہے۔



جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے غلام نبی خیال کو ان کی بہترین انگریزی کتاب ''لیوز آف چنار'' کیلئے ریاسی وزیر ثقافت نوانگ رکزن جورا انعام دے رہے ہیں۔ (جموں 20 جنوری 2012)



گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر پروفیسر رحمٰن راہی غلام نبی خیال کی خلعت پوشی کر رہے ہیں

خیابانِ کشمیر شامل ہیں۔ جب کہ کشمیری زبان میں میرے گذشتہ بیس پچیس سال کا جمع شدہ کلام ''الہام'' اور ''رباعیات عمر خیام'' کا نقشِ ثانی بھی طباعت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔

1990ء سے سرزمین کشمیر میں آگ اور خون کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہوا۔ ایک عوامی جہد کے دوران ہزاروں فرزندان کشمیر نے اپنی جانوں کی بازی لگادی۔ اس ملک میں انسانی حقوق کی پامالیوں اور تحریر و تقریر کی پابندیوں کا دور دورہ رہا۔ ان سبھی خون آشام موضوعات پر میں نے 1991ء اور 1997ء کے دوران انگریزی میں ایک درجن کے قریب ایسی تصانیف اور تالیفات شائع کرلیں جن میں اس دردو کرب کی داستانیں رقم ہیں۔ ان مطبوعات میں کشمیر: برننگ آف اے پیراڈائز۔ ٹیرس آف کشمیر۔ اگنی آف کشمیر۔ پیراڈائز ٹرند انفرنو، کشمیر دی سٹیٹ ٹیرر زم، سیج آف حضرت بل اور فورسڈ فرنچایز وغیرہ شامل ہیں۔

کشمیری زبان کے ایک ناقد اور شاعر اور میرے دوست اور ہم سفر مرحوم موتی لال ساقی نے اپنی تصنیف ''گاشری'' میں میرے بارے میں لکھا ہے کہ ''غلام نبی خیالؔ ایک نام نہیں بلک ایک ادارہ ہے۔ وہ ایک فرد نہیں بلکہ انجمن ہے۔ خیال ایک ایسا افسانہ ہے جس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا اور یہ افسانہ شرلاک ہومز اور آرسن لوپن کے افسانوں سے زیادہ دلچسپ اور دلفریب ہے۔ ایک افسانے کے اگرچہ کئی کلائمکس اور کئی اختتام ہوتے ہیں مگر یہ افسانۂ خیال اختتام پذیر ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔ یہ افسانہ کب ختم ہوگا۔ یہ ادارہ کون کون سے کام سرانجام دے گا۔ اس انجمن سے کیا کیا کارنامے سرزد ہوں گے۔ ان باتوں کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ کوئی دوسرا شخص یہ بتانے کی کوشش کرے تو کرے مگر میرے لئے ایسا کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں کیونکہ میں خود

خیال صاحب کا ہم عصر ہوں"

اور میں اپنی زندگی اور فن کے اس پُراسرار ۔ پرشوق اور پرخطر سفر کے بارے میں اس موڑ پر صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

(اس مضمون میں صرف چند سال قبل تک کا خیال نامہ درج ہے۔ اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات بھی دلچسپ اور قلم بند کرنے کے لائق ہیں اور اُن کا ذکر ابھی کرنا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی ۔ خیالؔ)



جشنِ خیالؔ ۔ مُرادآباد ۔ یوپی

(19 فروری 1976)

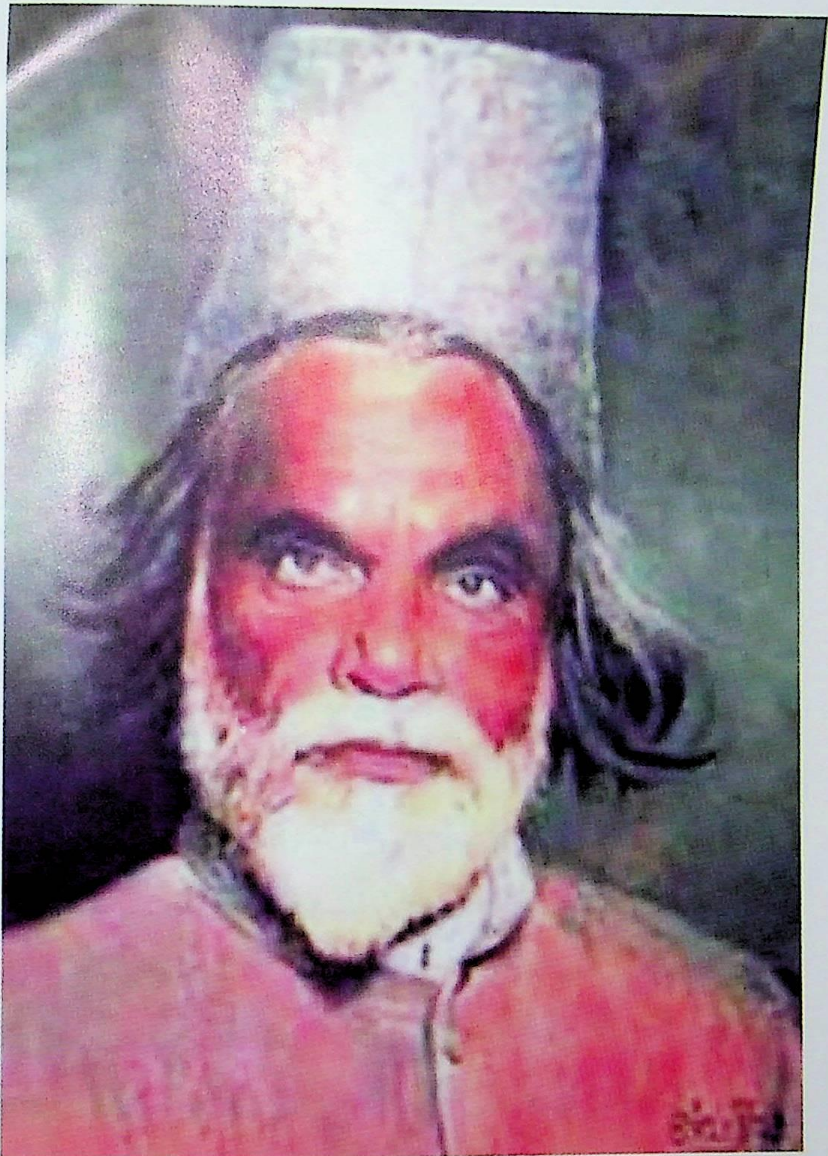
یہ تمہیدی سطور سہ روزہ ''اقبال'' سری نگر کے 22 مارچ 1976ء کے شمارے سے ماخوذ ہیں:

''اردو کے آفتابِ شاعری جگر مرادآبادی کے شہرِ غزل مرادآباد (یوپی) کے قارئین ''اقبالؔ'' نے کئی بار وہاں حاضر ہونے کا بلاوا بھیجا مگر میں اپنی بے حد مصروفیات کی وجہ سے اس حکم کو بجا نہ لا سکا۔

1976ء میں میری کشمیری تصنیف ''گاشری منار'' کیلئے مجھے ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نئی دہلی میں ایک تقریب پر نوازا گیا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرادآباد میں میرے قدردانوں اور خیالؔ نوازوں نے اس دعوت کی تجدید کر لی اور میں 19 فروری 1976ء کو اس شہر نگاراں میں پہنچا۔

دہلی سے تقریباً 160 کلومیٹر دور مرادآباد مغربی اتر پردیش کا ایک بہت بڑا تجارتی شہر ہے۔ یہاں پر تانبے، پیتل اور لوہے کی کاریگری کے بے مثال فن کار موجود ہیں جن کا تیار کردہ سامان ساری دنیا کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اسی لیئے اس شہر کو پیتل نگری بھی کہا جاتا ہے۔

اس شہر کا نام مغل بادشاہ شاہ جہان کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ



فکر ہندوستان، شان مرادآباد علی سکندر جگر مرادآبادی

مراد بخش کے نام پر رکھا گیا ہے۔ مراد بخش نے ہی سترھویں صدی کے وسط میں اس شہر کے قدیم نام رستم نگر کو بدل کر اسے اپنے نام کے ساتھ منسوب کیا۔

مراد آباد میں میری قدردانی اور عزت افزائی کی غرض سے وہاں کی خواتین ادبی سوسائیٹی نے ایک نہایت ہی رنگین اور شاندار ''شام خیال'' کا قابل تحسین اہتمام کیا تھا جس کی روداد یہاں پر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ساری کارروائی محنت شاقہ اور حسن ترتیب کے ساتھ میری پیاری بہن اور مراد آباد کی ممتاز شاعرہ مس قمر قدیر ارم نے قلم بند کی ہے۔

سوچتا ہوں کہ اپنے ان محبوں اور مشفقوں میں سے کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ کس کس کا نام لوں اور کس کس کی محبت پر قربان جاؤں جنہوں نے ایک ذرے کو آفتاب بنانے کی حسین و جمیل کوشش کی ہے۔ یہ روداد مراد آباد میں گذرے ہوئے خوبصورت اور معطر لمحوں کی خوشبو اور مہک سے پھر ایک بار دل و دماغ کو تازہ کرنے کی غرض سے پیش کی جارہی ہے اور احباب مراد آباد کے لئے خواجہ شیراز کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آرہا ہے:

اے غایب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
مے بینمت عیاں و دعامے فرستمت

☆

شہرِ جگر میں شامِ خیال

از محترمہ قمر قدیر صاحبہ ارم

(یہ کارروائی سہ روزہ ''اقبال'' سری نگر کی 22 مارچ 1976ء کی اشاعت سے من وعن نقل کر کے یہاں پر ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے)

19 فروری 1976ء کی شفق رنگ اجالوں میں ڈوبی ہوئی ایک حسین شام

ہے۔ مراد آباد سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ایک پر شہر مراد آباد کے شعراء اور شاعرات اور دیگر معززین گلاب اور گیندے کی مہکتی مالائیں اور گوٹے کے ہار لئے نہایت بے چینی سے کشمیر کے عظیم شاعر اور صحافی غلام نبی خیالؔ کے منتظر ہیں جو وشوناتھ ایکسپریس سے تشریف لانے والے ہیں۔

اچانک گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ فضا میں گونجی اور مشتاقانِ دید کے چہرے دمکنے لگے۔ مراد آباد کے وسیع وعریض پلیٹ فارم پر مسافروں کا ایک سمندر سا موجزن ہو گیا۔ آخرش گاڑی نمودار ہوئی اور اپنی منزل پر پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ منتظرین خیال کی کائنات شعور پر یہ سوال بار بار برق بن کر لہرا رہا تھا کہ وہ اپنے اجنبی مہمان کو کس طرح پہچانیں گے۔ مگر خلوص رہبر ہوا اور فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے اترتے ہوئے جناب خیال کو دیکھ لیا گیا اور جب ان کے بعد ان کے فرزندان و رفیقہ حیات گاڑی سے باہر آئے تو شبہ یقین میں بدل گیا۔ جنابہ مینا ناز مینا صدیقی نے اپنے معزز مہمان کو ہار پہنایا۔ اس کے بعد حاجی عبدالقدیر سابق چیرمین مراد آباد میونسپل بورڈ اور رئیس شہر جناب حاجی شمشاد حسین صاحب اور دیگر موجود شعراء اور شاعرات نے جناب خیال اور بیگم خیال کے گلے میں ہار ڈال کر پھولوں میں چھپا دیا۔

جناب خیال نے اپنے مخصوص انداز میں اہل مراد آباد کا شکریہ ادا کیا۔

تعارف کے بعد یہ قافلۂ رنگ و بو کاروں میں سما کر سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ سے گذرتا ہوا ''شان بھون'' کی سر بہ فلک عمارت میں پہنچ گیا۔ جس کا ہال مہمان کی قدم بوسی کے لیے ہزاروں آرائشوں سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ساکنانِ شان بھون فرشِ راہ بنے ہوئے اپنے معزز مہمان کو تیسری منزل پر لے گئے جہاں جناب خیالؔ اور دیگر مہمانوں کو پر تکلف ایٹ ہوم دیا گیا۔ آیئے اب جناب خیالؔ کو ذرا آرام کرنے دیجئے اور نیچے مشاعرہ گاہ میں چلیں۔

مشاعرہ گاہ بقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہکشاں عرصہ گیتی پہ اتر آئی ہے۔ مشاعرہ گاہ کے دونوں جانب بڑے بڑے پردوں پر نہایت خوبصورت تحریر میں ''شامِ خیال'' لکھا ہوا ہے۔ مہمان وخواتین سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ گیٹ پر ایک جم غفیر اکٹھا ہے مگر وہی خوش نصیب اندر داخل ہو رہے ہیں جن کے پاس دعوت نامے موجود ہیں۔ غیر مدعوئین اس انتظار میں کھڑے ہیں کہ شاعر کی صورت نہ سہی لاؤڈ اسپیکر پر آواز ہی سن لیں گے اور مائک پر ہندوستان کے مشہور طنز ومزاح نگار شاعر جناب دلکش آفریدی اعلان فرما رہے ہیں کہ حضرات وخواتین! جناب خیالؔ چند لمحوں میں مشاعرہ گاہ میں تشریف لانے والے ہیں۔ اس درمیان مقامی و بیرونی فن کاروں کے اسمائے گرامی کا اعلان کرتا ہوں جو محفل میں تشریف فرما ہیں۔ شاعرات ہیں: جنابہ سکندر شاہینؔ مشفق، جنابہ رئیس جہاں روشن، جنابہ نشی سکسینہ۔ جنابہ مینا ناز مینا۔ جنابہ ریحانہ پروین۔ جنابہ غزالہ صبا۔ جنابہ شگفتہ سمن۔ جنابہ شمیمہ شبنم۔ جنابہ ثریا جبیں۔ جنابہ شمع اقبال۔ جنابہ شکیلہ اکبر ناز اور مجھ کمترین یعنی راقمؔ الحروف مس قمر قدیر ارم کا نام لیا۔ کوی حضرات میں جناب سرویش کمار سروے۔ جناب کمل کشور جین۔ جناب شیلندر جوہری۔ جناب پرکاش وارشینی۔ جناب کوی شنکر۔ مکھن مرادآبادی اور فلم کوی سمیلن اور فلم ''مزے لے لو'' کے مشہور کوی جناب ہلڈ مرادآبادی کے نام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

مقامی و بیرونی شعراء میں جنابؔ کامل کتھولوی۔ جناب فصیح اکمل قادری شاہ جہاں پوری۔ جناب ندرت نواز امروہوی، جناب ظاہر امروہوی۔ جناب فہمی ہلدوانوی۔ جناب اثر بھوجپوری۔ جناب ماہر چاند پوریؔ۔ جناب خمار نہٹوری۔ جناب رضوان مسرور سنبھلی۔ جناب کمل ملتانی۔ جناب سحر انصاری مرادآبادی۔ جناب گوہرؔ عثمانی مرادآبادی۔ جناب استاد ربط مرادآبادی۔ جناب

اختر عازم مراد آبادی۔ جناب شہاب مراد آبادی ۔ جناب بزمی مراد آبادی۔ جناب انیس جلالی مراد آبادی۔ جناب دانش قریشی۔ جناب ہمایوں دیر ہمایوں مراد آبادی ۔ جناب اقبال بھارتی۔ جناب اکرم شمشاد۔ جناب اشہر مراد آبادی۔ جناب جام مراد آبادی۔ جناب ہلچل مراد آبادی۔ جناب منصور عثمانی مراد آبادی۔ جناب حاجی عبدالقدیر صاحب قدیر مراد آبادی اور مہمانِ خصوصی جناب غلام نبی خیالؔ کاشمیری۔

ابھی فضا میں اس اعلان کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ڈنر سے فارغ ہوکر جناب خیالؔ مشاعرہ گاہ میں تشریف لائے۔ تمام حاضرین نے کھڑے ہوکر مہمان کا استقبال کیا اور جب انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اپنی اپنی جگہوں پر حسبِ سابق بیٹھ گئے۔

''معزز حاضرین! انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ہمارے مہمانِ خصوصی تشریف لا چکے ہیں۔ میں خواتین ادبی سوسائیٹی مراد آباد کے زیر اہتمام اس مشاعرہ ''شام خیال'' کی صدارت کے لیے جنابہ پشپا بنسل صاحب ڈائریکٹر مہیلا کلیان سماج مراد آباد کا نام نامی پیش کرتا ہوں''

اس کے ساتھ ہی جملہ حاضرین نے صدارت کی تائید کی۔ حاضرین! مشاعرے ہماری تہذیب کا آئینہ ہیں۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم کشمیر کے عظیم صحافی اور شاعر اور ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ پانے والی کتاب 'گاشری منار' کے خالق جناب غلام نبی خیال ایڈیٹر سہ روزہ ''اقبال'' سرینگر کا جشن منا رہے ہیں۔ سب سے پہلے مراد آباد کی مشہور ادیبہ و شاعرہ مس قمر قدیم ارم کو دعوتِ سخن دے رہا ہوں کہ وہ بارگاہِ خیال میں اہل مراد آباد کی جانب سے اور بالخصوص خواتین ادبی سوسائیٹی کی جانب سے جس کی وہ سیکریٹری بھی ہیں خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمائیں۔

میں ناظم مشاعرہ جناب دلکش آفریدی کے حکم کی تعمیل میں گھبرا کر اٹھی۔ نتیجتاً میرا سر ایک خاتون کے سر سے ٹکرا گیا اور سینکڑوں سورج سر میں طلوع ہو کر غروب ہو گئے۔ اسی عالم میں جنابہ مینا ناز مینا صدیقی نے ڈھائی فٹ چوڑا اور تین فٹ لمبا شیشے کا وزنی فریم میرے کانپتے ہاتھوں میں پکڑا دیا اور میں نے خطبہ استقبالیہ پڑھنا شروع کیا۔

خطبہ استقبالیہ:

از قمر قدیر ارم

سکریٹری خواتین ادبی سوسائیٹی۔ مراد آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مہمان ذی مرتبت السلام علیکم

آج خواتین کی اس ادبی سوسائیٹی کا شہر مراد آباد میں پہلا اجلاس ہے۔

عالی جناب محترم المقام۔ مدبر قوم۔ فخر ملّت۔ صحافیِ زمانہ غلام نبی خیالؔ صاحب ایڈیٹر ''اقبال'' سری نگر کی تشریف آوری نے جو اس بزم کی قابل فخر اہمیت پیدا کر دی اس کو ضابطہ تحریر میں لانا میری طاقت سے باہر ہے۔ درحقیقت یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے اور ہماری باہمی تنظیم کی برکت ہے کہ آج ہم اپنے حلقہ میں ایک ایسی مقتدر اور ممتاز اور قابل صد فخر ہستی کو دیکھ رہے ہیں جس کے نیاز سے شرف اندوز ہونے کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

جناب غلام نبی خیال جیسی جلیل القدر ہستی کا سرزمینِ مراد آباد میں تشریف لانا اور ہم غریبوں کی ہمت افزائی کرنا گویا ایک ذرہ بے نور میں شانِ آفتاب پیدا کر دینا ہے۔ اس لیے ہم اپنے محترم مہمان کا پر جوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی تشریف آوری سے جو کرم ہم پر کیا ہے ہم اس کے لیے اپنے معزز مہمان کے بصمیم قلب رہینِ منت ہیں۔

نامناسب ہوگا اگر اس موقعہ پر اپنے ان معزز ترین مہمانوں کا دل کی

پوری گہرائیوں کے ساتھ پر جوش خیر مقدم اور بیش از بیش شکریہ نہ ادا کیا جائے جو مراد آباد کے علاوہ دوسرے شہروں سے ہماری تمنا بھری آواز کو صدائے لبیک سے نوازتے ہوئے شریک اجلاس ہوئے ہیں۔ لہذا میں اپنے ان جملہ مہمانوں کا بھی دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ان ضروری گذارشات و مبادیات کے بعد میں اپنے بزرگوں۔ مہمانوں اور ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اصل مقصد کی طرف آتی ہوں۔

معزز حضرات! مجھ نااہل کی ہستی کسی طرح اس قابل نہ تھی کہ عظیم شاعر و ناقد۔ ادیب وصحافی اور منفرد طرز کے انو کے طنز نگار جناب خیالؔ صاحب کے لیے خطبہ استقبالیہ لکھنے کا اعزاز مجھے بخشا جاتا لیکن قربان جایئے ان ذرہ نوازیوں کے جو میری بہن و شہر مراد آباد کی سرگرم ترین خاتون جنابہ مینا ناز صدیقی صاحبہ کی نظر انتخاب مجھ ناچیز پر پڑی اور میرے محترم اور حد درجہ شفیق انکل جناب دلکش آفریدی صاحب جن کی کوششوں نے نہ صرف میری والدہ محترمہ جنابہ مسز قدیر (بیگم رئیس جہاں روشن) صاحبہ کو اس بزم کے لیے منصب صدارت سے نوازا بلکہ مجھے بھی حوصلہ بخشا۔ دراصل یہ میرے محترم بزرگوں۔ عزیز بہنوں اور چند بھائیوں کی ہی ایک شانِ ذرہ نوازی ہے اور میرے متعلق حسن ظن کی کرشمہ سازیاں جن کی کارفرمائی میں مجھے ''استقبالیہ'' کی خوشگوار زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔

حضرات! دنیا میں کوئی قوم اپنا جماعتی وجود اور ترقی وقومی وقار برقرار نہیں رکھ سکتی تاوقتیکہ اس قوم کی خواتین ترقی پسند اور سمجھ دار نہ ہوں۔ ان میں باہمی اتفاق واتحاد۔ تعلیم اور آپس کے میل ملاپ سے اور تنظیم قوم کے افراد کو تسبیح کے منتشر دانوں کی طرح کسی ایک لڑی میں پرو کر منظّم کرنے کی اہلیت نہ ہو۔

میں یہاں کوئی تاریخی مثال نہیں دوں گی۔ جب خواتین کے حقوق کو

پائمال کیا گیا۔ ان کو پالتو جانوروں کی طرح بیچا گیا اور خریدا گیا اور تہذیبیں تباہ ہو گئیں کیونکہ آج بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ فرق صرف جدت طرازی کا ہے۔ نہ ہی میں یہاں فرائڈ کے ان نظریات پر روشنی ڈالوں گی جن میں ماں کی گود کو بچّے کی پہلی درس گاہ کہا گیا ہے اور نہ ہی میرا ارادہ اس وقت دانشوروں کے ان اقوال زریں کی جانب متوجہ کرنے کا ہے جن میں قوم کی ترقی اور تنزل کا انحصار عورت کی ترقی اور تنزل پر رکھا گیا ہے کیونکہ میرے خیال میں معزز سامعین خود اہل علم و دانش ہیں اور میں اپنی تقریر کی طوالت سے سمع خراشی کرنا بھی نہیں چاہتی۔ لہٰذا ان مذکورہ گذارشات کو اختتام پذیر کرنے کا بار میں اس شعر کے سپرد کر رہی ہوں کہ:

کہاں تک آج کا راون رہے گا سینہ سپر
بڑھیں اب عزم کی سیتائیں اس کو رام کریں

یہاں مختصراً میں اپنی اس تنظیم کا مقصد بیان کر دوں جس کا مقصد حقیقت میں بہنوں میں ادبی وسماجی اور تعلیمی جاگرتی پیدا کر کے ان کی انحطاط پذیری کو دور کرنا اور صحیح طریقے سے عزائم۔ مشرقیت اور اشتراک کے ساتھ تہذیبی۔ ثقافتی اور تمدنی ترقی کو فروغ دینا ہے۔ اس کے بعد جو اہم چیز ہمارے پیشِ نظر ہے وہ رسم ورواج کی اصلاح اور نمائش رسم و رواج کو دور کرنا ہے تا کہ وقت کے راونوں کو رام بنایا جا سکے اور مستقبل کے شاندار خواب تشنہ تعبیر نہ رہ سکیں۔

اب میں اس تقریر کے سب سے اہم پہلو کی طرف آتی ہوں۔

واقعی ساہتیہ اکادمی کا یہ حسن انتخاب ہی تو ہے کہ خیال صاحب کے شاہکار ''گاشری منار'' کو اس کی حقیقی عظمت پہچانتے ہوئے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ہم سب کے لیے ایک انتہائی مسرت کی بات ہے۔ کاش آج ہمارے گنجینہ الفاظ میں وہ دلکش الفاظ ہوتے جو موصوف کے شایانِ شان اُن

کو مبارکباد دے سکتے اور ہماری خوشیوں کے صحیح عکاس ہوتے۔ بس قلم برداشتہ ایک قطعہ ہو گیا ہے جو پیشِ خدمت ہے:

شعور و فکر کے فانوس جگمگائے ہیں
دل و نگاہ کے آئینے مسکرائے ہیں
سری نگر کی مہکتی ہوئی فضاؤں سے
خوشا نصیب جناب خیالؔ آئے ہیں

خاکسار قمر قدیر ارمؔ

شان بھون فیل خانہ۔ مراد آباد۔ یو پی

19 فروری 1976ء

دلکش آفریدی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ حضرات و خواتین! یہ تھیں مس قمر قدیر ارم جنہوں نے اپنی معجز کلامی سے خطبہ استقبالیہ میں چار چاند لگا دیئے اور ہر ہر لفظ اور ہر ہر سطر کو اس اعتماد سے پیش کیا کہ حق ادا کر دیا۔ ان کا یہ قطعہ:

شعور و فکر کے فانوس جگمگائے ہیں
دل و نگاہ کے آئینے مسکرائے ہیں
سری نگر کی مہکتی ہوئی فضاؤں سے
زہے نصیب جناب خیالؔ آئے ہیں

ان کی عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ اب میں ہندوستان کی مشہور شاعرہ جنابہ مینا ناز مینا صدیقی کو دعوتِ کلام دے رہا ہوں۔ مینا صاحبہ ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کی ذات اردو کے شکستہ ایوان کے لیے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مائک پر مینا صاحبہ کی آواز اُبھری۔

"میں اپنے معزز مہمان جناب خیال صاحب کی آمد کے سلسلے میں ایک

نظم پیش کر رہی ہوں جو میرے احساسات کا مرقع ہے۔ امید ہے کہ قبولِ خاطر ہوگی:

اے ناقد و ادیب و سخن ور خوش آمدید
اے ڈل کی وادیوں کے گلِ تر خوش آمدید

دادو تحسین کا اِک طوفان اٹھا اور کئی بار اس مطلع کو پڑھا گیا۔

اے ''کاشری منار'' کے خالق سلامِ شوق
کشمیر کے ادب کے پیمبر خوش آمدید
اے الفت و خلوص کے تابندہ شاہکار
اے علم و آگہی کے سمندر خوش آمدید
اے امن و آشتی کے نمائندہ ترجمان
اے مہرو التفات کے پیکر خوش آمدید
شعروں میں گھل رہی ہے محبت کی چاندنی
چرخِ ادب کے ماہِ منور خوش آمدید
ہر غنچہ فرشِ راہ بنا ہے بصدِ خلوص!
ہر ذرہ کہہ رہا ہے برابر خوش آمدید
آئے ہمارے شہر میں سو بار شکریہ
اے حضرتِ خیالؔ اے فن کار شکریہ

دادو تحسین کے بے پناہ شور میں مینا صاحبہ رخصت ہوئیں۔

مینا صاحبہ کے بعد اب میں ایک ایسی شاعرہ سے درخواست کر رہا ہوں جو خود ہی مجسم غزل ہیں۔ غزل کیا ہیں بلکہ غزلوں کا دیوان ہیں۔ مرا روئے سخن ہے مس شگفتہ سمن کی جانب ہے کہ وہ تشریف لا کر اپنے کلامِ بلاغت نظام سے مستفید فرمائیں۔



قدیم مرادآباد میں نوابی دروازہ کی تصویر

یہ تصویر 1814 عیسوی میں سیتارام نامی ایک فوٹوگرافر نے کھینچی ہے

اور شگفتہ سمنؔ صاحبہ قدم قدم پر محشر جگاتی ہوئی مائک پر تشریف لائیں اور گویا ہوئیں ''خیال صاحب کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرتی ہوں'' اور ابھی پہلا ہی مصرعہ زبان سے نکلا تھا کہ محفل کی فضائیں نغمہ بار ہوگئیں۔کائنات جھوم اٹھی:

کس قدر شوخ کس قدر سادہ
ہے پہاڑوں کا ایک شہزادہ
پیکر مہرو مرکز الطاف
امن اور آشتی کا دلدادہ
دل ہے صد رشک ساغر جمشید
آنکھ ہے سلسبیل کا بادہ
پتھروں کے نگر سے آیا ہے
ایک شیشہ گروں کا سجّادہ
لوگ جس کو خیالؔ کہتے ہیں
آدمی ہے وہ مگر پری زادہ

بے پناہ داد و تحسین میں مس شگفتہ سمنؔ رخصت ہوئیں۔

''اب میں مراد آباد کے افق سے طلوع ہونے والی روشنی جنابہ غزالہ صبا کے آگے شمع محفل رکھ رہا ہوں۔مراد آباد کی جدید نمائندہ رجحانات کی شاعرہ ہیں۔نظم و غزل پر مکمل عبور رکھتی ہیں۔تشریف لاکر اپنے کلام سے مستفید فرمائیں''

جنابہ غزالہ صباؔ کتابوں کی روایتی شاعرہ کی طرح مائک پر تشریف لائیں۔

''حضرات و خواتین! میں کئی دن سے علالت کا شکار ہوں۔ڈاکٹر نے

مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ حضرتِ خیال کے جشن نے توانائی عطا کی مگر ترنم سے نہ پڑھ سکوں گی۔ تحت میں ہی ملاحظہ فرمائیں۔ بعنوانِ ''نذر خلوص'':

وہ زعفران کے کھیتوں کا ایک شہزادہ
وہ کاشمیری ثقافت کا ایک سجادہ
وہ ڈل کی وادی گل بار کا حسیں عنوان
وہ شالا مار کی جنت کا ایک سروستان
وہ ایک شاعر و ناقد و فلسفی و مدیر
کشادہ قلب۔ کشادہ نظر۔ کشادہ ضمیر
وہ گنگناتے ہوئے آبشار کا شاعر
وہ برف زار کا وہ کوہسار کا شاعر
پہاڑ کاٹ کر شہر جگر میں آیا ہے
خیال کو چہ کیف و قمر میں آیا ہے
بہار آئی خزاں کا حصار ٹوٹ گیا
زہے نصیب کہ اب انتظار ٹوٹ گیا
میری خوشی ہے کہ اس دن کو روزِ عید کہوں
بصد خلوص ومحبت خوش آمدید کہوں
ادیب و ناقد وشاعر عقیدتوں کا سلام
سری نگر کے مسافر عقیدتوں کا سلام
ادب کا جشن منانے کا شکریہ ہو قبول
ہمارے شہر میں آنے کا شکریہ ہو قبول

سامعین داد و تحسین کے خزانے لٹاتے رہے اور ہر ہر شعر پر مرحبا کی

آوازیں گونجتی رہیں۔

''میں غزالہ صبا کو ایسی کامیاب نظم پر مبارکباد دیتے ہوئے ایک ایسی ہستی کو دعوتِ سخن دے رہا ہوں جنہوں نے ہمیشہ ادبی مجالس کی سرپرستی فرمائی ہے اور دامے درمے قدمے سخنے ہمیشہ ادبی اداروں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

میرا روئے سخن جنابہ رئیس جہاں روشن صاحبہ کی طرف ہے۔ تشریف لاکر کلام سے سرفراز فرمائیں۔

رئیس جہاں روشن صاحبہ اپنے تمام جاہ وجلال کے ساتھ مائک پر تشریف لائیں اور اپنی انگبین آواز کا جادو کچھ اس طرح جگایا کہ میں بھی کھوئی سی صرف ایک قطعہ نوٹ کر پائی:

گل رنگ بہاروں کی نمائش ہے چمن میں
نغمات ہی نغمات ہیں غنچوں کے دہن میں
کشمیر کی جنت سے خیال آئے ہیں روشن
عنبر کے خزانے ہیں میرے شان بھون میں

اور قطعات کے اس عنبر بیز ماحول میں ناظم مشاعرہ جناب دلکش آفریدی فرمارہے ہیں۔

''حاضرین! میں آپ کے حسبِ فرمائش اپنے کلام بے لگام سے ضرور بور کروں گا۔ مگر شعرا اور شاعرات کی کافی طویل فہرست ہے۔ تمام فنکاروں سے التماس ہے کہ کلام میں اختصار سے کام لیں ورنہ یہ مشاعرہ کل تک ختم نہ ہوگا۔ اب ہلدوانی ضلع نینی تال کے نوجوان شاعر جناب فہمی کے کلام سے غزل کے دور کا آغاز کرتا ہوں''

فہمی صاحب سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے مائک پر تشریف لائے اور

جناب خیال کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت عمدہ ترنم سے مطلع پڑھا:

دِل کا ہر قطرۂ خوں چیخ رہا ہو جیسے
زندگی کیا ہے جرائم کی سزا ہو جیسے
اس طرح گونجتی رہتی ہے یہ آوازِ ضمیر
میرے سینے میں خدا بول رہا ہو جیسے

فہمی صاحب واہ واہ کے شور میں رخصت ہوئے تو ایک اور مہمان شاعر خمارؔ نہٹوری کو دعوتِ سخن دی گئی:

میری فطرت میں مے پرستی ہے
چشمِ ساقی سے مے برستی ہے
اس نظر کو نظر ترستی ہے
جس نظر میں بلا کی مستی ہے
جانے کیوں اب بھی ان کی یادوں کی
ایک ناگن سی دل کو ڈستی ہے

اور جناب خمارؔ نہٹوری کے بعد دعوت سخن دی جارہی ہے جناب ہلچلؔ مراد آبادی کو۔ ہمارے بالکل نزدیک سے جناب ہلچلؔ صاحب اٹھ رہے ہیں۔ سامعین کی داد منزل بیداد تک پہنچ گئی ہے۔ شوروغل میں کوئی شعر سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ حضرت کیا پڑھ رہے ہیں۔

حاضرین! ہلچلؔ صاحب واقعی اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے اور آپ لوگوں میں بھونچال پیدا کر کے چلے گئے۔ اب میں مشاعرہ کا رنگ بدل رہا ہوں اور گیتوں کے راجکمار شری کوی شنکر جی سے انورودھ کروں گا کہ وہ منچ پر پدھاریں اور اپنی کویتا سے ہواؤں میں رس گھول دیں۔“

شری شنکر جی مائک پر تشریف لائے اور جناب خیالؔ کا ابھی نندن

کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں اس طرح نغمہ سرا ہوئے:

جب چھائے گھٹا ساون کی　　رنگ لائیں امنگیں جیون کی
ہر ڈالی پہ کوئل بولے!　　جیون میں مدھو رس گھولے
بادل جب رم جھم برسے　　پھولوں کا من بھی ڈولے
کلیاں مسکائیں اُپون کی　　جب چھائے گھٹا ساون کی

شری کوی شنکر جی خاطر خواہ داد وصول کر کے رخصت ہوئے تو ناظم مشاعرہ نے مراد آباد کے نمائندہ اور ذی شعور شاعر جناب اشہر مراد آبادی کا نام نامی پکارا۔ موصوف نے خوبصورت ترنم میں بہت خوبصورت غزل چھیڑی:

جن لوگوں کو دنیا میں جینے کے قرینے ہیں
دل ان کے ہیں پھولوں کے فولاد کے سینے ہیں
ممکن ہو تو لے آنا کچھ گیت محبت کے
سنتے ہیں خلاؤں میں نغموں کے سفینے ہیں
فن کار سمجھتے ہیں اب لوگ تمہیں اشہر
اب تیر بھی کھانے ہیں اور زہر بھی پینے ہیں

اشہر صاحب بے پناہ داد وصول کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ اب ناظم مشاعرہ مس شکیلہ اکبر ناز کو دعوت سخن دے رہے ہیں۔ شکیلہ اکبر ناز صاحب کا نام دنیائے ادب کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اردو اخبار و رسائل پڑھنے والے مدتوں سے ان کا کلام پڑھتے آرہے ہیں۔ آپ بڑے پروقار انداز میں مائک پر تشریف لاتی ہیں۔ چہرے پر ملکوتی تبسم ہے۔ موصوفہ غزل سرا ہیں۔ ہر ہر شعر پر داد و تحسین کا طوفان برپا ہے۔ فکر و احساس آواز کی نغمگی میں گم ہیں:

یہ خواب تمنا کی تعبیر نظر آئی
جو زلف نظر آئی زنجیر نظر آئی

موہوم نگاہوں میں ہر سمت اندھیرے تھے
اب آپ کو دیکھا تو تنویر نظر آئی
اے ناز نہیں سوچا انجام تمنا کا
اور آج خود اپنی ہی تفسیر نظر آئی

محفل پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے۔ شکیلہ اکبر ناز صاحبہ تشریف لے جا چکی ہیں۔ اچانک ناظم مشاعرہ نے محفل کو جام مرادآبادی کی مائک پر آمد کا مژدہ سنا کر بیدار کر دیا۔ غزل شروع ہوتی ہے:

تمھاری ضد کا یہ عالم ہے کیا کیا جائے
ہر ایک شخص کا سر خم ہے کیا کیا جائے
اندھیری رات ہے زنداں ہے اور یہ تنہائی
میرے چراغ کی لو کم ہے کیا کیا جائے
ہر ایک حسن سے دامن بچا کے گذرا ہوں
یہ جام ان کا ہی اک غم ہے کیا کیا جائے

ترنم سے برستی ہوئی کہکشاں نے زمین سے آسمان تک گویا ایک نور کی چادر تان دی ہے۔ ہر ایک دل گم سم ہے۔ خود مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ خدا معلوم یہ چند اشعار بھی کس طرح نوٹ کر پائی۔ ابھی یہ کیفیت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مہمان شاعر اور اردو غزل میں جدید قدروں کے نقیب جناب وجیہہ ادیب بچھڑایونی کو دعوتِ سخن دی جا رہی تھی۔ وجیہہ صاحب مسکراتے ہوئے مائک پر تشریف لائے اور جناب خیالؔ کی نذر کرتے ہوئے تحت میں غزل سرا ہوئے:

اپنے کاندھوں پہ لرزتا ہوا میرا ہی وجود
کرب کے شہر میں پھرتا ہے میری لاش لئے
میری امید کا قاتل ہے زمانہ لوگو!

پھر بھی شہزادی احساس ہے کنگن پہنے
بھاپ میں پی کے سمندر سے چلا آتا ہوں
آپ کے شہر میں ہن بن کر برسنے کے لیے

مشاعرہ شباب پر ہے۔ لیجیے غزل کی نئی نسل کے شاعر کو زحمتِ کلام دے رہا ہوں۔ میرا روئے سخن مہمان شاعر جناب ظفؔر وصفی خماری سے ہے جو حضرت خمارؔ بارہ بنکوی کے ہی شاگرد رشید ہیں۔

ناظم مشاعرہ کے اعلان کے ساتھ ہی ساتھ جناب ظفؔر چہرے پر شاعرانہ جلال لئے مائک پر تشریف لائے۔ سامعین پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ آنکھیں سرخ بھنویں تنی ہوئی۔ آپ فرمارہے ہیں:

عروجِ دار کا منظر میری تلاش میں ہے
بغاوتوں کا مقدر میری تلاش میں ہے
میں اپنے دور کا فرہاد ہوں جہاں والو
ہر ایک راہ کا پتھر میری تلاش میں ہے
کسی کے پاؤں کی آہٹ ہے دل کی دھڑکن میں
ازل سے کوئی برابر میری تلاش میں ہے
وہ جس کو عہد محبت میں بیر تھا مجھ سے
وہ اب چراغ جلا کر میری تلاش میں ہے

اب جناب نازشؔ مراد آبادی کو پکارا جارہا ہے۔ جناب نازش قمر سکول کے نمائندہ شاعر ہیں۔ تغزل کا وہ رنگ جو مراد آباد کا حصہ ہے ان کے کلام میں ملتا ہے۔ ترنم سے غزل پڑھ رہے ہیں:

پیش آئی یہ واردات کہاں
لٹ گئی دل کی کائنات کہاں

وہ تو گیسو بکھر گئے ان کے
ورنہ لیتی پناہ رات کہاں

اب جناب طاہر امروہوی کو دعوت کلام دی جا رہی ہے۔ طاہر صاحب حب الوطنی سے معمور نظم پڑھ رہے ہیں مگر اتنی تیزی سے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ہندوستان وہ ملک ہے جنت کہیں جسے
اور سرزمینِ دانش و حکمت کہیں جسے

لیجیے ہندوستان کی مشہور شاعرہ جنابہ نشی سکسینہ اب مائک کے قریب ناظم مشاعرہ جناب دلکش کی اپیل پر آ چکی ہیں۔ موصوفہ کا نام نامی ہندی ادب کے شیدائیوں کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ آپ عرصہ دراز سے ادبی پروگراموں میں مراد آباد کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔ پہلے آپ نے گیت سے فضا میں نغمے بکھیرے:

ایک بار تم مل جاتے تو اسپھل جنم سپھل ہو جاتا
سانسیں بن جاتیں پُروائی آنسو گنگا جل ہو جاتا
میرے جیون کے دیپک میں یاد تمھاری جیسے باقی
تم ہی میرا جنم مرن ہو جنم جنم کے سنگ کا ساتھی
تم ہوتے تو دھواں نہ اٹھتا نینوں کا کاجل ہو جاتا
ایک بار تم مل جاتے تو اسپھل جنم سپھل ہو جاتا

نشی صاحبہ کے اس گیت میں کچھ ایسی دلفریبی ہے کہ جی چاہتا ہے بار بار سنا جائے۔ ازاں بعد زبردست فرمائش پر آپ نے یہ غزل ارشاد فرمائی:

اسی کشمکش میں گذری شب غم کہ اب وہ آئے
جو چراغ بجھ چکے تھے وہی بارہا جلائے

غم دل سے تنگ آ کر تجھے بھولنے کی دھن میں
کئی راگ ہم نے چھیڑے کئی گیت گنگنائے

یہ مزاج اپنا اپنا یہ طریق اپنا اپنا
کوئی کیسے یاد رکھے کوئی کیسے بھول جائے

نشی صاحبہ رخصت ہوئیں تو امروہہ کے مشہور شاعر جناب ندرت نوآز کو دعوت سخن دی جارہی ہے۔ ندرت نواز صاحب ادبی دنیا کے جانے پہچانے فنکار ہیں۔ مطلع تا مقطع ہر ہر شعر پر سامعین نے داد کے خزانے لٹادیئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جس کو اپنے قریب پاوے ہے — دل اسی سے فریب کھاوے ہے
اس سڑک پر وہ گھر نہیں ملتا — جو سڑک اس کے گھر کو جاوے ہے
میں تو اس کا پتہ ہوں لیکن وہ — مجھ سے اپنا پتہ چھپاوے ہے
یوں تو مجھ سے خفا ہے وہ لیکن — شعر بھی میرے گنگناوے ہے
کیوں ہے ندرت نواز چپ اتنا — کون سا دکھ اسے ستاوے ہے

جناب ندرت نواز کے بعد ڈاکٹر ایوب الٰہی ماہر چاند پوری کو دعوت کلام دی جارہی ہے۔ ماہر صاحب نہایت ذی علم اور ادب نواز انسان ہیں اور کئی انجمنوں کے سرپرست ہیں۔ حضرت ماہر متفرق اشعار پڑھ رہے ہیں:

جو دبادی گئی تھی وہ آواز
گونجتی ہے اب آسمانوں میں



دوسروں پر کوئی الزام لگایا جائے
اس سے بہتر ہے کہ خود راہ پہ آیا جائے



ہاتھوں میں کاش دامنِ صبحِ یقیں رہے
یہ سوچ کر اٹھے ہیں اندھیرا نہیں رہے

ڈاکٹر ماہر چاند پوری کے بعد شمع محفل محترمہ ناہید صہبا کے روبرو رکھی گئی۔ جنابہ ناہید صہبا دنیائے شاعری میں نوارد سہی مگر سخت ریاض کی بدولت نہایت عمدہ شعر کہتی ہیں آپ کی غزل:

آج ہر شے سے آشکارا ہے
آدمی آدمی کا مارا ہے
قائدینِ جہاں سے بچ کے چلو
منزلوں نے تمہیں پکارا ہے
دل برباد کا پس منظر
ان کا ہلکا سا اک اشارا ہے
چھوڑیئے داستانِ دیر و حرم
دیکھئے کیا حسیں نظارا ہے

جنابہ صہبا اپنی مترنم آواز کا جادو جگا کر اپنے دامن میں آفرین کے خزانے لئے رخصت ہوئیں تو شری کاریندر دیو مکھن مرادآبادی کو دعوتِ کلام دی جارہی ہے۔ مکھن جی ہندی ساہتیہ کے جانے مانے ہانسی رس کے کوی ہیں مگر آج نہایت سنجیدگی سے گیت گنگنا رہے ہیں:

دِن کی چنتا۔ ہنسے سویرا۔ بہت دور ہے شام
کیسے طے ہو دوری لمبی۔ اچھا جانے رام
کپڑوں سے بھی اچھی لگتی تن پر لپٹی دھول
ہائے جوانی ہنسنا اب تو مکھن گیا ہے بھول

ارے وِوستا ملن ہوا ہے سرنم رُوپ سلونا
نئی آنکھیں مون لئے ہیں ٹوٹا ہوا کھلونا
اتر سارے رہے ادھورے پورے واک ورام
دن کی چنتا۔ ہنسے سویرا۔ بہت دور ہے شام

شری مکھن جی اپنی کویتا کا مکھن کھلا کر رخصت ہوئے تو حضرت یوسف امروہوی کو دعوتِ سخن دی گئی۔ حضرت یوسف امروہوی ہندوستان کے ممتاز شعراء میں سے ہیں اپنے گونج دار ترنم میں غزل سرا ہوئے:

ذرے ذرے میں جس کا جلوہ ہے سوچتا ہوں وہ ذات کیا ہوگی؟
ان کی رخصت کا دن قیامت ہے ان کی فرقت کی رات کیا ہوگی؟
عشق خود ساختہ ہے اے یوسف اب کوئی واردات کیا ہوگی؟

یوسف صاحب دادو تحسین کے ریکارڈ توڑ کر ہٹے تو فلمی شاعر اور ہندی منچ کے مشہور کوی شری ہلڑ مراد آبادی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ ہلڑ جی نے پہلے ایک نظم بعنوان ''چیچک کی تلاش'' پھر ''ایمر جنسی'' اور پھر ''غریبی'' سنائی۔ ان کی کسی نظم کو دائرہ تحریر میں قید کرنا مشکل تھا۔ پھر میں نے ایک چھکا لکھ ہی لیا۔ ملاحظہ ہو:

منڈپ میں کہنے لگیں مجھ سے مس دستور
لڑکی ہی کی مانگ میں کیوں بھرتے ہو سندور
کیوں بھرتے سندور آدمی بچ جاتے ہیں
یہ بھی اپنی مانگ کیوں نہیں بھرواتے ہیں
کہہ ہلڑ یدی سبھی آدمی مانگ بھراتے
دنیا بھر کے گنجے سب کنوارے رہ جاتے

داد کے بے پناہ شور میں عمارت گر جانے کا اندیشہ ہوگیا تھا۔ ہلڑ جی

خیالؔ صاحب کا ابھی نندن کرتے ہوئے رخصت ہوئے تو ناظم مشاعرہ جناب دلکشؔ آفریدی صاحب کی آواز بھری۔ ''اب میں ایک ایسے عظیم فن کار کو دعوتِ کلام دے رہا ہوں جو مایہ ناز ڈرامہ نگار، قابلِ فخر مصور اور معجز کلام شاعر ہے ہر چند کہ یہ ان کا مقام نہیں ہے۔ میرا روئے سخن جناب سروے صاحب کی جانب ہے۔ مودبانہ التماس ہے کہ تشریف لاکر ممنون فرمائیں''۔

جناب سرو میشور سرن سروے بزرگ شاعر ہیں۔ تحت میں پڑھنے کا مخصوص انداز ہے۔ صرف ہاتھ اور آنکھوں کی جنبشوں سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا فرمانا چاہتے ہیں:

عشق بیٹھا سرنگوں خاموش ہے
حسن کو خود حسرتِ آغوش ہے
میکدہ بھی ایک پرچھائیں سی ہے
ہوش میں آنے کا کس کا ہوش ہے

سامعین بے تحاشہ داد دے رہے ہیں۔ سروے صاحب کے بعد عظیم فلسفی و شاعر حضرت آزاد نور پوری کو اس شعر کے ساتھ دعوت کلام دی جارہی ہے:

آؤ چل کر دیکھ لیں آزاد کو
لوگ کہتے ہیں بڑا ذی ہوش ہے

حضرت رمیش چندر آزاد نور پوری پنجاب کی رومان پرور وادیوں کے رہنے والے ہیں مگر اُن کا کلام تصوف و فلسفے سے معمور ہے۔ مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور دلآویز ترنم کے ساتھ کئی غزلیں فرمائیں۔ ہر ہر شعر عظیم فنکارانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے:

موت قسمت کا نوشتہ ہے کوئی غم نہ کرو
زلفِ برہم کو سنوارو میرا ماتم نہ کرو

دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

اب جنبش حیات پہ طاری جمود ہے
نس نس میں رینگتا ہے لہو دوڑتا نہیں
کتنی عمیق سو گئی آدم کی روح آج
اب صورِ سرافیل بھی جھنجھوڑتا نہیں

دادو تحسین سے جھولیاں بھرے رخصت ہوئے تو جناب اختر عازمؔ صاحب تشریف لائے۔ نہایت عمدہ ترنم سے غزل سرا ہوئے:

دل سنبھل تیرے دھڑکنے کا مقام آتا ہے
ان کے ہاتھوں سے میرے ہاتھوں میں جام آتا ہے
دل جسے لوگ سمجھتے ہیں بڑے کام کی چیز
صرف جلنے کے لئے ہجر میں کام آتا ہے

عازمؔ صاحب کے کلام کو خوب پسند کیا گیا۔ آپ مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے تو جناب بزمیؔ کیفی سے درخواست کی گئی۔ جناب بزمی مراد آباد کے ممتاز شعراء میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا قطعہ مجھ کو بے حد پسند آیا:

روز ہی کشمکش ہوش و نظر ہوتی ہے
کیا بتاؤں میری کس طرح بسر ہوتی ہے
زندگی ہوتی ہے ہستی کو مٹا کر بزمیؔ
ڈوب جاتے ہیں ستارے تو سحر ہوتی ہے

بزمیؔ صاحب کے بعد جناب شہاب مراد آبادی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ شہابؔ صاحب منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ اُن کی آواز نغمگی کے طلسم میں اس طرح گم ہوئی کہ شعر لکھنے کا ہوش نہ رہا۔ صرف ایک شعر ان کا پیش کر سکتی ہوں:

بہت مشکل ہے تکمیل محبت
جو تم چاہو تو کچھ مشکل نہیں ہے

مشاعرہ پوری طرح بیدار ہے۔ شہاب صاحب واہ واہ کے طوفان میں رخصت ہوئے تو مجھے اور غزالہ صبا کو چائے کے انتظامات کے لئے بالائی منزل پر بھیج دیا گیا اور میں اپنا قلم اور کاغذ شگفتہ سمن کے سپرد کر کے مطمین ہوگئی۔ چائے کے انتظامات میں خلاف توقع زیادہ دیر ہوگئی اور جب میں واپس آئی تو شعراء کی فہرست میں سے بہت سے نام کٹ چکے تھے۔ مگران کے کلام کی جگہ خالی تھی اور شگفتہ سمن ایک لفظ بھی نہ لکھ سکی تھی۔ معلوم ہوا وہ خود ایک مہمان کے سواگت میں لگی ہوئی تھی۔ شعراء میں جناب کامل کھتولوی۔ جناب فصیح اکمل قادری۔ جناب استاد ربط۔ جناب دانش قریشی۔ جناب انیس جلالی۔ ماسٹر زاہد مرادآبادی۔ کنول ملتانی۔ رضوان مسرور سنبھلی۔ اقبال بھارتی۔ جناب ہمایوں قدیر ہمایوں۔ جناب اکرم شمشاد۔ جناب اثر بھوج پوری۔ شری پرکاش وارشینی اور شاعرات میں جنابہ شمیمہ شبنم۔ جنابہ ریحانہ پروین امروہوی اور شمع اپنا کلام سنا چکی تھی مشاعرہ شروع ہوئے ساڑھے سات گھنٹے ہو چکے ہیں اور شان بھون کے کلاک کی سوئیاں حسب معمول دنیا کے جھمیلوں سے بے خبر اپنا کام انجام دے رہی ہیں۔ تین بجا کر اب وہ آدھا راونڈ اور طے کر چکی تھیں۔ مجھ کو ان فنکاروں کے کلام سے محروم ہونے کا انتہائی افسوس ہو رہا ہے۔

خیر آگے چلئے۔ ابھی میں نے دم نہ لیا تھا کہ ناظم مشاعرہ حضرت دلکش آفریدی کی گونج دار آواز ابھری ”اب میں مرادآباد کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ مس قمر قدیر ارم کو غزل کے لیے زحمتِ کلام دے رہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اہل محفل بھی مرادآباد کی اس مایہ ناز بیٹی اور عظیم شاعرہ کا کلام سننے کے لئے بیقرار ہوں گے:

ہوائیں غزل پر غزل گا رہی ہیں
سرانجمن اب ارم آ رہی ہیں

اور میں نے خودفراموشی کے عالم میں غزل کا مطلع پڑھا:

بھری محفل میں ہم سوچا کیے بیٹھے ہوئے تنہا
کہ کیوں محروم ہم ان کی توجہ سے ہوئے تنہا

مجھے معلوم ہی نہیں ہو کہ کب پہلا مصرعہ منہ سے نکلا اور کب دوسرا؟ ایک ایک شعر کو دہراتے دہراتے میں تھک سی گئی۔ داد و تحسین کی صدائیں تھیں کہ معاذ اللہ۔ اکثر مجھے سامعین کے جوش بے پناہ کے نارمل ہونے تک کا انتظار کرنا پڑا۔ یہاں اس غزل کے چند اشعار لکھوں گی:

سزا دونوں کو ملنی چاہیئے جرم محبت کی
کہ مجرم آپ ہی کیوں ہوں میرے ہوتے ہوئے تنہا
وہ جن راہوں پہ ہم اور تم چلے تھے ہم سفر ہو کر
اب ان راہوں پہ مدت ہوگئی بھٹکے ہوئے تنہا
بہت ہی دور منزل ہے جہاں ہم کو پہنچنا ہے
اکیلے ڈر رہے ہیں ہم مگر چلتے ہوئے تنہا
میری خوشیاں جو تم نے چھین لیں احساں کیا مجھ پر
لو رخصت ہو رہے ہیں ہم مگر روتے ہوئے تنہا

''حاضرین! آپ نے ارم صاحبہ کی غزل ملاحظہ فرمائی۔ ان کی غزل تغزل کی معراج اور ان کا ترنم گنگناتے ہوئے آبشاروں کی طرح غیر فانی ہے''

میرے بارے میں بھی وہی فارمیلٹی نبھاتے ہوئے ناظم مشاعرہ اب مرادآباد کے ممتاز شاعر اور فخر غزل حضرت قمؔر مرادآبادی کے جانشین حضرت گوہر عثمانی صاحب سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ اپنے کلام سے مستفید فرمائیں۔ جناب گوہر عثمانی نے اپنے مخصوص انداز میں قطعات اور غزل ارشاد فرمائی۔ اسی درمیان خواتین میں چائے وغیرہ سرو کرنے کے چکر میں بہ مشکل

ایک قطعہ موصوف کا سپردِ قلم کر سکی ہوں جو مجھے بے حد پسند آیا تھا:

ضرور آپ کو محسوس کچھ کمی ہوگی
جو ہم نہ ہوں گے تو ہر آنکھ شبنمی ہوگی
جسے فضول سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلے گا تو روشنی ہوگی!

جناب گوہر عثمانی مشاعرہ لوٹ کر رخصت ہوئے تو مراد آباد کی بزرگ ترین شاعرہ جنابہ سکندر شاہین مشفق صاحبہ کو دعوت کلام دی جا رہی ہے۔

''حاضرین دنیائے شعر و ادب میں نہ شاعروں کی کمی ہے نہ شاعرات کی مگر ایسے فنکاروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جن کی ذات زبان و ادب کے استحکام کا سبب رہی ہو۔

یہ بات ہمارے لئے باعثِ انبساط ہے کہ ہمارے درمیان وہ عظیم المرتبت شاعرہ موجود ہے جس کی فنکارانہ عظمتوں پر زبان و ادب فخر کرتے ہیں۔ میرا روئے سخن خاتونِ غزل جنابہ سکندر شاہین مشفق صاحبہ کی جانب ہے۔ مؤدبانہ التماس ہے کہ اپنے افکاراتِ عالیہ سے مستفید فرمائیں''

ناظمِ مشاعرہ کی آواز کی بازگشت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ محفل میں ایک طوفان سا آ گیا۔ ہم بچپن سے ادبی محفلوں میں یہ نام سنتے چلے آ رہے تھے اور اردو کے اخبار و رسائل میں کلام پڑھتے رہتے تھے۔ مگر آج تک شرف نیاز حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اچانک خواتین میں سے ایک باوقار خاتون اٹھیں جن کی آنکھوں میں ذہانت کی بجلیاں۔ ہونٹوں پر ملکوتی تبسم اور پیشانی سے علم و فن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ یہ تھیں شاعرات کی شاعرہ جنابہ شاہین مشفق صاحبہ جنہوں نے اپنے مخصوص ترنم سے غزل ارشاد فرمائی۔ ہر ہر شعر منطقی موشگافیوں، فنکارانہ مہارت اور استادانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار تھا۔ اہلِ محفل خصوصاً

صاحبان فن ہر ہر مصرعہ پر داد و تحسین کے خزانے لٹا رہے ہیں اور میں محویت کے عالم میں یہ بھول گئی کہ مجھے اس غزل سے صفحہ قرطاس کو سجانا ہے۔ غزل ختم ہوئی تو پھر فرمائش ہوئی مگر محترمہ نے معذرت کر لی۔

''اب میں ایک ایسے شاعر سے درخواست کروں گا جو مراد آباد کے ادبی وسماجی حلقوں میں بہت اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہماری درخواست پر ''شامِ خیال'' میں تشریف لائے۔ میرا اشارہ رئیس شہر جناب حاجی شمشاد صاحب شمشاد مراد آبادی صدر جگر میموریل سوسائیٹی مراد آباد کی طرف ہے۔ تشریف لا کر اپنے کلام بلاغت نظام سے مستفید فرمائیں''۔

شمشاد صاحب مراد آباد کے لیے محتاج تعارف نہیں لیکن بحیثیتِ شاعر پہلی باران کا کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ آپ کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا:

نگاہیں منتظر، بے چین دل، لب بند، سرد آہیں
ہماری ابتداء کی انتہا کیا ہو خدا جانے

کلاک نے چار بجنے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی حاضرین زبردست خواہش پر اب ناظم مشاعرہ جناب دلکش صاحب مزاحیہ کلام سے محظوظ فرمانے مائک پر تشریف لائے۔ چار مزاحیہ قطعات پیش کیے۔ آپ کے اس قطعے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے:

شاہ جہاں جو تاج محل دیکھنے گئے
پوچھا کوئی کمی تو نہیں رنگ و نور کی
گھبرا کے رعبِ شاہ سے معمار نے کہا
اس مقبرے میں صرف کمی ہے حضور کی

خاطر خواہ داد وصول کرنے کے بعد پھر ناظم مشاعرہ کی آواز گونجی۔

''حاضرین میرے پاس فرمائشی پرچوں کا ایک ڈھیر اکٹھا ہو گیا ہے کہ میں نشی سکسینہ، مینا ناز مینا، غزالہ صبا قمر قدیرارم، شکیلہ اکبر ناز، شگفتہ سمن اور محترمہ رئیس جہاں روشن کو دوبارہ زحمتِ کلام دوں۔ میری بھی تمنا ہے کہ پھر ان کے کلام سے فیض یاب ہوں۔ مگر وقت بہت ہو چکا۔ ابھی پہلے دور میں ہی بہت سے شعراء باقی ہیں اس لئے میں مراد آباد کے بزرگ شاعر جناب ثمر مراد آبادی کو دعوت دیتا ہوں''

حضرت ثمر مراد آبادی سرتا بقدر روایاتی شاعر ہیں۔ ان کے ہر انداز سے شاعرانہ وقار مترشح ہے۔ ان کے کلام میں جگریت و قمریت دونوں کا بہترین امتزاج ہے۔ بہترین شاعرانہ ترنم میں غزل شروع کی اور مشاعرہ لوٹ لیا:

ہم ہیں طالب تم مطلوب
ہم بھی خوب اور تم بھی خوب

دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

پھیلی یہ بات چاروں طرف آگ کی طرح
میں نے تمھارا نام لیا جب کسی طرح
اس احتیاطِ ترکِ تعلق کے باجود
اکثر وہ یاد آتے ہیں مجھ کو بری طرح
رکھی ہے ہم نے یوں بھی ترے ہر ستم کی لاج
پہروں خموش بیٹھے رہے ہیں اسی طرح

حضرت ثمر مشاعرہ کو حیاتِ نو عطا کر کے تشریف لے گئے۔ تو فخر سخن حضرت سحر انصاری مراد آبادی کو دعوتِ کلام دی گئی۔ حضرت سحر انصاری کے تلامذہ کی کافی تعداد ہے۔ تقریباً نصف صدی سے لیلائے غزل کی زلفوں کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرمایا:

کیا ہے مآل دیدہ تر ہم سے پوچھئے
کیا کہہ گئی کسی کی نظر ہم سے پوچھئے
پھونکا ہے آشیاں کو بڑی احتیاط سے
شائستگی برق و شرر ہم سے پوچھئے
ساحل پہ آکے ڈب گئے نامراد عشق
طوفان اشک دیدہ تر ہم سے پوچھئے

لیجئے حاضرین انتظار کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اب میں ایک ایسے ہمہ رنگ وہمہ صفت شاعر کو دعوتِ کلام دے رہا ہوں جس کا نام ادبی۔ سماجی اور سیاسی حلقوں میں نہایت ادب واحترام سے لیا جاتا ہے:

تغزل کے ہمہ اسرار در آغوش اے دلکش
ترنم کے امیر انجمن تشریف لاتے ہیں

اس شعر کے بعد جناب حاجی عبدالقدیر صاحب مراد آبادی سابق چیئر مین میونسپل بورڈ مراد آباد سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے اس محفل نور شامِ خیالؔ کو زندہ وجاوید بنادیں''

حضرت قدیر صاحب انکار ومعذرت کرتے رہے مگر سامعین نے شور کا ایک طوفان برپا کردیا۔ آخر جناب خیالؔ صاحب کے حکم پر مائک پر تشریف لائے اور فرمایا۔ دراصل بات یہ ہے کہ حضرت جگر مراد آبادی اور کیف مراد آبادی کی وفات کے بعد اب غزل پڑھنے میں لطف نہیں رہا۔ پھر بھی ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ خیالؔ صاحب سے خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ اور پھر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر سامع پتھر کے بت کی طرح ساکت وہ جامد ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی جادوگر نے تمام محفل کو اپنی میجک پاور سے پتھر میں تبدیل کردیا ہو۔ ہر شخص اس طرح سکتہ میں آگیا کہ داد دینے کا بھی ہوش نہ

رہا۔ محسوس ہوتا تھا کہ حضرت جگر مرادآبادی غزل سرا ہیں۔ آخر غزل ختم ہوئی اور فضاؤں کے نقرئی ساز سو گئے۔ اہل محفل کو ہوش آیا اور داد و تحسین کے طوفان میں دوسری غزل کی فرمائش ہوئی مگر حضرت قدیرؔ نے معذرت کر لی۔

غزل کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ کاش میں ان کے ترنم کو بھی الفاظ میں ڈھالنے کی قدرت رکھتی مگر یہ ناممکن ہے۔ قدیرؔ صاحب کے چند اشعار میں نے پتہ نہیں کس طرح وجدانی کیفیتوں میں ڈوبتے ابھرتے نوٹ کیے جو انھوں نے جناب خیالؔ کی نذر کیے ہیں:

یہ آج کون یہاں بے نقاب آیا ہے
روش روش پہ چمن کا شباب آیا ہے
یہ کس نے عارضِ پر نور سے نقاب الٹا
کلی کلی کو چمن میں حجاب آیا ہے
گئے تھے یوں تو قدیرؔ ان کی بزم میں لیکن
وہ خوش نصیب ہے جو کامیاب آیا ہے

''اب میں بے پناہ عقیدتوں کے ساتھ میر محفل۔ میر انجمن۔ میر مشاعرہ۔ میر کاروانِ ادب۔ کشمیر کے عظیم المرتبت شاعر و صحافی ''گاشری منار'' کے خالق جناب غلام نبی خیالؔ صاحب سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنے افکاراتِ عالیہ سے مستفید فرمائیں۔ دلکش آفریدی صاحب ابھی خاموش نہیں ہوئے تھے کہ تالیوں کی پر جوش گڑگڑاہٹ سے شان بھون کا گوشہ گوشہ جھوم اٹھا۔ وجیہ پیکر حضرت خیال اپنے شفق گوں دلفریب چہرے پر علم و ادب کا نور لیے دل نشین مسکراہٹ کے ساتھ مائک پر تشریف لائے۔

جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں جناب غلام نبی خیال محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ بقول آنجناب کے ''میں اگرچہ کشمیری میں لکھتا ہوں

تاہم اردو صحافت کے لئے میری زندگی وقف ہے'' سہ روزہ اقبال سری نگر کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جس میں ہند کے نمائندہ فنکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں اور اس کو ادبی حلقوں میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ برِ صغیر ہند و پاک کے کسی اخبار کو حاصل نہیں۔ مراد آباد میں قارئین ''اقبال'' کی کافی بڑی تعداد ہے مگر خیالؔ صاحب کو اہلِ مراد آباد پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے نہایت باوقار انداز میں انوکھے طرز سے جو چند خوبصورت جملے اپنی خوابیدہ سی آواز میں ادا کیئے وہ اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:

''جنابِ صدر صاحب۔ مکرم خواتین اور معزز حضرات۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے اُس کرم فرمائی اور قدر دانی کے لئے آپ سب کا ممنون ہوں جس کے تئیں آپ نے مجھے یہاں آنے کا حکم دیا اور میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگر محبت، اخوت، خلوص اور تشکر کی کوئی ٹھوس شکل ہوتی تو میں یہ سبھی چیزیں ایک سوغات کی صورت میں لا کے آپ کے قدموں پر نچھاور کر دیتا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں ایک وادی گل بداماں سے آیا ہوں لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ میں وہاں سے چند پھول بھی اپنے ساتھ تحفتاً نہیں لا سکا ہوں کیونکہ آج کل کشمیر میں زمستان کا موسم ہے اور ظاہر ہے کہ یخ بستہ برف کے آپ متحمل نہیں ہو سکتے۔

''میرے خیال میں ادب اور شاعری کے رشتے علاقوں اور سرحدوں کی حد بندی کے کبھی محتاج نہیں رہے ہیں بلکہ یہ بندھن علاقائی حدود اور سرحدی دیواروں کو پھاندتا ہوا ذہنوں کے راستے براہِ راست دلوں میں اتر جاتا ہے اور وہیں پر اپنی دائمی جگہ بنا لیتا ہے۔ میں اگرچہ کشمیری میں لکھتا ہوں لیکن اردو کے ساتھ میرا یہ گہرا تعلق ضرور قائم ہے کہ میں نے اپنی زندگی کشمیری ادب کے ساتھ ساتھ اردو صحافت کی خدمت کے لیے بھی وقف کی ہے۔ اس شہر کے ساتھ

اس سے بڑا رشتہ اور لگاؤ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہیں سے ہماری شاعری کے مطلع کا آفتاب حضرت جگر مرادآبادی کی ذات میں طلوع ہوا ہے"

ان عنبریں کلمات نے فضا کو مسحور ومخمور کر دیا۔ سامعین کے ذہن وادی گلبدامان میں گم ہو گئے اور اس سے پہلے کہ یہ وادی تخیل میں برف پوش پہاڑوں، گنگناتے ہوئے جھرنوں اور سیب واخروٹ کے باغات اور زعفران کے کھیتوں کے سحر انگیز نظاروں میں بے خود کرتی خیال صاحب نے جگر مراد آبادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"قبلہ حضرت جگر کئی بار کشمیر تشریف لائے اور مجھے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے یہ فرمائش بھی کی کہ میں انہیں کشمیری زبان کے عوامی شاعر مہجور کی کسی نظم کا اردو ترجمہ سنادوں۔ اس طرح سے حضرت جگر ایک ایسے شاعر کے کلام کو سن کر اس کی داد دینے میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے جو ان کی زبان میں شاعری نہیں کرتا تھا۔ میں ایک بار پھر اس عزت افزائی کے لیے آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے ایک ذرے کو آفتاب بنا دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں یہاں سے اپنی زندگی کی نہایت ہی شگفتہ اور برجستہ یادیں اور لطیف وحسین تاثرات لیکر واپس گھر لوٹوں گا"۔

جناب خیاؔل کے بعد تقریباً پونے پانچ بجے صبح مشاعرہ کا پہلا دور بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا اور اب اس سے پہلے کہ مشاعرے کا فرمائشی دور شروع ہوتا سامنے کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اللہ اکبر کی پرعظمت آواز گونجی اور لوگ حسبِ ذیل شعر پڑھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے:

موذن مرحبا بروقت بولا
تیری آواز مکے اور مدینے

20 فروری کو تقریباً آٹھ بجے صبح جناب خیاؔل بیدار ہوئے۔ صرف دو

گھنٹوں کی نیند کے باعث آنکھوں میں سرخی جھلک رہی ہے۔نو بجے کے لگ بھگ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر سے آئے ہوئے مہمان شعراء سے ملاقات کرنے کے بعد خیال صاحب نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے راستہ دکھایا اور اپنی ٹھوس تجاویز پیش کیں۔اسی گفت وشنید میں دو پہر کا ڈیڑھ بج گیا اور آپ بمعہ مہمان شعراء دلکش آفریدی صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے جہاں انہیں لنچ لینا تھا۔

دلکش آفریدی صاحب کے والد محترم نے خیال صاحب اور دیگر مہمانوں کا استقبال ان الفاظ سے کیا ''گاشری منار'' کے خالق کے استقبال کے لئے اپنے دلی جذبات کی وضاحت اس شعر سے کرتا ہوں:

مسکرانے لگی کائناتِ جہاں
میرے گھر میں جو اُن کے قدم آگئے

اس کے بعد یہ قافلہ اسحاق نرسری سکول پہنچا جہاں جناب خیالؔ کو سکول کا معائنہ کرنا تھا۔سکول کے معائنے کے بعد سکول کی نگران مینا ناز صدیقی نے پر تکلف عصرانہ دیا۔ مینا صاحبہ بذاتِ خود ایک انجمن ہیں۔وہ دنیا کی سبھی راحتیں اور مسرتیں بھلا کر یہ اسکول چلا رہی ہیں۔خیال صاحب کے ورود سے مراد آباد میں خواتین ادبی سوسائیٹی کا بھی عملی آغاز ہوا جس کے زیر اہتمام یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔اس سوسائیٹی کے اراکین کے ارادے بہت بلند ہیں اور اس کے کام میں خواتین کی فلاح و بہبود، تعلیم و ترقی، ان کے حقوق کی حفاظت، ان پڑھ خواتین کے لیے دستکاری اسکول اور ننھے منھے بچوں کے لیے نرسری ادارے قائم کرنا اور غریب خواتین کو دستکاری سکھانا اوران کے لیے ایک مفید عام کتب خانہ قائم کرنا شامل ہے۔خدا ہم سب بہنوں کو اس نیک کام میں دل و جان سے حصہ لینے کی استقامت بخشے۔

ساڑھے چھ بجے جناب خیالؔ کی شان بھون میں واپسی ہوئی۔ دم ہنوز نہ لیا تھا کہ ٹیلی فون پر جناب حاجی شمشاد نے فرمایا کہ یہاں خیالؔ صاحب کو حسبِ پروگرام شام سات بجے پہنچنا ہے۔ شہر کے تمام ادبا وشعراء اور دیگر معززین جناب خیال کے منتظر ہیں۔ سات بجے خیال صاحب مع احباب شان بھون سے حاجی شمشاد صاحب کی حویلی پہنچ گئے۔ پر تکلف ڈنر کے بعد تقریباً ساڑھے بارہ بجے شب جناب خیال اپنی قیام گاہ واپس آئے اور پھر 21 فروری کو بذریعہ ٹیکسی دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ ہم نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے مہمان کو خدا حافظ کہا اور خیال صاحب اپنی لازوال یادیں چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ خیال صاحب کے اس الوداعی جملے کی بازگشت ہمیشہ لازوال بنی رہے گی:

''میں آپ کے شہر سے بہت حسین یادیں لے کر جا رہا ہوں'' اور اس کے ساتھ ہی وہ عالم، وہ مفکر، وہ کشمیر کی وادی گل پوش کا حسین شہزادہ ٹیکسی کے پہیوں کی گرد کو پیچھے چھوڑتا ہوا کہیں دُور جا رہا تھا''



کشمیریات کا مجسم فکری زعفران زار

غلام نبی خیالؔ

از: فاروق ارگلی

سرزمینِ کشمیر نے اردو زبان وادب کو لافانی چمک دمک رکھنے والے گہرہائے گرانمایہ سے نوازا ہے۔ رتن ناتھ سرشار، برج نارائن چکبست، برج موہن دتاتریہ کیفی، سرتیج بہادر سپرو اور علامہ اقبال سے لے کر سعادت حسن منٹو، آغا حشر کاشمیری، عبدالاحد آزاد، پریم ناتھ پردیسی، غلام حسین تنہا، اکبر جے پوری، اکبر حیدری، غلام رسول نازکی، رحمٰن راہی، مرغوب بانہالی، نشاط انصاری، قاضی غلام محمد، نور شاہ، پریم ناتھ در، تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، موہن یاور تک اردو دانشوروں، نقادوں، محققوں، کہانی کاروں، شاعروں اور صحافیوں کی ایک لامحدود کہکشاں ہے جن کی ضیاباریوں نے اردو کے عالمی ادبی افق کو منور کیا ہے۔

موجودہ عہد میں اردوادب کے آسمان پر بزرگوں کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے بے شمار قلم کاروں اور تخلیق کاروں کا کارواں تیزی کے ساتھ منزلِ عروج کی جانب رواں دواں ہے، جن میں صرف مرد ہی نہیں خواتین کی بھی متعدد بہ تعداد شامل ہے۔

ریاست کے عوام کی اصل زبان کشمیری ہے، لیکن ثانوی حیثیت سے اردو کشمیری تہذیب اور زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ یہ ریاست کی سرکاری زبان بھی ہے۔ کشمیری ادباء و شعراء میں زیادہ تر کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک مشترکہ لسانی دھارا دونوں زبانوں کے ادبی، تخلیقی اور تہذیبی ارتقاء کے وسیع میدانوں کو سیراب کر رہی ہے۔

آج کے عہد میں اردو زبان کی تاریخ ساز علمی، فکری اور تخلیقی خدمت کرنے والی مقتدر شخصیتوں میں ایک نہایت نمایاں اور ہمہ جہت شخصیت جناب غلام نبی خیالؔ کی ہے۔ ادیب، شاعر، ناقد اور صحافی غلام نبی خیال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہیں کسی ایک زمرے میں محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ کشمیری ادب، تاریخ اور ثقافت کے نامور محقق ہیں۔ اس میدان میں ان کی حیثیت واہمیت یہ ہے کہ ''کشمیریات'' کے موضوع پر لکھنے والوں میں منفرد اور ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے کشمیری تہذیب اور خاص طور پر کشمیری اساطیری ادب پر تاریخ ساز تحقیقی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان کا شمار کشمیر کی معتدل مزاج اور امن پسند سماجی شخصیات میں کیا جاتا ہے۔ کشمیری ادب و ثقافت پر خیالؔ صاحب کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعے ''گاشری منار'' (روشنی کے مینار) کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس شاہکار کتاب پر انہیں ساہتیہ اکادمی کے گرانقدر انعام سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔

خیال صاحب کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مقبول شاعر ہیں۔

وہ کشمیری زبان کے قادرالکلام شاعر ہیں۔ اردو میں ان کی شعری تخلیقات ہندو پاک کے رسائل وجرائد میں سالہا سال سے مسلسل شائع ہوتی آرہی ہیں۔ ملک و بیرون ملک منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی ان کی

فکر انگیز غزلیں اور نظمیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ غلام نبی خیالؔ اس لحاظ سے پہلے کشمیری دانشور ہیں جنہیں بیک وقت کشمیری، اردو، فارسی اور انگریزی میں مادری زبان کی طرح دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے ''خیابانِ کشمیر'' کے عنوان سے کشمیری شعراء کی اہم تخلیقات کے منظوم تراجم کا گرانقدر مجموعہ پیش کیا ہے۔ یہ ان کی لسانی اور شعری مہارت اور فکری بصیرت کا ناقابل فراموش نمونہ ہے۔ انہوں نے ''رباعیاتِ عمر خیام'' اور ارسطو کی ''بوطیقا'' کو کشمیری زبان میں پیش کر کے کشمیری ادب کی تاریخ میں ایک نیا باب مرتب کیا۔ اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کی نہایت اہم نگارشات ''اقبال اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر'' ''فغانِ کشمیر'' اور ''پاکستان میں چند روز'' اپنے موضوعات پر نہایت اہم ہیں۔ لیکن اردو زبان میں مشہور عالم تصنیف ''کاروانِ خیال'' غلام نبی خیالؔ کو اس عہد کا نابغہ قرار دیتی ہے۔ یہ کتاب ان کے مختلف النوع تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، ادبی اور ثقافتی مقالات پر مشتمل ہے جس میں کشمیری زبان و ادب اور صحافت کے حوالے سے ایسے متعدد مضامین شامل ہیں جن میں ہر ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں ''کاروانِ خیال'' میں عالمی ادبیات پر تجزیاتی مباحث کے علاوہ قدیم کشمیر کے فارسی شعراء صرفی اور غنی کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے جو اس سے قبل اس اہتمام سے پیش نہیں کیا گیا۔ اس عجیب و غریب کتاب میں چودھویں صدی کی عظیم کشمیری شاعرہ لل عارفہ، شیخ نورالدین نورانی حبہ خاتون، محمود گامی کی شاعری، ان کے ادوار کا تاریخی اور تہذیبی جائزہ، کشمیر کی لوک کہانیوں اور لوک گیتوں پر بھرپور معلوماتی مواد موجود ہے۔ کشمیریات کے مطالعے کے لئے ''کاروانِ خیال'' کو ایک کتاب سے زیادہ ''آئینۂ جہاں نما'' کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح ان کی ایک اور کتاب ''فکرِ خیال'' بھی ایسے مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جسے اردو کے تحقیقی اور

تنقیدی ادب میں نہایت وقیع اور سنجیدہ کوشش قرار دیا گیا ہے۔ غلام نبی خیالؔ عالمی ذرائع ابلاغ کے سرکردہ اداروں اور مختلف اخبارات وجرائد جیسے ''انڈیا ٹوڈے''، ''السٹریٹیڈ ویکلی''، ''وویس آف امریکہ''، ''جرمن ریڈیو'' ''اسکائی نیوز ٹیلی ویژن''، ''گارڈین لندن''، ''واشنگٹن پوسٹ''، ''سنڈے میل'' اور سٹیٹس مین'' دہلی کے خصوصی نمائندے بھی رہ چکے ہیں۔ فی الوقت بھی وہ پاکستان کے مشہور روزنامے ''نوائے وقت''، ''نیشن'' (انگریزی) اور ''پاکستان ٹیلی ویژن'' کے خصوصی نمائندے اور پاکستان کے قومی ڈائجسٹ'' (لاہور) کے مستقل کالم نویس ہیں۔ ساتھ ہی وہ کشمیر کے سرکردہ انگریزی اخبار وویس آف کشمیر کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔

موجودہ عہد کی غیر معمولی علمی شخصیت جناب غلام نبی خیالؔ کی ولادت 4مارچ 1939 کو سرینگر میں ہوئی۔ان کے والد میر جلال الدین مشہور نقاش تھے اور قالینوں کے بہترین ڈیزائنز کے طور پر پورے کشمیر میں جانے جاتے تھے۔خیال صاحب نے اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد امر سنگھ کالج سے بی اے کیا اور بعد میں جموں وکشمیر یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری پرائیویٹ امتحان دے کر حاصل کی۔

غلام نبی خیالؔ کی ادبی زندگی کا آغاز 1951ء میں اُس وقت ہوا جب وہ اسلامیہ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ان کے اختیاری مضامین میں عربی شامل تھی، جس کا درس انہیں کشمیر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا غلام نبی مبارکی سے حاصل ہوا۔ عربی زبان کی تعلیم میں ہی انہیں عروض اور شعری لوازمات سے دلچسپی ہوئی اور وہ اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ پہلی غزل جالندھر سے شائع ہونے والے رسالے ''راہی'' میں چھپی۔ اس زمانے میں دہلی سے شائع ہونے والا ایک فلمی ہفت روزہ 'چترا' نوجوانوں میں بہت مقبول تھا۔ یہ اخبار

لاہور سے ہندوستان آنے والے اخبارات ورسائل میں سے ایک تھا جسے دھرم ویر اور ایس ایس منور بھاگیرتھ پیلس سے شائع کرتے تھے۔ اس رسالے کا معیار صرف تفریحی اور عوامی تھا۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی خوب حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

غلام نبی خیاؔل کے گھر میں فلمی رسالوں وغیرہ پر پابندی تھی۔ وہ چھپ چھپ کر ''چترا'' پڑھتے تھے۔ انہوں نے کئی افسانے لکھے جو فرضی ناموں سے ''چترا'' ویکلی میں چھپے۔ بعد میں ان کی کہانیاں کشمیر کے رسالوں میں بھی چھپنے لگیں۔ شاعری ایک طرح سے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ انہوں نے اسلامیہ ہائی سکول کے ایک مشاعرے میں کشمیری زبان میں اپنی نظم سنائی جسے بہت پسند کیا گیا، خاص طور پر استاد شاعر مولانا مبارکی نے ان کی بہت ہمت افزائی کی۔ انہوں نے ہی خیاؔل کو اردو شاعری کی طرف راغب کیا اور کافی عرصہ تک ان کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے رہے۔ خیاؔل صاحب شاعری میں خود کو مولانا مبارکی کا شاگرد بتاتے ہیں۔

غلام نبی خیاؔل شروع سے ہی ذہین، شوخ طبع اور تیز طرار نوجوان صاف لہجے اور اچھے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ صحت زبان کا خیال ان مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ لہٰذا جب انہوں نے ریڈیو کشمیر سری نگر میں اناؤنسر کی جگہ کے لئے انٹرویو دیا تو ان کا آسانی سے تقرر ہو گیا۔ سرینگر ریڈیو سٹیشن میں سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، پران کشور اور علی محمد لون جیسے سرکردہ ادیبوں اور شاعروں سے قریبی رابطے ان کے شعری و ادبی ذوق کو نکھارنے میں بیحد مددگار ثابت ہوئے۔

نوجوان غلام نبی خیاؔل کا ذہن فطری طور پر انقلاب پسند تھا۔ کشمیر کلچرل کانفرنس (جو ترقی پسند مصنفین کی ایک شاخ تھی) کی علمی، ادبی سرگرمیوں سے

انہیں خاص دلچسپی تھی۔ جبکہ اس تنظیم سے وابستہ لوگوں پر کمیونسٹوں کا خاصا اثر تھا۔ کلچرل کانفرنس میں غلام محمد صادق، درگا پرشاد، سید سجاد ظہیر، شیلا بھاٹیہ، محمود احمد علی شاہ، رشی دیو، اور عبدالرحمٰن راحت جیسے معروف اصحاب شامل تھے۔ بخشی غلام جو وزیر اعظم کشمیر تھے۔ ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کو اپنے لئے خطرہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے کلچرل کانفرنس کے بہت سے ارکان کو گرفتار کر کے جیل خانہ بھیج دیا۔ گرفتار شدگان میں 19 سالہ غلام نبی خیال آ بھی تھے، جو پونے دو سال تک قید رہے۔ خوش نصیبی سے جیل میں انہیں مولانا سعید مسعودی جیسی عبقری شخصیت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ یہ ان کی ادبی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ مولانا مسعودی بھی قیدی تھے لیکن ان کے پاس عربی، انگریزی، اردو اور فارسی کی ڈھیروں کتابیں ہوتی تھیں جو انہیں مس مردولا سارا بھائی نئی دہلی سے بھیجا کرتی تھیں۔ ان کتابوں سے خیال آ کو بھی استفادے کا موقع ملنے لگا تو فارسی سیکھنے کا شوق ہوا۔ جیل میں فارسی کے استاد مولانا سعید مسعودی بھی تھے جو فارسی ادبیات کے ماہر تھے، انہوں نے ہی غلام نبی خیال آ کو عمر خیام کی رباعیات کا مجموعہ پڑھنے کو دیا۔ انہوں نے یہ رباعیات اتنے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ پڑھیں اور سمجھیں کہ ان کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کر ڈالا۔ غلام نبی خیال آ کو بغیر کسی قصور کے دو سال قید میں رکھا گیا تھا، لیکن وہ اس ظلم کو خود پر کشمیر سرکار کا احسان مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ان کی زندگی میں یہ حادثہ نہ ہوتا تو شاید وہ ادبی دنیا میں اس شہرت و کامیابی کی منزل پر نہ پہنچے ہوتے جہاں پر وہ آج متمکن ہیں۔

جیل سے رہائی کے بعد جب بخشی غلام محمد کو معلوم ہوا کہ خیال آ نے عمر خیام کی رباعیات کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہیں بلوا کر بے قصور جیل میں ان کو ڈالے جانے کے لئے معافی

طلب کی اور پانچ سو روپے رباعیات کو چھپوانے کے لیے دیئے کیونکہ وہ خود عمر خیام کے بڑے پرستار تھے۔

اس کے بعد 1964ء میں رائے شماری محاذ کا ترجمان اردو ہفت روزہ 'محاذ' جاری ہوا۔ انجمن کی مجلسِ مشاورت میں شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام رسول کوچک شامل تھے جنہوں نے خیال صاحب کو اس کا مدیر مقرر کیا۔ لیکن ایک سال بعد حکومت نے اس کی بھی اشاعت بند کرادی۔ صحافت اور سماجی خدمت کا جذبہ اب خیال صاحب کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھے اور نہ اپنی راہ تبدیل کی بلکہ 1965ء میں انہوں نے خود اپنا کشمیری زبان کا ہفت روزہ 'وطن' شروع کیا۔ یہ اخبار کشمیر کی صحافت میں خاص اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔ 'وطن' کا خصوصی شمارہ ''امن نمبر'' سو صفحات پر مشتمل تھا۔ جس میں ہندو پاک کے بڑے بڑے اہل قلم کی تحریریں شامل تھیں۔

غلام نبی خیالؔ نے اپنے نصف صدی کے ادبی اور صحافتی سفر میں کبھی ذاتی مصلحت کو مقدم نہیں رکھا نہ ہی اپنے اصولوں سے گر کر سمجھوتے کیے۔ انہوں نے وہی لکھا اور وہی کہا جو ان کے ذہن و ضمیر نے صحیح اور سچ سمجھا۔ انہوں نے ادبی حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو دنیا میں ماہرِ اقبالیات تسلیم کیے جانے والے آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' میں اقبال کے ''جاوید نامہ'' کی ایک نظم ''زیارت امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی و ملا طاہر غنی کشمیری'' کی شرح میں شیخ عبداللہ کی مدح شامل کر کے بغیر اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیے یونیورسٹی کی پروفیسری اور 50 ہزار روپے کی امداد اقبالیات پر تحقیقی کام کے نام پر حاصل کرنے کے لئے زبردست بددیانتی کا ارتکاب کیا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کو ان کی علمی کاوشوں کے لئے پوری اردو دنیا میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سہیل عظیم آبادی، مولانا امتیاز علی عرشی، برٹرینڈ رسل، شاذ تمکنت، رام لعل، شمس الرحمن فاروقی، علی جواد زیدی، آل احمد سرور، فکر تونسوی، ڈاکٹر بشیر بدر، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، رضوان احمد، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور احمد ندیم قاسمی جیسی بہت سی نامور شخصیات نے خیال صاحب کے نام اپنے خطوط میں ان کی نگارشات کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کے فن و شخصیت پر متعدد مضامین و مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

شخصی طور پر وہ ایک انتہائی حلیم، خوش مزاج، دوست نواز اور ملنسار انسان ہیں۔ کسی کی بے جا تعریف یا برائی کرنا ان کی سرشت میں شامل نہیں ہے لیکن سچ بات کہنے سے وہ کبھی گریز نہیں کرتے خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں۔

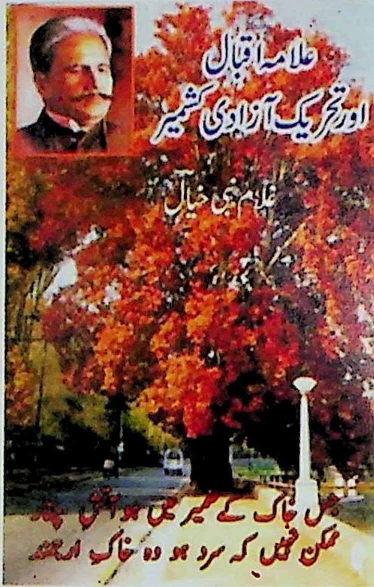
فخرِ کشمیر، فخرِ ہند، فخرِ ادب اور فخرِ صحافت جناب غلام نبی خیالؔ کی 70 ویں سالگرہ پر سہارا انڈیا پریوار کی جانب سے پر خلوص مبارکباد۔



(فاروق ارگلی صاحب کا یہ مضمون ہندوستان کے دس شہروں سے شایع ہونے والے مشہور اردو روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے 4 مارچ 2010 کے شمارے میں شایع ہوا ہے)



اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر

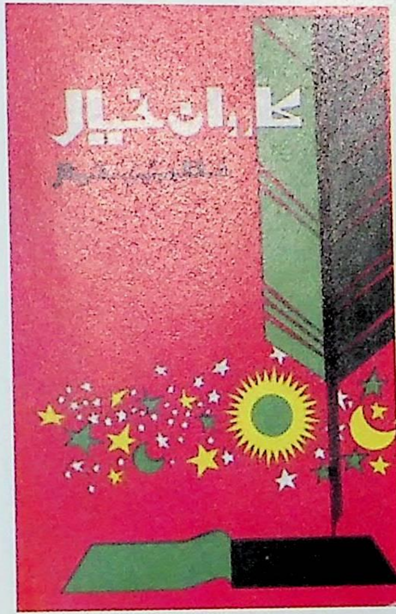


اس اہم اور تاریخ ساز کتاب کے بارے میں جناب میر غلام رسول نازکی نے کہا ہے کہ ''یہ تصنیف پڑھ کر قاری اردو زبان اور یہ فن سیکھ سکتا ہے کہ ایک بہترین کتاب کیسے لکھی جاسکتی ہے''۔

اس کتاب میں مصنف نے کئی ایسے مفروضات کو تاریخی شواہد کی روشنی میں رد کیا ہے جن سے علامہ اقبال کی شخصیت پر قسم قسم کی چہ میگوییاں کی جاسکتی تھیں۔

قیمت: ڈھائی سو روپے، اس کتاب کے تین ایڈیشن بالترتیب 1997، 1999ء اور 2011ء میں پہلے ہی شایع ہو چکے ہیں۔

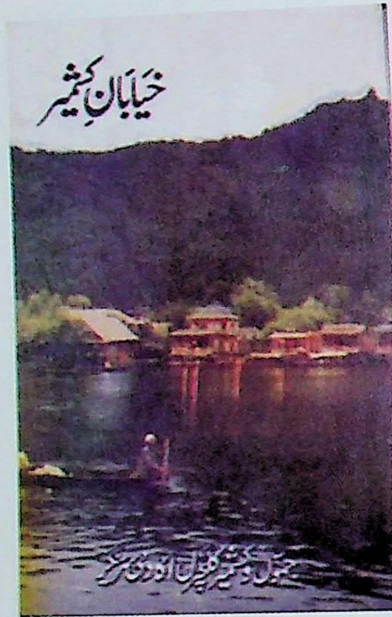
کاروان خیال



اردو زبان میں تحریر کردہ اس ضخیم تصنیف میں کشمیری زبان، ادب، ثقافت اور دیگر علمی اور ادبی موضوعات پر غلام نبی خیال صاحب کے وہ تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں جو انہوں نے بیس پچیس سال کے دوران تحریر کیے اور جو ہندوپاک کے سرکردہ رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے آخری حصے میں خیال صاحب کے نام دنیا کی برگزیدہ شخصیات کے خطوط کا ایک دلچسپ انتخاب بھی شامل ہے۔ کتاب میں 35 تصاویر شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے اور سرورق پاکستان کے مشہور مصور اسلم کمال نے بنایا ہے۔

1998 قیمت: تین سو روپے، (کتاب نایاب ہے)۔

خیابان کشمیر

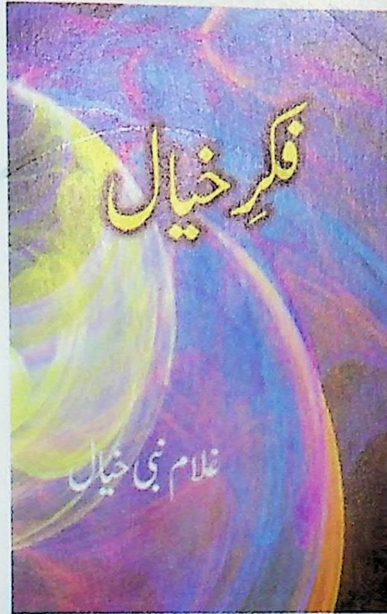


کشمیری زبان کی چھ سو سالہ شاعری کے انتخاب کے منظوم اردو تراجم جو خیال صاحب کے علاوہ کئی ادیبوں نے کیے ہیں۔

40 کشمیری شعراء کے مترجمین میں کیفی اعظمی، کمال احمد صدیقی، نند لال طالب، تابش صدیقی، پریم دھون، خاور لدھیانوی، مقبول احمد سید، غلام نبی خیال، رسا جاودانی، قیصر قلندر، حکیم منظور، عبدالعزیز فطرت اور فاروق نازکی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ کتاب ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے شایع کی ہے اور اسی کے کتاب گھر، لال چوک سری نگر سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

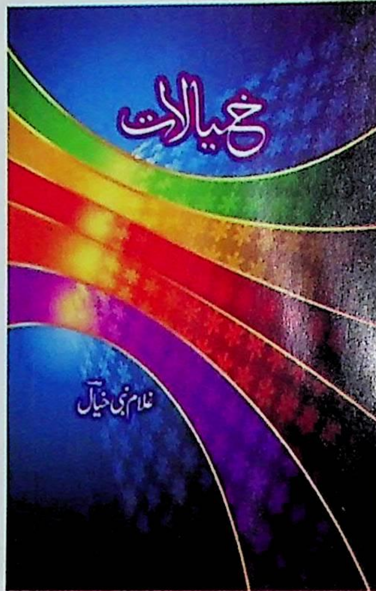
فکرِ خیال



اس تحقیقی کتاب میں کشمیری شاعری، کشمیری صحافت، کشمیری سفرنامے، حضرت امیر خسرو، لالہ رخ، قدیم کشمیری شاعری، بابا فرید، کشمیری شاعری پر ہندو دیومالا کے اثرات، اردو ادب میں کشمیر کی غلط تصویر کشی، رابرٹ تھورپ کشمیر کا جاں نثار ہمدرد، حاتم کی کشمیری کہانیاں، کشمیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک وغیرہ جیسے موضوعات پر 16 تحقیقی مقالات درج ہیں۔

2007 قیمت: دوسو روپے

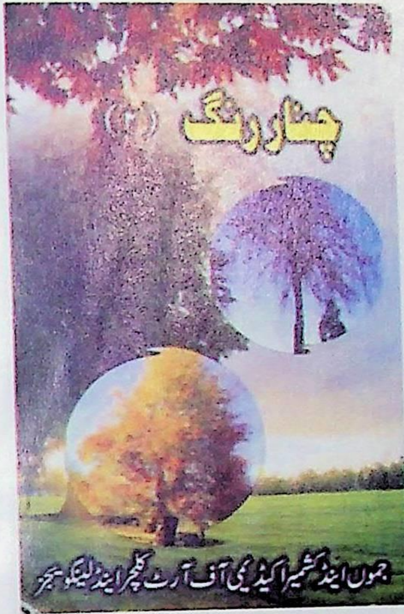
خیالات



یہ کتاب بھی خیال صاحب کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے مندرجات میں راج ترنگنی، کتھا سرت ساگر، موسیٰ اور عیسیٰ کی کہانی، قدیم یونان کا ڈرامہ، ذکر رومی، جوش ملیح آبادی اور کشمیر، اردو تنقید اور توضیح، جموں کشمیر میں اردو کا مستقبل، جنگ آزادی ہند اور کشمیری ادب کے رجحانات، احمد ندیم قاسمی، کشمیری ادب پر روسی ادب کے اثرات، علامہ اقبال اور کشمیریات جیسے مضامین شامل ہیں۔

2009ء قیمت: تین سو روپے

چنار رنگ



وادیٔ کشمیر پر دنیا بھر کے شاعروں نے اپنی منظومات کے ذریعے اس جنت بے نظیر کو اپنے گل ہائے عقیدت سے بار بار معطر کیا ہے۔

اس منفرد مجموعہ میں کشمیر کے حسن اور فطری مناظر پر اردو اور فارسی میں لکھی ہوئی چیدہ چیدہ نظمیں پہلی بار یک جا کی گئی ہیں۔

2010ء قیمت: ایک سو پچاس روپے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکیڈمی، سری نگر نے شایع کی ہے۔



غلام نبی خیال

ریاست جموں و کشمیر کے ایک ممتاز شاعر، محقق، ادیب، ترجمہ کار اور صحافی ہیں۔

وہ بیک وقت تین زبانوں اُردو، انگریزی اور کشمیری میں لکھتے ہیں۔ اب تک ان کی 28 کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے ان کی ایک کشمیری تصنیف کو ریاستی اکادمی کا اعزاز (1974)، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1975) اور ایک انگریزی کتاب کو ریاستی حکومت کی طرف سے بہترین کتاب کا سالانہ اعزاز (2010) بھی دیا گیا ہے۔

گزشتہ زاید از نصف صدی کے دوران ادبی اور صحافتی خدمات کے عوض خیال صاحب کو پندرہ بین الاقوامی، قومی اور ریاستی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

''خیال قلم'' اُردو میں مصنف کی آٹھویں کتاب ہے اور ان کی مزید چھ مطبوعات اس وقت زیر تکمیل ہیں۔

خیال صاحب قومی کونسل برائے اُردو زبان نئی دہلی کی مجلس عامہ اور ریاستی سرکاری لائبریریز کی مشاورتی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔